انگریز نوازی کی حقیقت

یٰس اختر مصباحی

دار القلم ذاکر نگر نئی دہلی

انگریز نوازی

کی

مؤلف

یٰسٓ اختر مصباحی

بانی وصدر دارالقلم، ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵

بانی رکن المجمع الاسلامی، مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ، یوپی

طابع و ناشر

دارالقلم-92/66 قادری مسجد روڈ، ذاکر نگر (جوگابائی ایکسٹینشن)

اوکھلا، نئی دہلی-110025 (انڈیا)

فون:011-26986872 فیکس نمبر:011-26987184

سلسلۂ مطبوعات(۱۴)

نام کتاب .... انگریز نوازی کی حقیقت

مؤلف .... یٰسٓ اختر مصباحی

زیر اہتمام .... دار القلم، ذاکر نگر، نئی دہلی

طبع اوّل ۱۴۲۸ھ/ ۲۰۰۷ء

صفحات .... دوسو آٹھ (208)

کمپوزنگ (۲۰۰۷ء) .... محمد توفیق مصباحی

قیمت .... ساٹھ روپے (-/60)

رابطہ کا پتہ

دار القلم-66/92 قادری مسجد روڈ، ذاکر نگر (جوگابائی ایکسٹینشن)

اوکھلا، نئی دہلی-110025 (انڈیا)

فون: 011-26986872

فیکس نمبر: 011-26987184

تہدیہ بخدمت

مشاہیر علما و مشائخِ اہل سنت

(۱) حضرت مولانا عبد العلی فرنگی محلی لکھنوی	وصال	۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء
(۲) حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی	//	۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء
(۳) حضرت شاہ غلام علی نقش بندی دہلوی	//	۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء
(۴) حضرت مولانا منور الدین دہلوی	//	۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء
(۵) حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی	//	۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء
(۶) حضرت مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی	//	۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء
(۷) حضرت مولانا فضل رسول بدایونی	//	۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء
(۸) حضرت سید شاہ آل رسول احمدی مارہروی	//	۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء
(۹) حضرت مولانا احمد علی محدث سہارن پوری	//	۱۲۹۷ھ/۱۸۷۹ء
(۱۰) حضرت مولانا نقی علی قادری برکاتی بریلوی	//	۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء
(۱۱) حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی	//	۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء
(۱۲) حضرت مفتی ارشاد حسین مجددی رام پوری	//	۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء
(۱۳) حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی	//	۱۳۱۳ھ/۱۸۹۵ء
(۱۴) حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی	//	۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء
(۱۵) حضرت مولانا عبد القادر برکاتی بدایونی	//	۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء
(۱۶) حضرت مولانا احمد حسن کان پوری	//	۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء
(۱۷) حضرت خواجہ عبد الصمد مودود چشتی سہسوانی	//	۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء
(۱۸) حضرت مولانا سید شاہ ابو الحسین احمد نوری مارہروی	//	۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء
(۱۹) حضرت مولانا ھدایت اللہ جون پوری	//	۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء
(۲۰) حضرت مولانا غلام قادر بھیروی لاہوری	//	۱۳۲۶ھ/۱۹۰۹ء
(۲۱) حضرت مولانا انوار اللہ حیدر آبادی	//	۱۳۳۶ھ/۱۹۱۸ء
(۲۲) حضرت مولانا الشاہ احمد رضا بریلوی	//	۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء
(۲۳) حضرت سید شاہ علی حسین اشرفی کچھوچھوی	//	۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء
(۲۴) حضرت سید مہر علی شاہ چشتی گولڑوی	//	۱۳۵۶ھ/۱۹۳۷ء
(۲۵) حضرت سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری	//	۱۳۷۰ھ/۱۹۵۱ء

رحمۃ اللّٰہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

فہرستِ کتاب

☆☆☆☆☆☆
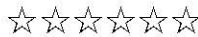
آغاز و انجامِ پرواز

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

جس آدمی کو تیرنا نہ آئے اس کے باوجود وہ گہرے پانی میں چھلانگ لگا کر ڈوبنے لگے تو غلطی کسی اور کی نہیں بلکہ خود اس کی ہے کہ وہ اپنی ناسمجھی و ناتجربہ کاری سے موت کو گلے لگا رہا ہے اور خودکشی کی راہ ہموار کر رہا ہے۔ یہی حال اس شخص کا ہوتا ہے جو اس چیز کے پیچھے پڑے جس کا اسے کوئی علم اور کوئی مطالعہ نہیں۔ نتیجۃً وہ ایسی گہرائی میں اتر جاتا ہے اور ایسے بھنور میں پھنس جاتا ہے جس سے اس کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے اور اسے کوئی راہِ نجات نظر نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم ایسے لوگوں کو ہدایت دیتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے۔

ولاتقف مالیس لك به علم۔ ان السمع و البصر و الفؤاد کل اولٓئك کان عنه مسئولًا۔ (سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت:۳۶)
اور اس بات کے پیچھے نہ پڑو جس کا تمہیں علم نہیں۔ بے شک کان اور آنکھ اور دل ان سب سے سوال ہونا ہے۔

ہمارے معاشرے میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو ہر سنی سنائی بات یہاں وہاں نقل کرتے پھرتے ہیں اور افواہ پھیلا کر طرح طرح کے فتنے کھڑے کرنے کا سبب بنتے رہتے ہیں۔ وہ اس بات کی تحقیق و تفتیش سے بے نیاز ہو کر ایسے سنگین جرم کا ارتکاب اس طرح کرتے ہیں کہ کسی مؤاخذہ کا کوئی خوف ان کے دل میں نہیں ہوتا اور انھیں اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ وہ اپنی بے بنیاد بات پھیلا کر خود اپنے کردار و اخلاق کو کس بری طرح پامال اور داغ دار کر رہے ہیں۔ حالاں کہ قرآن حکیم ارشاد فرماتا ہے:

یٓایها الذین اٰمنوا ان جآء کم فاسق بنباء فتبینوا ان

تصیبوا قوما بجھالۃٍ فتصبحوا علی ما فعلتم ندمین۔
(سورۂ حجرات۔ آیت:٦)

اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق کرلو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اَن جانے میں کسی قوم کو نقصان پہنچادو۔ پھر اپنے کیے پر پچھتاتے رہ جاؤ۔

اسی طرح کا ایک تازہ واقعہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی ہند کے ترجمان سہ روزہ دعوت نئی دہلی (شمارہ ۷/ستمبر ۲۰۰۶ء) میں ڈاکٹر مغل فاروق پرواز (علی گڑھ) کا ایک مضمون چھپا جس کے بعض حصے سخت قابلِ گرفت اور علمائے اہل سنت کی کردار کشی پر مشتمل ہیں۔ ساتھ ہی یہ مضمون ہرگز اس لائق نہیں تھا کہ جماعت اسلامی ہند کے ترجمان کے صفحات پر اسے جگہ ملے۔ زیرِ نظر کتاب میں اس کے اسباب اور متعلقہ تفصیلات پڑھ کر آپ بھی اسی نتیجے تک پہنچیں گے۔ یہاں ان کی نشان دہی اور کچھ خامہ فرسائی کر کے آپ کا زیادہ وقت لینا ہم مناسب نہیں سمجھتے۔

ہندوستان کے دو جلیل القدر و عظیم المرتبت علمائے اہل سنت حضرت علامہ فضل رسول عثمانی بدایونی (وصال ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء) اور فقیہ اسلام امام احمد رضا بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء) کو بلا کسی دلیل وثبوت وشہادت کے ڈاکٹر مغل فاروق پرواز نے انگریزوں کا ایجنٹ لکھا ہے اور جب ان سے میں نے اپنے ایک اداریہ (ماہنامہ کنزالایمان دہلی۔ شمارہ دسمبر ۲۰۰۶ء) کے ذریعہ کوئی دلیل وثبوت طلب کیا تو وہ اب تک اپنے عاید کردہ الزام کو کسی بھی طرح ثابت کرنے میں ناکام رہے اور اظہار ندامت ومعذرت کی اخلاقی جرأت بھی نہ دکھا سکے۔ ''کون ہے برطانوی سامراج کا سند یافتہ ایجنٹ؟ مشمولۂ کتاب ہٰذا کا خلاصہ مذکورہ اداریہ ہے۔

پرواز صاحب نے اداریہ پڑھ کر اپنی خِفّت مٹانے کے لئے جو کچھ لکھا ہے اسے بھی آپ اس کتاب کے اندر بعنوان ''الزام بلاثبوت اور دعویٰ بلادلیل کے تازہ نمونے'' آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے اور اسی کے ساتھ آپ کو اطمینان بخش جواب بھی ملتا جائے گا۔

الزام اور پرپگنڈہ کے یہ نمونے دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ ہٹلر کی بھی یہی رَوِش اور اس کی بھی یہی پالیسی تھی۔ اڈولف ہٹلر (ADOLF HITLER-1889-1945) پروپگنڈہ کے اپنے

خیال ونظریہ کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

''ہنر مندانہ اور مسلسل پروپگنڈے کے ذریعہ یہ بھی ممکن ہے کہ لوگ بہشت کو دوزخ اور دوزخ کو بہشت سمجھنے لگیں۔ اور جو پروپگنڈہ سب سے مؤثر ہونا چاہیے لازم ہے کہ اسے زیادہ عاقلانہ اور دانش مندانہ بنانے کی کوشش نہ کی جائے۔ ایسا پروپگنڈہ ہمیشہ اور اولاً جذبات پر مبنی ہونا چاہیے نہ کہ عقلی استدلال پر۔ پروپگنڈہ کو علمی صحت و درستی سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا کہ پوسٹر کو فن سے ہوسکتا ہے۔ عوام کی جتنی زیادہ تعداد کو متاثر کرنا منظور ہے پروپگنڈے کی سطح اتنی ہی نیچے ہونی چاہیے۔ (ص: ۲۲۸۔ دسواں باب زیر عنوان۔ ہٹلر کی کتاب ''میری جدوجہد''۔ نام کتاب ''کتابیں جنھوں نے دنیا بدل ڈالی''۔ تصنیف: رابرٹ لی ڈاؤنز۔ ترجمہ۔ غلام رسول مہر۔ مطبوعہ پاک وہند)

قارئین خود غور کریں کہ اگر کوئی شخص یہ کہے اور لکھے کہ مولانا فضل رسول بدایونی اور مولانا احمد رضا بریلوی انگریزوں کے ایجنٹ تھے۔ اور کوئی شخص یہ کہے کہ ڈاکٹر مغل فاروق پرواز سنگھ پریوار کے ایجنٹ ہیں۔ اور ان دونوں میں سے کوئی شخص بھی کوئی دلیل وثبوت پیش کرنے سے قاصر رہے۔ ساتھ ہی اپنی بات پر اِصرار بھی کرتا رہے تو اسے شرارت وشر انگیزی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے؟

مخالفینِ امام احمد رضا بریلوی ہٹلر کی پروپگنڈہ پالیسی کی طرح ایک جذباتی مسئلہ کا سہارا لے کر امام احمد رضا پر انگریز نوازی کا الزام اس طرح عائد کرتے ہیں کہ تحریک خلافت وتحریک ترک موالات اور تحریک ہجرت کے دور میں جب کہ ہندوستانیوں کے اندر قائدین تحریک نے برطانیہ مخالف طوفانی لہر پیدا کر رکھی تھی اس زمانے میں مولانا احمد رضا نے اس تحریک کی مخالفت میں فتاویٰ جاری کیے تھے۔

ہفت روزہ شہاب لاہور کے چیف ایڈیٹر، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے معتمد، مولانا امین احسن اصلاحی ومولانا محمد ادریس کاندھلوی کے شاگرد مولانا کوثر نیازی (ولادت ۱۹۳۴ء) سابق مرکزی وزیر امور مذہبی حکومت پاکستان نے ۱۴؍ستمبر ۱۹۹۰ء کو تاج محل ہوٹل کراچی میں منعقدہ امام احمد رضا کانفرنس میں اپنا ایک وقیع مقالہ پیش کیا جو روزنامہ جنگ لاہور میں ۳؍اکتوبر ۱۹۹۰ء کو شایع ہوا اور پھر اسے کتابی شکل میں ادارہ معارف نعمانیہ لاہور نے اہتمام کے ساتھ شایع کیا۔ اس مقالہ کے آخر میں کوثر نیازی رقم طراز ہیں:

''یہ کہنا کہ ان (امام احمد رضا بریلوی) کے اقدامات انگریز نوازی پر مبنی تھے یہ بات وہی شخص کہہ

سکتا ہے جو یا تو امام احمد رضا کے مسلک کو سرے سے جانتا ہی نہ ہو یا جانتا ہو مگر جان کر نہ ماننا چاہتا ہو۔

ایک ایسا مرد مومن جسے انگریزی سامراج سے اتنی نفرت ہو کہ وہ اس کی کچہری میں جانا روا نہ سمجھتا ہو۔ جو مقدمہ قایم ہو جانے کے باوجود اس کی عدالت میں نہ گیا ہو۔ جو خط لکھتا ہو تو کارڈ اور لفافے کی الٹی طرف پتہ لکھتا ہو تا کہ انگریز بادشاہ اور ملکہ کا سر نیچا نظر آئے۔ جس نے اپنی وفات سے دو گھنٹے پہلے یہ وصیت کی ہو کہ اس دالان سے ڈاک میں آئے وہ تمام خطوط جن پر ملکہ اور بادشاہ کی تصویر ہے۔ اور روپے پیسے جن پر یہ تصویریں ہیں سب باہر پھینک دیے جائیں تا کہ فرشتہ ہائے رحمت کو آنے میں دشواری نہ ہو۔

جس نے نعت گوئی میں بھی کسی کو نمونہ مانا اور اسے سلطانِ نعت گویاں قرار دیا تو وہ حضرت مولانا کفایت علی کافی مرادآبادی تھے جنھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا۔ اس سلسلے میں باقاعدہ جدوجہد کی اور ۱۸۵۸ء میں مرادآباد کے چوک میں انھیں برسرِ عام پھانسی دے دی گئی۔

اس کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ انگریز کا حامی تھا ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ سورج، ظلمت — پھول، بدبو — چاند، گرمی — سمندر، خشکی — بہار، پت جھڑ — صبا، صرصر — پانی، حدت — ہوا، حبس — اور حکمت، جہالت کا دوسرا نام ہے۔ (ص ۱۶۔ امام احمد رضا ایک ہمہ جہت شخصیت از مولانا کوثر نیازی مطبوعہ لاہور)

ان بے توفیق مخالفین کو اس وقت بھی معلوم تھا اور آج بھی وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ امام احمد رضا بریلوی عام مصنفین کی طرح نہ خود کوئی موضوع منتخب کر کے کتب و رسائل لکھا کرتے تھے نہ سیاسی لیڈروں کی طرح انھوں نے کبھی کوئی بیان بازی کی۔ وہ بنیادی طور پر فقیہ و مفتی تھے اور ان کے پاس سیکڑوں سوالات ملک و بیرون ملک سے ہمیشہ آ کر جمع ہو جایا کرتے تھے جن کا جواب دینے ہی میں ان کا سارا وقت بلکہ ساری عمر گذر گئی۔ چنانچہ مذکورہ تحریک کے متعلق بھی کئی گوشوں اور پہلوؤں سے آپ کے پاس سوالات آئے جن کے آپ نے جوابات دیے۔ ان جوابات کا خلاصہ یہ ہے کہ:

ترکی حکومت ایک مسلم حکومت ہے جس کی اعانت ہر مسلمان پر بقدر استطاعت فرض ہے۔

خلافتِ شرعیہ کے کچھ اصول وضوابط ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ قائدین تحریک خلافت شرعی مسائل اور مسئلہ موالات کو جس طرح بازیچۂ اطفال بنارہے ہیں اور ایک مسئلہ دینیہ کی آڑ میں سیاسی عزائم پورے کیے جارہے ہیں اور انتہا یہ ہے کہ اس تحریک سے وابستہ مسلم قیادت کو گاندھی کے قدموں میں ڈال دیا گیا ہے یہ اسلام اور مسلمان دونوں کے لئے سخت مضر ہے۔ موالات سارے کفار ومشرکین ویہود ونصاریٰ سے ناجائز ہے اور یہاں ساری قیادت انھیں میں سے ایک گروہ کے سپرد کی جارہی ہے جس کا کوئی جواز نہیں۔ ہندوستان کو آزاد ہونا چاہیے مگر اس کے لئے شرعی حدود کی پامالی کسی قیمت پر جائز نہیں۔ ہندو مسلم اتحاد کے نام پر اسلام وشعائر اسلام کی بے حرمتی کس طرح برداشت کی جاسکتی ہے؟ اور ہندوستان سے ہجرت کیوں اور کس طرح جائز ہے؟ کیا یہ مسلمانوں کو بے گھر بے در بنانے اور ہندوستان کو مسلمانوں سے خالی کرنے کی در پردہ سازش نہیں؟ جس کے شکار یہ مسلم قائدین ہورہے ہیں؟

انھیں حقائق کا اظہار امام احمد رضا بریلوی نے المحجة المؤتمنة فی آیة الممتحنة (۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۰ء) میں مختصر طور پر اس طرح فرمایا ہے۔

''دشمن اپنے دشمن کے لئے تین باتیں چاہتا ہے:

اول:—— اس کی موت کہ جھگڑا ہی ختم ہو۔

دوم:—— یہ نہ ہو تو اس کی جلاوطنی کہ اپنے پاس نہ رہے۔

سوم:—— یہ بھی نہ ہو تو اخیر درجہ اس کی بے پری کہ عاجز بن کر رہے۔

مخالف نے یہ تینوں درجے ان پر طے کردیے اور ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔ خیر خواہی سمجھے جاتے ہیں۔

اولاً: جہاد کے اشارے ہوئے۔ اس کا کھلا نتیجہ ہندوستان کے مسلمانوں کا فنا ہونا تھا۔

ثانیاً: جب یہ نہ بنی تو ہجرت کا بھرا دیا کہ کسی طرح یہ دفع ہوں۔ ملک ہماری کبڈیاں کھیلنے کو رہ جائیں۔ یہ اپنی جائدادیں کوڑیوں کے مول بیچیں یا یوں ہی چھوڑ جائیں۔ بہر حال ہمارے ہاتھ آئیں۔ ان کی مساجد و مزاراتِ اولیاء ہماری پامالی کو رہ جائیں۔

ثالثاً:—— جب یہ بھی نہ نبھی تو ترکِ موالات کا جھوٹا حیلہ کرکے ترکِ معاملت پر ابھارا ہے کہ نوکریاں چھوڑ دو۔ کسی کونسل کمیٹی میں داخل نہ ہو۔ مال گذاری ٹیکس کچھ نہ دو۔ خطابات واپس کردو۔

امر اخیر تو صرف اس لئے ہے کہ ظاہری نام کا دنیاوی اعزاز بھی کسی مسلمان کے لئے نہ رہے۔ اور پہلے تین اس لئے کہ ہر صیغہ ہر محکمہ میں صرف ہنود رہ جائیں۔ جہاں ہنود کا غلبہ ہوتا ہے حقوقِ اسلام پر جو گذرتی ہے ظاہر ہے۔ (ص:۵۳۶۔ جلد ۱۴۔ فتاویٰ رضویہ مترجم۔ رضا فاؤنڈیشن لاہور)

گاندھی کی قیادت میں چلنے والی تحریکِ خلافت کا اصل مقصد واضح کرتے ہوئے امام احمد رضا بریلوی اپنی کتاب "دوام العیش فی الائمة من قریش" (۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء) میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''ترکوں کی حمایت تو محض دھوکے کی ٹٹی ہے۔ اصل مقصود بغلامیِ ہنود سوراج کی چکی ہے۔ بڑے بڑے لیڈروں نے جس کی تصریح کر دی ہے۔ بھاری بھرکم خلافت کا نام لو۔ عوام بھڑیں، چندہ خوب ملے اور گنگا وجمنا کی مقدس زمین آزاد کرانے کا کام چلے۔

اے پس روِ مشرکاں بزمزم نہ رسی
کیں رہ کہ تو می روی بہ گنگ وجمن ست

(ص:۲۲۵۔ جلد ۱۴۔ فتاویٰ رضویہ مترجم۔ رضا فاؤنڈیشن لاہور)

حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی لکھنوی (متولد ربیع الآخر ۱۲۹۵ھ/اپریل ۱۸۷۸ء متوفی رجب ۱۳۴۴ھ/جنوری ۱۹۲۶ء) کی چلائی ہوئی تحریک خلافت (۱۹۱۹ء) میں چوں کہ مذہبی عنصر مذہبی نعرہ اور مذہبی قیادت کا چہرہ مسلمانوں کے سامنے تھا جوان کے جذبات سے ہم آہنگ بھی تھا اور بعض معروف علمائے اہل سنت مثلاً حضرت مولانا عبدالعلیم صدیقی میرٹھی وحضرت مولانا عبدالماجد قادری بدایونی وحضرت مولانا نثار احمد کان پوری وحضرت مولانا معین الدین اجمیری و حضرت مولانا فاخر الٰہ آبادی وغیرہ نے بھی ایک حد تک اس کی تائید وحمایت کر دی تھی اس لئے آناً فاناً پورے ملک میں طوفان اور سیلاب کی طرح اسے بڑھنے اور پھیلنے میں کوئی دیر نہیں لگی۔ مذکورہ علما میں سے اکثر کی تائید وحمایت تحریکِ موالات وغیرہ میں محتاط ومشروط تھی۔

حضرت مولانا شاہ احمد نورانی سابق صدر جمعیۃ العلمائے پاکستان (متوفی شوال ۱۴۲۴ھ/ دسمبر ۲۰۰۳ء) کے والد ماجد مبلغ اسلام حضرت مولانا عبدالعلیم صدیقی میرٹھی (وصال ۱۳۷۴ھ/

۱۹۵۴ء مدفون جنت البقیع مدینہ طیبہ) اور مذکورہ علمائے اہل سنت و مولانا محمد علی جوہر و مولانا شوکت علی و مولانا حسرت موہانی وغیرہ زعمائے تحریک خلافت کی صف اول میں شامل تھے۔

حضرت مولانا عبدالعلیم میرٹھی اوران کے بھائی مولانا احمد مختار صدیقی میرٹھی (متوفی ۱۳۵۷ھ/ ۱۹۳۸ء) امام احمد رضا بریلوی کے مشاہیر خلفا میں ہیں۔مولانا احمد مختار میرٹھی کو بھی قومی وملکی معاملات میں خاصی دل چسپی تھی۔

مولانا احمد مختار میرٹھی کے بارے میں مولانا محمود احمد قادری مظفر پوری لکھتے ہیں:

''۱۹۲۰ء میں خلافت کی تحریک میں پر جوش حصہ لیا۔آپ نے اورآپ کے دونوں چھوٹے بھائیوں مولانا نذیر احمد خجندی میرٹھی اور مولانا عبدالعلیم صدیقی میرٹھی نے ۱۹۲۱ء میں مرکزی خلافت فنڈ میں تین لاکھ کا چندہ دیا۔۱۹۲۲ء میں جیل بھی گئے۔ (ص:۲۳۔تذکرۂ علمائے اہل سنت از مولانا محمود احمد قادری مطبوعہ کان پور۱۳۹۰ھ/ ۱۹۷۰ء)

بہر حال! مجموعی طور پر تحریک خلافت جس رخ پر جارہی تھی اور تحریک ترک موالات نے جو رنگ اختیار کرلیا تھا اس میں جوش وجذبہ نے اتنا ہیجانی ماحول پیدا کردیا تھا کہ ہوش وحواس اور مستقبل بینی سے قائدینِ تحریک عام طور پر غافل اور بے نیاز ہوگئے تھے۔شرعی اصول وضوابط سے بے پروا ہوکر طرح طرح کی جذباتی باتیں کہی جارہی تھیں۔انگریز دشمنی کے ساتھ مشرک دوستی کے نظارے عام تھے۔سیاسی عزائم کے سامنے سب کچھ یا بہت کچھ جائز کردیا گیا تھا جس کا قصہ طویل اوراس وقت کے اخبارات ورسائل میں مذکورو مسطور ہے۔

حضرت مولانا نعیم الدین مرادآبادی (متوفی ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء) خلیفۂ امام احمد رضا بریلوی اپنی ایک تحریر میں سلطنتِ اسلامیہ کی اعانت وحمایت اور خادم الحرمین کی امداد ونصرت مسلمانوں پر فرض قرار دینے کے ساتھ تحریک خلاف کے ایک نہایت اہم پہلو کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''اگر اتنا ہی ہوتا کہ مسلمان مطالبہ کرتے اور ہندوان کے ساتھ متفق ہوکر ''بجا ہے'' درست ہے'' پکارتے — مسلمان آگے ہوتے اور ہندوان کے ساتھ ہوکر ان کی موافقت کرتے تو بے جانہ تھا۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہندو امام بنے ہوئے آگے آگے ہیں اور مسلمان آمین کہنے والے کی طرح ان کی ہر صدا کے ساتھ موافقت کررہے ہیں۔

پہلے ''مہاتما گاندھی'' کا حکم ہوتا ہے اس کے بعد ''مولوی عبدالباری'' کا فتویٰ مقلد کی طرح سرِ نیاز خم کرتا چلا جاتا ہے۔ ہندو آگے بڑھتے ہیں اور مسلمان ان کے پیچھے پیچھے اپنا دین و مذہب ان پر نثار کرتے چلے جاتے ہیں۔(ماہنامہ السواد الاعظم مراد آباد شمارہ ماہ شوال ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۲۰ء)

امام احمد رضا کا سارا اختلاف یہ تھا کہ مسئلہ خلافت و مسئلہ موالات جو خالص شرعی مسائل ہیں انھیں استعمال کرنے اور ان کی صورت مسخ کرنے کی کوشش کیوں جارہی ہے؟ شریعت مخالف عمل اور بیان کا سلسلہ کیوں جاری کیا گیا ہے؟ اور شرعی مسئلہ کی باگ ڈور کسی کافرو مشرک یا کسی یہودی و نصرانی کے ہاتھ میں دینا کس طرح جائز ہوسکتا ہے؟ برطانیہ سے ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے سیدھے سیدھے تحریک آزادی چلا کر عوام کو بیدار کیا جائے اور کسی بھی مرحلے میں ہندو مسلم اتحاد کے نام پر کفار و مشرکین کی خوشنودی حاصل کرتے ہوئے احکام شریعت کو پامال نہ کیا جائے اور مشرکین ہند کی قیادت مسلمانانِ ہند پر مسلط نہ کی جائے نہ اس تحریک کو ان کے حوالہ کیا جائے جیسا کہ اس وقت یہ سب کچھ ہورہا ہے۔

یہ موقف شرعی اصول پر مبنی اور بالکل درست تھا اور ہے جس کی شہادت بعد کے حالات نے بھی فراہم کردی۔ اور تاریخ ہند نے بھی امام احمد رضا بریلوی کے موقف کو صد فی صد درست قرار دیا۔ اس سلسلے میں قدیم شواہد بہت کافی ہیں۔ کچھ جدید تاریخی شواہد بھی ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

''نور بصیرت'' کے عنوان سے روزنامہ نوائے وقت لاہور کے کالم نگار اور مشہور صحافی میاں عبدالرشید لکھتے ہیں:

> ''کانگریسی مسلمانوں نے صرف اپنی ایک آنکھ کھلی رکھی تھی۔ وہ صرف انگریز کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ ان دنوں چوں کہ تقریباً سارے پریس پر ہندوؤں کا قبضہ تھا اس لئے حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی اور آپ کے ہم خیال لوگوں کے خلاف سخت پروپگنڈہ کیا گیا اور بدنام کرنے کی مہم چلائی گئی۔ لیکن تاریخ نے انھیں حضرات کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اب اس پروپگنڈے کا طلسم ٹوٹ رہا ہے اور حق کھل کر سامنے آرہا ہے۔(ص: ۱۲۰۔ پاکستان کا پس منظر اور پیش منظر۔ ازمیاں محمد عبدالرشید۔ مطبوعہ لاہور)
>
> ''اگر گاندھی نے خلافت موومنت کا ساتھ دیا تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ

خلافت کے خواہاں تھے کیوں کہ خلافت اس وقت تک خلفاے راشدین والی خلافت رہی ہی نہیں تھی۔ گاندھی نے سوچا کہ اگر اسی بہانے ہندوستانی مسلمان ان کے ساتھ آتے ہیں تو کیا ہرج ہے؟ ہمیں تو یہ بعد میں معلوم ہوا کہ خلافت تحریک ہمارے لئے بالکل بے فیض تھی۔ (ص:۳۰۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا نئی دہلی۔ شمارہ ۲۵ر نومبر ۲۰۰۶ء بقلم حسن کمال)

''خلافت کے لئے مسلمانوں کے جوش وخروش کو دیکھتے ہوئے گاندھی جی نے اسے کانگریس کے پروگرام میں شامل کرلیا اور اس طرح کانگریس کو مسلمانوں کی حمایت مل گئی۔ چنانچہ جب کانگریس کا ۳۵ واں اجلاس زیر صدارت آچاریہ راگھو، ناگ پور میں منعقد ہوا تو اس اجلاس میں ۱۴۵۸۲ مندوبین شریک تھے جس میں اکثریت یعنی ۱۰۵۰۰ صرف مسلمانوں کی تھی۔ اس اجلاس کی تجاویز کے تحت یکم اگست ۱۹۲۰ء کو مہاتما گاندھی نے ترکِ موالات کی تحریک شروع کی۔ (ص:۴۴۔ ۴۵۔ ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۱۹۔ شمارہ ماہ فروری ۲۰۰۰ء بقلم مختار احمد مکی۔ کریم کالج جمشید پور، بہار)

یہی وجہ ہے کہ امام احمد رضا بریلوی کے فرزند اکبر حضرت مولانا حامد رضا بریلوی (متوفی ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) نے قائدین خلافت وموالات کو مخاطب کرتے ہوئے صاف صاف فرمایا تھا کہ:

''یہ لوگ موالات کو حکم شریعت سمجھ کر نہیں مانتے ہیں۔ یہ تو مسلمانوں کو اپنے موافق کرنے کے لئے آیتیں تلاوت کرتے ہیں۔ مانتے تو ہیں گاندھی کا حکم سمجھ کر۔ یہی وجہ ہے کہ ترک موالات کے ساتھ ہنود سے موالات فرض سمجھتے ہیں۔ آج تمام ہندوستان جانتا ہے کہ خلافت کمیٹی صرف ترک موالات بتاتی ہے اور ہنود سے موالات نہ تنہا موالات بلکہ ان کی رضا میں فنا ہوجانا ضروری قرار دیتی ہے۔ (ص:۵۵۔ دوامغ الحمیر۔ جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی۔ ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء)

ترک معاملت وترک موالات سے مشرکین ہند کو مستثنیٰ کرکے صرف انگریزوں سے ترک موالات بحکم گاندھی ۱۹۲۴ء تک باضابطہ مذہبی فرض قرار دیا گیا کیوں کہ نان کوآپریشن موومنٹ

جیسے ہی ۱۹۲۴ء میں گاندھی نے واپس لینے کا اعلان کیا ویسے ہی سارے کانگریسی علما و خلافتی لیڈر اپنا یہ مذہبی فرض بھول گئے۔ ورنہ مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء) نے اپنی ایک تقریر میں اپنی اسلامی بصیرت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا۔

''میں بحیثیت ایک مسلمان ہونے کے جسے خدا کے فضل سے شریعت اسلامی کی کچھ بصیرت دی گئی ہے، کہتا ہوں کہ ایک مسلمان پر حبِ وطن کے لحاظ سے، مذہب کے اعتبار سے، اخلاق کے لحاظ سے فرض ہے کہ ترک موالات کرے۔'' (ص:۳۰۔ روز نامہ زمیندار لاہور۔ ۲۱/ اکتوبر ۱۹۲۰ء)۔

''مسلمانوں کے لئے یہ قریب قریب کفر ہوگیا ہے کہ وہ برٹش گورنمنٹ سے اپنی استطاعت کے اندر محبت و اعانت اور اطاعت کا کوئی تعلق رکھیں۔ اگر وہ کوئی تعلق اس طرح کا رکھیں گے تو ایک منٹ کے لئے بھی ان کو یہ حق نہ ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کی صف میں جگہ دیں۔ (ص: ۴۷۔ خطبات آزاد۔ اردو کتاب گھر دہلی۔ ۱۹۵۹ء)

مشہور ادیب و صحافی شوکت صدیقی لکھتے ہیں:

''مولانا احمد رضا خاں نہ کبھی انگریزوں کی حکومت سے وابستہ رہے نہ ان کی حمایت میں کوئی فتویٰ دیا۔ نہ اس بات کا کسی طور پر اظہار کیا۔ کم از کم میری نظر سے ان کی ایسی کوئی تحریر یا تقریر نہیں گذری۔ اگر ایسی کوئی بات سامنے آتی تو اس کا ذکر ضرور کرتا۔ اس لئے کہ نہ میرا ان کے مسلک سے تعلق ہے نہ ان کے خانوادے سے۔ (ص: ۲۱۷۔ جہانِ رضا۔ از مرید احمد چشتی۔ مطبوعہ مجلس رضا لاہور۔ اشاعت اول ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء)

شوکت صدیقی اس سے پہلے لکھ چکے ہیں کہ:

''وہ انگریزوں اور ان کی حکومت کے اس قدر کٹر دشمن تھے کہ لفافہ پر ہمیشہ الٹا ٹکٹ لگاتے تھے اور برملا کہتے تھے کہ میں نے جارج پنجم کا سر نیچا کر دیا۔ انھوں نے زندگی بھر انگریزوں کی حکمرانی کو تسلیم نہیں کیا۔

مشہور ہے کہ مولانا احمد رضا خاں نے کبھی عدالت میں حاضری نہیں دی۔ ایک بار انھیں ایک مقدمہ کے سلسلے میں عدالت میں طلب بھی کیا گیا مگر انھوں نے توہین عدالت کے باوجود حاضری نہ دی۔ اور یہ کہہ کر نہ دی کہ ''میں انگریزوں کی حکومت ہی کو جب تسلیم نہیں کرتا تو اس کے

عدل وانصاف کو کیسے تسلیم کرلوں؟ (جہان رضا مطبوعہ لاہور)

مولانا محمد ادریس کاندھلوی ومولانا امین احسن اصلاحی کے شاگرد مولانا کوثر نیازی سابق مرکزی وزیر مذہبی امور حکومت پاکستان (ولادت ۱۹۳۴ء) فیصلہ کن انداز میں کہتے ہیں:

''تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، تحریک ہجرت اور ایک اور بحث کہ ہندوستان دار االاسلام ہے یا دار الحرب ان سارے موضوعات پر امام احمد رضا کا جو نقطۂ نظر تھا ہر چند کہ اس پر گرد اڑائی جاتی ہے لیکن علمی سیاست کے تقاضوں سے جس قدر ہم آہنگ اور دینی اقدار کی ترجمانی سے جس قدر نزدیک اور حقیقت پر مبنی ان کا موقف ہے کسی اور کا نہیں۔ (ص: ۴۷۔ سالنامہ معارف رضا کراچی۔۱۹۹۰ء)

اس سے ملتے جلتے موقف کی صحت ماضی قریب کے ہنگامی دور میں دیکھنی ہو تو تحریک بابری مسجد کو سامنے رکھیے اور دیکھیے کہ جذباتیت کے پردے میں کیسے کیسے سیاسی کھیل ہوئے اور مسلمانوں کے سر سے کیسی قیامت گذر گئی۔ حالاں کہ علمائے کرام اور ذمہ دار حضرات نے تحریک کے پہلے ہی مرحلے میں جذباتیت وہنگامہ آرائی سے دور رہنے اور قانونی وجمہوری دائرے میں پُرامن تحریک سے مسئلہ کا حل ڈھونڈھنے کی مناسب تدبیریں کرتے رہنے کی ہدایت دی تھی مگر کچھ جذباتی مسلم لیڈروں اور فرقہ پرست وفتنہ پرور مسلم دشمن عناصر نے کیا کچھ نہیں کیا اور جو عظیم نقصان شہادتِ بابری مسجد (۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء) کی شکل میں مسلمانوں کو اٹھانا پڑا اس سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے۔

اس سلسلے میں نگاہِ غور اور نگاہِ انصاف سے یہ چند تاریخی تحریریں پڑھ کر قارئین خود فیصلہ کرلیں کہ کون سا موقف صحیح تھا؟ کس موقف کے اختیار کرنے میں ملتِ اسلامیہ ہند کا فائدہ تھا؟ اور کس موقف کو اصولی اور شرعی قرار دیا جائے گا؟

''آج جب کہ زیریں عدالت نے بابری مسجد کا تالا کھولنے اور اس میں پوجا کرنے کی اجازت دے دی ہے اس سے مسلمانوں کے جذبات شدید طور پر مجروح ہوئے ہیں لیکن انھیں ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں کیوں کہ آئینی وقانونی جدوجہد کے راستے بند نہیں ہوئے ہیں۔ یہ فیصلہ یقیناً عدالتِ بالا میں چیلنج کیا جائے گا۔ اور فوری طور پر کرنے کا کام یہ ہے کہ اس مسئلے کو عدالتِ بالا میں لے جائے جانے کا اہتمام کیا جائے اور مسلم ماہرینِ قانون عملی طور پر اس کے

لئے متحرک ہوجائیں اور تدبر و دانش مندی کے ساتھ اسے آگے بڑھائیں۔

حکومتِ ہند سے ہمارا مطالبہ ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات اور ان کے جائز حقوق کو تسلیم کرتے ہوئے بابری مسجد اجودھیا کو ان کے حوالہ کرے اور اس میں انھیں نماز ادا کرنے کی باضابطہ اجازت دے۔ (ص:۱۴۔ ہفت روزہ نئی دنیا دہلی۔ شمارہ ۲۵/فروری تا ۳/مارچ ۱۹۸۶ء۔ از یٰسین اختر مصباحی)

قائدین تحریک بابری مسجد کی جانب سے تقریباتِ ۲۶/جنوری (۱۹۸۷ء) کے بائیکاٹ کی اپیل کے بارے میں بیان دیا گیا کہ:

''پورے صبر و استقامت کے ساتھ یہ فکری و تاریخی جنگ لڑنی ہوگی اور منزلِ انصاف تک پہنچنے کے لئے پہلے ہی مرحلے میں ایسا قدم ہرگز نہیں اٹھانا چاہیے جو اسے اپنی منزل سے دور کرکے غلط راہوں پر ڈال دے اور نئی نئی مشکلات و مسائل کا شکار بنادے۔ بابری مسجد کانفرنس نے یوم جمہوریہ کو یوم غم منانے کا مسلمانوں سے جس طرح مطالبہ کیا ہے وہ ایک نہایت عجلت پسندانہ اقدام ہے جس پر مسلم جماعتوں اور تنظیموں کی جانب سے نظر ثانی کا جوابی مطالبہ بھی شروع ہوچکا ہے۔ (ص:۱۰ ہفت روزہ اخبارِ نو دہلی۔ شمارہ ۱۶ تا ۲۲/جنوری ۱۹۸۷ء۔ از یٰسین اختر مصباحی)

اسی طرح بابری مسجد تحریک سے وابستہ مسلم زعماء نے طے کیا تھا کہ ۱۴/اکتوبر ۱۹۸۸ء کو اجودھیا مارچ کیا جائے جس کے ردعمل میں ہندو مسلم فساد اور جگہ جگہ تصادم کے خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے ایک طویل بیان محررہ ۸/جون ۱۹۸۸ء میں کہا گیا۔

''اب جہاں تک بابری مسجد کی بازیابی کا سوال ہے تو اس کے لئے صرف ایک ہی پُرامن اور محفوظ راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم مسلم رائے عامہ کی ساری قوت فقط اس مطالبہ پر صرف کریں کہ اس مسجد کے استحقاق کا فیصلہ کرنے کے لئے حکومت ایک اسپیشل بنچ قائم کرے اور مقدمہ کی سماعت کے لئے جنوبی ہند کے کسی جج کو مقرر کرے۔ ہمارے پاس اپنے استحقاق کے اتنے تاریخی و قانونی دلائل و شواہد ہیں کہ خدا کے فضل و کرم سے فیصلہ ہمارے حق میں ہوگا اور رام جنم بھومی کا

دعویٰ ہمیشہ کے لئے باطل ہو جائے گا جس کے بعد قانون کی نظر میں بھی بابری مسجد کی یہ پوزیشن بالکل واضح ہو جائے گی کہ وہ صرف بابری مسجد ہے رام جنم بھومی نہیں ہے اور پھر پوری دنیا کی رائے عامہ ہمارے ساتھ ہوگی۔

اور یہ راستہ ہمیں اس لئے اختیار کرنا چاہیے کہ اس کے سوا بابری مسجد کی بازیابی کا بظاہر کوئی راستہ نہیں۔ اور ہمیں اپنے آئینی و اخلاقی حدود اور اسلامی قواعد وضوابط کے مطابق ہی سارے اقدامات کرنے چاہئیں۔

(ص:۵ ہفت روزہ نئی دنیا دہلی۔ شمارہ ۱۷؍ تا ۲۳؍ جون ۱۹۸۸ء۔ وص ۸۔ ہفت روزہ اخبار نو دہلی۔ شمارہ ۲۴؍ تا ۳۰؍ جون ۱۹۸۸ء از ارشد القادری و یٰسں اختر مصباحی)

''تحریکِ خلافت سے تحریک بابری مسجد تک'' کے عنوان سے لکھے گئے ایک اداریہ میں کہا گیا کہ:

''صرف شوروغا اور جذباتی ہنگامہ آرائیوں کی بیساکھیاں استعمال کی گئیں تو اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ عہد حاضر کا مؤرخ تحریکِ تحفظ بابری مسجد کو تحریک تحفظ خلافت سے زیادہ جذباتی اور اسی کی طرح ناکام تحریک قرار دے۔ بلکہ اس تحریک کے سر یہ الزام بھی عاید کردے کہ اس کی غلط روی نے ملت اسلامیۂ ہند کو چند در چند مسائل ومشکلات سے دو چار کر دیا اور اس کے تلخ ترین نتائج نے مسلم عوام کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ (اداریہ ماہنامہ حجاز جدید دہلی، شمارہ دسمبر ۱۹۸۸ء از یٰسں اختر مصباحی)

''ہمیں یہ لکھنے میں کوئی عار نہیں کہ بابری مسجد تحریک کے کاندھوں پر سوار بعض مسلم لیڈر جن کی حکمتِ عملی بوٹا سنگھ (مرکزی وزیر داخلہ) کی میز پر تیار ہوتی ہے انھوں نے سیاست کی دوکان چمکانے کی خاطر مسلمانوں کو اس خوفناک مرحلے تک پہنچایا۔ جس طرح اس حقیقت کا اظہار کرنے میں ہمیں کوئی خوف دامن گیر نہیں کہ بابری مسجد ایک منظّم ریاستی دہشت گری کا شکار ہوئی ہے۔ ساتھ ہی ۹؍ نومبر ۱۹۸۹ء کو فرقہ پرست ہندو تنظیموں کے سامنے گھٹنے ٹیک کر حکومتِ وقت نے بدترین موقع پرستی کا ثبوت دیا اور وشو ہندو پریشد و بجرنگ دل و بی جے پی کی مردہ رگوں میں اس نے اپنی غلط حکمت عملی سے ایک تازہ خون دوڑا دیا ہے۔ (اداریہ ماہنامہ حجاز جدید دہلی۔ شمارہ دسمبر ۱۹۸۹ء از یٰسں اختر مصباحی)

''رہ جاتی ہے یہ بات ہے کہ مسجد کا تحفظ کس طرح کیا جائے تو اب بظاہر اس کی دو ہی شکلیں

باقی رہ گئی ہیں جو ممکن العمل ہیں۔ ایک شکل تو یہ ہے کہ مسلم علما و قائدین اور ہندو ذمہ دار بیٹھ کر آپس میں بات چیت کر کے مسئلہ کا حل نکالیں۔ اور دوسری شکل یہ ہے کہ عدالت کے فیصلے کا انتظار کیا جائے۔ عوامی احتجاج تو مسلمان بہت کر چکے۔ اور طاقت کے ذریعہ مسجد کے تحفظ کا جہاں تک سوال ہے تو فی الحال اس کے دور دور تک بظاہر کوئی آثار نہیں۔ (اداریہ ماہنامہ حجاز جدید دہلی۔ شمارہ دسمبر ۱۹۹۰ء۔ از یٰسین اختر مصباحی)

"تقریروں کے ذریعہ جہاد کا نعرہ بلند کرنے والوں نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ یہ جہاد کہاں اور کس سے اور کس طرح کیا جا رہا ہے؟ کیا ۹ر نومبر ۱۹۸۹ء کو شیلانیاس کے موقعہ پر کوئی ایک بھی مجاہد اجودھیا پہنچا؟ کیا ۳۰ر اکتوبر ۱۹۹۰ء کو جب ہزاروں ہندوؤں نے بابری مسجد پر دھاوا بول دیا تھا تو کوئی مجاہد اجودھیا کے آس پاس بھی نظر آیا؟ اور کیا ۶ر دسمبر ۱۹۹۰ء کو جب وہاں ستیہ گرہ کی تحریک شروع ہوئی تو کوئی مجاہد اجودھیا نگری پہنچا؟ پھر جذباتی باتیں کرنے اور غیر ضروری خوش فہمی میں مبتلا ہونے کا کیا جواز اور اس کی کیا ضرورت ہے؟ (اداریہ ماہنامہ حجاز جدید دہلی۔ جنوری فروری ۱۹۹۱ء۔ از یٰسین اختر مصباحی)

۶ر دسمبر ۱۹۹۰ء کو دارالعلوم غریب نواز الہ آباد (یوپی) میں علمائے اہل سنت کی ایک اہم مٹنگ ہوئی جس میں مختلف تجاویز پاس ہوئیں۔ مثلاً (۱) بابری مسجد ہر حال میں بابری مسجد ہے اس لئے اس کی بیع و منتقلی کسی شکل میں جائز نہیں۔ نہ اسے اکوائر کرنے کا حکومت یا کسی کو اختیار ہے۔ (۲) قبرستان کی زمین پر ۹ر نومبر ۱۹۸۹ء کو کیا جانے والا شیلانیاس ناجائز ہے۔ (۳) مسلم عوام و قائدین ہوش مندی و دور اندیشی کے ساتھ موجودہ نازک حالات کا مقابلہ کریں۔ سڑک پر آ کر غیر ضروری احتجاج و مظاہرہ سے گریز کرتے ہوئے خدا اعتمادی و خود اعتمادی کے ساتھ اپنے آئینی و جمہوری حقوق کے تحفظ کی مؤثر تدابیر اختیار کریں اور حرارتِ ایمانی کے ساتھ فراستِ ایمانی کا بھی مظاہرہ کریں۔

شرکائے مٹنگ و دستخط کنندگان۔ مفتی محمد شریف الحق امجدی (مبارک پور) علامہ ارشد القادری (جمشید پور) علامہ ضیاء المصطفیٰ قادری (مبارک پور) مولانا محمد احمد اعظمی مصباحی، (مبارک پور) مولانا یٰسین اختر مصباحی (دہلی) مولانا مفتی شفیق احمد شریفی (الہ آباد) مولانا

اختر حسین قادری (راجستھان) حافظ ظہیر الدین قادری (کان پور) سید محمد اکمل اجملی و سید محمد اجمل اجملی و سید شمیم گوہر (الہ آباد) مولانا ادریس رضا حشمتی (پیلی بھیت) مولانا ملک الظفر سہسرامی (سہسرام بہار) وغیرہ۔ (ص: ۱۱۰۔ ماہنامہ حجاز جدید دہلی، شمارہ جنوری وفروری ۱۹۹۱ء)

تحریکِ خلافت اور تحریکِ بابری مسجد کی جذباتیت اور سیاسی داؤ پیچ کے جو عبرتناک و افسوسناک نتائج ملت اسلامیۂ ہند کو جھیلنے اور بھگتنے پڑے ان کا ذکرو بیان بھی کچھ کم المناک اور روح فرسا نہیں ہے اس لئے ہم ان کی تفصیلات میں نہ جاکر یہاں صرف ایک بات عرض کریں گے کہ کم از کم آیندہ کے لئے مسلمانانِ ہند یہ سبق اچھی طرح یاد کرلیں کہ جن مذہبی وشرعی مسائل میں اہل سیاست زیادہ دلچسپی لینے لگیں ان سے حددرجہ چوکنا اور ہوشیار رہیں۔ اور ہر لمحہ اس بات پر نظر رکھیں کہ ان کی آڑ میں ان کے اصل مقاصد کیا ہیں اور کچھ لوگ مذہب وشریعت کا نام لے کر مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنے اور اپنے سیاسی عزائم کی تکمیل کا مذموم کاروبار تو نہیں کررہے ہیں؟ اگر خود ان سے وابستہ مسلم قائدین کے ارادے نیک بھی ہوں تو کہیں وہ کسی شاطر دماغ گروہ اور مفاد پرست عناصر کی سازشوں کا شکار تو نہیں ہورہے ہیں؟

ہر قدم پر یہ حقیقت یاد رکھیں کہ مسلمان اپنے معتقدات وعبادات اور اپنے مذہبی اعمال و افعال کے لحاظ سے دوسروں سے یکسر مختلف اور منفرد ہیں۔ انھیں اپنے تشخص اور اپنی شناخت کے ساتھ اس دنیا میں جینا اور مرنا ہے۔ دوسروں کے ساتھ معاملات تو جائز ہیں مگر مؤدت و موالات ہر کافر ومشرک و یہودی ونصرانی ومجوس وغیرہ سے قطعاً ناجائز ہے۔ معاملات کا بھی یہ مسئلہ ہے کہ دوسروں کے مذہبی امور ومعاملات سے اپنے آپ کو ہر وقت اور ہر طرح جدا رکھنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

رہ گئے دنیاوی معاملات مثلاً سیاست وتجارت وصنعت وحرفت و ملازمت وعلوم عصریہ وغیرہ نیز عام سماجی ورفاہی کاموں میں بقدرِ ضرورت وحاجت روابط وتعلقات رکھنا تو شرعاً جائز ہیں۔ دستور وآئین اور ملکی قوانین کی خلاف ورزی اور شہری امن وامان کو خطرات میں ڈالنے والی حرکات واقدامات واعلانات وغیرہ سے بچنا بھی ضروری ہے۔ پارلیمنٹ واسمبلی وغیرہ کی رکنیت، اقتدار وحکومت میں کسی نہ کسی حد تک شمولیت اور انتخابات میں شرکت گویا مسلمانانِ ہند کے لئے

ایک عملی معاھدہ ہے جس کی پابندی ان کے لئے لازم ہے۔ اوراپنے ملک ووطن کی تعمیر وترقی میں حصہ لینا بھی ان کی آئینی واخلاقی ذمہ داری ہے۔

بہرحال! ایک معروف ''پروپگنڈسٹ گروپ'' نے امام احمد رضا بریلوی کے خلاف الزام تراشیوں کا جو فتنہ اٹھا رکھا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی بلکہ خود آپ کی حیات میں بھی بعض بدنہاد افراد افترا و بہتان کا سہارا لے کر آپ کے خلاف ایک محاذ قایم کیے ہوئے تھے اور انگریز نوازی وکافرسازی جیسے الزامات واتہامات کی بوچھار کررہے تھے۔ ان کی ایسی ہی الزام تراشی و بہتان طرازی کا جواب دیتے ہوئے ایک موقعہ پر آپ مسلمانانِ ہند کو مخاطب کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''مسلمانو! اس فکرِ سخیف و کیدِ ضعیف کا فیصلہ کچھ دشوار نہیں۔ ان صاحبوں سے ثبوت مانگو کہ — کہہ دیا کہہ دیا فرماتے ہو۔ کچھ ثبوت دکھاتے ہو؟ کہاں کہہ دیا؟

کس کتاب، کس رسالے، کس فتویٰ، کس پرچے میں کہہ دیا؟ ہاں ہاں! ثبوت رکھتے ہو تو کس دن کے لئے اٹھا رکھا ہے؟ دکھاؤ — اور نہیں دکھا سکتے — اور اللہ جانتا ہے کہ نہیں دکھا سکتے — تو دیکھو — قرآن عظیم تمہارے کذّاب ہونے کی گواہی دیتا ہے۔

مسلمانو! تمہارا رب عزوجل فرماتا ہے:

فاذا لم یأتوا بالشهدآء فاولئك عند الله هم الكذبون۔

جب ثبوت نہ لاسکیں تو اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں۔

مسلمانو! آزمائے کو کیا آزمانا؟ بارہا ہو چکا کہ ان حضرات نے بڑے زور وشور سے یہ دعوے کیے اور جب کسی مسلمان نے ثبوت مانگا فوراً پیٹھ پھیر گئے اور پھر منہ نہ دکھا سکے۔ مگر حیا اتنی ہے کہ وہ رَٹ جو منہ کو لگ گئی ہے نہیں چھوڑتے۔ الخ۔ (ص: ۴۷ و ۴۸۔ تمہید ایمان از امام احمد رضا بریلوی مطبوعہ ہندوپاک)

مولانا کوثر نیازی سابق مرکزی وزیر مذھبی امور حکومتِ پاکستان امام احمد رضا بریلوی کے دور کے سیاسی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''سب سے پہلے تو اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ امام احمد رضا پالیٹیشین نہیں اسٹیٹسمین تھے۔ سیاسی لیڈر نہ تھے مدبر تھے۔ پالیٹیشین اور سیاسی لیڈر عوام کی خواہشات کے تابع ہوتے ہیں

جب کہ اسٹیٹمین اور مدبرین پیش بینی کر کے حالات کا رخ متعین کرتے ہیں۔'' (ص:۴۰۔امام احمد رضا ایک ہمہ جہت شخصیت از کوثر نیازی۔مطبوعہ لاہور ۱۹۹۰ء)

یہی وجہ ہے کہ امام احمد رضا بریلوی کی تحریر اصولی موقف اور شرعی حکم پر مشتمل ہوا کرتی ہے۔ آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ ایک متبحر عالم دین ایک دیدہ ور فقیہ ایک کہنہ مشق مفتی کی حیثیت سے لکھا اور اسی لئے آپ نے کبھی کسی کی پسند و ناپسند کی مطلق پروا نہیں کی نہ حکم شرع کے مقابلے میں آپ کو کسی کی خوشنودی و رضامندی کبھی مطلوب ہوئی۔

امام احمد رضا بریلوی امرا و حکام وقت اور روٴسائے مملکت سے ملاقات بھی پسند نہیں کرتے تھے نہ ان کے یہاں جانے یا انھیں اپنے پاس بلانے کے روادار تھے۔نواب رام پور سے صرف ایک ملاقات کا ذکر حیات اعلیٰ حضرت جلد اول میں ملتا ہے کہ امام احمد رضا بریلوی تحصیلِ علم کے دوران ایک بار اپنے کچھ رشتہ داروں سے ملاقات کے لئے رام پور تشریف لے گئے۔وہاں دربار میں آپ کا ذکر ہوا تو نواب نے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔آپ وہاں تشریف لے گئے اور چند منٹ کی ملاقات ہوئی۔اسی دوران مولانا عبدالحق خیرآبادی فرزند علامہ فضل حق خیرآبادی جو مدرسہ عالیہ رام پور کے صدرالمدرسین تھے وہ نواب سے ملاقات کے لئے آگئے۔مولانا عبدالحق خیرآبادی اور امام احمد رضا کے درمیان کچھ درسی کتابوں کے تعلق سے گفتگو ہوئی اور پھر امام احمد رضا واپس چلے آئے۔

حضرت سید ایوب علی رضوی بریلوی (متوفی ۱۳۹۰ھ/ ۱۹۷۰ء لاہور) کے حوالہ سے حضرت مولانا محمد ظفرالدین قادری رضوی (متوفی ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء) ایک واقعہ اپنی کتاب حیات اعلیٰ حضرت (جلد اول، ص ۲۰۸، ۲۰۹۔رضا اکیڈمی بمبئی۔وص ۲۷۴ و ۲۷۵۔مکتبہ نبویہ لاہور) میں بیان کرتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے۔

مقدمۂ بدایوں میں فتح یابی کے بعد امام احمد رضا بریلوی کو عرس مارہرہ میں شرکت کی حضرت سید مہدی حسن میاں مارہروی نے خصوصی دعوت دی تا کہ آپ کا شایان شان استقبال مارہرہ میں بھی ہو اور شرکا و زائرین کی طرف سے مبارکباد پیش کی جائے۔اسی دوران نواب حامد علی خاں والی ریاست رام پور جو حضرت سید مہدی حسن میاں مارہروی کے عقیدت مند تھے اور ایک زمانہ سے متمنی و کوشاں تھے کہ امام احمد رضا بریلوی سے علم جفر سیکھیں مگر ملاقات و استفادہ کا کوئی موقعہ نواب

صاحب کو میسر نہیں آ رہا تھا۔ انھوں نے از راہِ عقیدت وعنایت حضرت مہدی حسن میاں کو اپنی کوٹھی واقع نینی تال میں مدعو کیا جہاں آپ تشریف لے گئے اور ایک ہفتہ تک قیام رہا۔ کسی گفتگو کے دوران حضرت مہدی حسن میاں نے ذکر کر دیا کہ اس سال عرس مارہرہ میں حضرت مولانا احمد رضا بریلوی بھی تشریف لا رہے ہیں آپ بھی حاضری دیجیے۔ وہاں آپ کو ملاقات وگفتگو اور استفادہ کا موقعہ مل جائے گا۔ چنانچہ نواب صاحب نے دعوت قبول کر لی اور سفر کی تیاری شروع کر دی۔

ادھر امام احمد رضا بریلوی کو اس کی اطلاع مل گئی اور آپ نے اپنے سفرِ مارھرہ کا پروگرام ملتوی کر دیا۔ کیوں کہ یہ آپ کے مزاج کے خلاف تھا اور اس طرح کی کوئی چیز آپ کو پسند نہ تھی۔

اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا واقعہ بھی اس طرح مذکور ہے:

''ایک مرتبہ نواب رام پور نینی تال جا رہے تھے۔ اسپیشل بریلی شریف پہنچا تو حضرت سید شاہ مہدی میاں صاحب اپنے نام سے ڈیڑھ ہزار کے نوٹ ریاست کے مدارالمھام کی معرفت بطور نذرانہ اسٹیشن سے حضور (امام احمد رضا) کی خدمت میں بھیجتے ہیں۔ اور والی ریاست کی طرف سے متدعی ہوتے ہیں کہ ملاقات کا موقعہ دیا جائے۔

حضور کو مدارالمھام کے آنے کی خبر ہوئی تو اندر سے دروازہ کی چوکھٹ پر کھڑے کھڑے مدارالمھام صاحب سے فرمایا کہ میاں (سید مہدی حسن مارھروی) کو میرا سلام عرض کیجیے اور یہ کہیے گا کہ یہ الٹی نذر کیسی؟ مجھے میاں کی خدمت میں نذر پیش کرنی چاہیے نہ کہ میاں مجھے نذر دیں۔

یہ ڈیڑھ ہزار یا جتنے بھی ہوں لے جائیے۔ فقیر کا مکان نہ اس قابل کہ کسی والی ریاست کو بلا سکوں اور نہ میں والیانِ ریاست کے آداب سے واقف کہ خود جا سکوں۔ (ص ۲۰۹۔ حیات اعلیٰ حضرت جلد اول مطبوعہ رضا اکیڈمی بمبئی۔ وص ۲۷۵۔ مکتبہ نبویہ لاہور)

یہاں ۱۹۲۱ء کے تحریر کردہ آپ کے دو فتاویٰ بطور نمونہ نقل کیے جا رہے ہیں جن سے یہ حقیقت مزید واضح ہو جائے گی کہ اس وقت کے حالات میں آپ کس طرح بلاخوف وخطر و بلاخوفِ لومتہ لائم اپنے شرعی موقف کا اظہار کیا کرتے تھے۔ واضح رہے کہ یہ دونوں فتاویٰ آپ کے انتقال سے صرف چھ ماہ پہلے کے ہیں۔

ایک استفتاء (از محمد حبیب مدرسہ نعمانیہ فراش خانہ دہلی بتاریخ ۲۷رشعبان ۱۳۳۹ھ/مئی ۱۹۲۱ء) دہلی سے آیا کہ کافروں کی خصوصاً انگریزوں کی فوج میں نوکری کرنا جس کی وجہ سے مسلمانوں خصوصاً ترکوں اور عربوں اور افغانوں کے مقابلے میں ان سپاہیوں کو جانا پڑتا ہے اور مسلمانوں کو قتل کرنا پڑتا ہے۔ یہ نوکری جائز ہے یا حرام یا کفر ہے؟

اس کے جواب میں امام احمد رضا بریلوی لکھتے ہیں۔

''مسلمان تو مسلمان بلاوجہِ شرعی کسی کافر، ذمی یامستأمن کے قتل کی نوکری کافر تو کافر کسی مسلمان بادشاہ کے یہاں کی شرعاً حلال نہیں ہوسکتی۔ بلکہ ذمی پر ظلم مسلمان پہ ظلم سے اشد ہے۔کما فی الخانیة و الدّر و الھندیة وغیرھا۔ حدیث میں ہے:

من آذیٰ ذمیاً فانا خصمه و من کنت خصمه خصمته یوم القیٰمة۔ رواہ الخطیب عن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنه عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

مگر کفر نہیں جب تک کہ استحلال نہ ہو یا خود بوجہِ اسلام قتل۔کما ھو مذھب اھلِ السنة و التاویل المشھور فی الکریمة۔ و اللّٰہ تعالیٰ اعلم۔ (ص:۵۹۸/ جلد ۲۳۔فتاویٰ رضویہ مترجم۔رضا فاؤنڈیشن لاہور)

ایک استفتاء (از شیخ فتح محمد معرفت احمد علی پوسٹ ۹۰ بمبئ بتاریخ ۵ر رمضان ۱۳۳۹ھ/مئی ۱۹۲۱ء) بمبئ سے آیا کہ: حج و زیارت کے لئے بمبئ و کراچی میں ایک کمپنی انگریز کی ہے۔ ایک اسلامی کمپنی ہے۔ایسی صورت میں سفر حج و زیارت کس کے ذریعہ کرنا چاہیے؟

اس کے جواب میں امام احمد رضا بریلوی تحریر فرماتے ہیں:

''جب اسلامی کمپنی موجود ہے اور وہ کرایہ بھی کم لیتی ہے اور ایک ہی طرف کا لیتی ہے تو اِن ترجیحوں کے ہوتے ہوئے سخت احمق ہوگا وہ جو اس کے غیر کو اختیار کرے گا مگر اس حالت میں کہ اپنے آرام وغیرہ کی صحیح مصلحت اور ارزاں بعلت وگراں بحکمت نہ ہو۔ بلا وجہ زیادہ

کرایہ دینا کوئی نہ چاہے گا اور بالفرض اگر ایسا کوئی نکلے کہ بغیر کسی صحیح مصلحت کے اپنا نقصان گوارا کرے اور اسلامی کمپنی پر غیر اسلامی کو ترجیح دے تو وہ بیشک مؤاخذہ دار ہے اور اس پر متعدد مؤاخذے ہیں۔ و اللّٰہ تعالیٰ اعلم ۔(ص:٦٠٠۔جلد۲۳۔فتاویٰ رضویہ مترجم۔ رضا فاؤنڈیشن لاہور)

مذہبی احکام و مسائل کے تعلق سے بھی کچھ لوگوں کا عجیب وطیرہ ہے کہ وہ خود کچھ کریں تو عین مطابقِ شریعت اور وہی یا اسی طرح کا کام کوئی دوسرا مسلمان کرے تو خالص بدعت۔اس کا واضح نمونہ دیکھنا ہو تو ذیل میں ذاکر نگر نئی دہلی ۲۵ کا ایک تازہ استفتا اور اس کا جواب ملاحظہ فرمائیں۔کسی نقد و نظر کے بغیر ہم ایک استفتاء کے تین جوابات جو دارالافتاء دارالعلوم دیوبند و مظاہر علوم سہارن پور و دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے جاری ہوئے ہیں انھیں نقل کر رہے ہیں۔ ہمارے باشعور قارئین سوال و جواب اور ان کی روح سے ان شاء اللہ خود بخود بخوبی واقف ہو جائیں گے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کیا فرماتے ہیں علماء ان سوالات کے بارے میں کہ ایک شخص جو طبقۂ اھل حدیث سے تعلق رکھتا ہے وہ اکثر و بیشتر کہتا رہتا ہے کہ:

(۱) تبلیغی جماعت کا وجود چودھویں صدی ہجری میں ہوا اور اس نے چلہ و گشت وغیرہ کا جو طریقہ نکالا اسی طرح اس کے مبلغین جو شہر شہر گاؤں گاؤں پھرتے ہیں۔عوام کے سامنے تقریریں کرتے ہیں۔فضائل و مسائل بیان کرتے ہیں۔تو پہلی خرابی یہ ہے کہ ننانوے فی صد مبلغین اور ان کے امیر غیر عالم ہوتے ہیں۔اور دوسری خرابی یہ ہے کہ ایسے لوگ ضعیف و موضوع روایات سناتے ہیں۔اس کے علاوہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ تبلیغی جماعت کے چلوں میں شریک بعض نوجوان غلط حرکات کرتے ہیں۔غیر قانونی جرائم میں بھی ملوث پائے جاتے ہیں۔وغیرہ وغیرہ۔

ایسی صورت میں یہ تبلیغی جماعت اور اس کی یہ سرگرمیاں جو دین کے نام پر ہوتی ہیں یہ سب

ازقبیل بدعات ہیں اور جو علماء ان کی تائید کرتے ہیں وہ بھی بدعات کے مرتکب ہوتے ہیں۔ آیا اس شخص کی یہ باتیں ازروئے شرع صحیح ہیں یا غلط؟ اگر صحیح ہیں تو قرآن وحدیث وکتب اسلاف سے اسے مدلل کیا جائے اور اگر غلط ہیں تو اسے بھی بالتفصیل مع دلائل واضح کیا جائے۔

(۲) چند سالوں سے مغربی یوپی اور دہلی کے بعض بڑے مدارس ''جشنِ ختم بخاری'' کا اہتمام کرنے لگے ہیں۔ اس کے لئے اشتہار چھاپتے ہیں۔ لوگوں کو زبانی وتحریری دعوتیں دیتے ہیں۔ اس کے لئے ان مدارس میں ہزاروں عوام وخواص کا اجتماع ہوتا ہے۔ یہ باتیں بھی بدعات میں داخل ہیں اور جو علماء ان کے اندر شریک ہوتے ہیں اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں وہ بدعتوں کو فروغ دیتے ہیں اور ان کا یہ عمل خلاف شریعت ہے۔ آیا اس کی یہ بات صحیح ہے یا غلط؟ اگر صحیح ہے تو کس طرح اور غلط ہے تو کیوں؟ دونوں صورتوں کو دلائل کے ساتھ بالتفصیل تحریر کیا جائے۔

بات بحث ومباحثہ سے گذر کر نزاع کی شکل اختیار کرتی جارہی ہے اس لئے گذارش ہے کہ جلد از جلد مذکورہ سوالات کے جوابات عنایت فرمائے جائیں۔ میں آپ کا شکر گذار رہوں گا۔

والسلام

محمد احمد
Hous No.c-312/22
Zaikir Nagar, New Delhi-25

مؤرخہ
۲۳/ رجب ۱۴۲۷ء
۱۹/ اگست ۲۰۰۶ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب ١٠١٣/١٢٤٦

و باللہ العصمة و التوفیق

حامداً ومصلیاً ومسلماً (۱) جو شخص اپنے علم کے اعتبار سے طبقۂ محدثین میں سے نہ ہو بلکہ فرقۂ غیر مقلدین میں اس نے آنکھیں کھولی ہوں یا بعد میں شامل ہوگیا ہو اور وہ اپنے آپ کو اہل حدیث کہتا اور کہلاتا ہو یہ بدعت ودھوکہ دہی ہے۔ ایسے شخص کا قول معتبر نہیں۔

شخص مذکور فی السؤال شخص کیسا اہلِ حدیث ہے؟ اس سے ذرا یہ معلوم کر کے لکھوائیے کہ مولانا صادق سیالکوٹی کی کتاب ''صلوٰۃ الرسول'' کہ جس کے مطابق تم نماز ادا کرتے ہو اس میں

کتنی بے شمار ضعیف احادیث ہیں؟ ان کی نشاندہی تحریراً اس سے کرائیے اس کے بعد ہم ان شاء اللہ اس کو مفصل بتلائیں گے۔

رہا معاملہ تبلیغی جماعت کا سووہ یہ ہے کہ عامۃً وہ مسائل بیان نہیں کرتے بلکہ بیانِ مسائل سے بوجہ مصالحِ کثیرہ جماعت میں نکلنے کے دوران ان کو روکا جاتا ہے اور چند موٹی موٹی دینی باتیں خود عملاً اختیار کرتے ہیں اور اسی کی دعوت دیتے ہیں اسی کی تمرین کرتے ہے۔ عامۃً فضائل اعمال کو پڑھنے اور سننے سنانے کا اہتمام کرتے ہیں اور اس کتاب پر اصولِ فنِ حدیث میں ماہرین اجلّہ علمائے کرام کو پورا اعتماد ہے۔

حضرت مولانا مفتی عبدالکریم صاحب شیخ الحدیث آکولہ مہاراشٹر نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ”تبلیغی نصاب ایک مطالعہ کا مدلّل جواب“ ہے اس کو منگا کر اطمینان سے مطالعہ کیجیے۔ اس میں وقت کے بڑے بڑے علماء ومحدثین کے اعتماد کی بسلسلۂ فضائل اعمال ایک جھلک موجود ہے۔

معلوم نہیں اس بیچارہ نے نوجوانوں میں کون سی غلط حرکات او رغیر قانونی جرائم کا مشاھدہ کیا ہے؟

حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی رحمہٗ اللہ تعالیٰ نے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی ہے ”مولانا محمد الیاس صاحب اوران کی دینی دعوت“ اس کتاب میں تبلیغی جماعت کے سلسلہ میں کام اور دائرۂ کار وغیرہ کا مدلّل تعارف کرایا گیا ہے۔

(۲) بخاری شریف کی تکمیل پر اشتہار چھاپنا کس دلیل سے ثابت ہے کہ یہ اشتہار بدعت ہے؟ کیا اُس شخص کے پاس کوئی صحیح حدیث شریف کہ جس میں اشتہار کو صراحۃً بدعت قرار دیا گیا ہو ہے؟ اگر ہو تو اس سے متنِ حدیث لکھوا کر بھیجیے تب ان شاء اللہ مزید تفصیل کر دی جائے گی۔ فقط۔ واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم۔

حررہٗ

العبد الضعیف احقر محمود حسن بلند شہری غفرلہٗ

دارالعلوم دیوبند

چہارشنبہ۔۵/۸/۱۴۲۷ھ

الجواب صحیح

محمد ظفیر الدین

مہر

دارالافتاء بالجامعۃ الاسلامیہ، دیوبند، الھند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب و باللہ التوفیق۔ ۸۰۶

(۱) نفسِ تبلیغ کا حکم تو کتاب وسنت میں موجود ہے اور ہر زمانہ میں اس پر عمل ہوتا رہا، البتہ ہر زمانہ کے حالات کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص بندوں کے قلوب میں مفید طریقے القاء فرماتے رہے ہیں۔ حضرت نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد حضرات صحابہ درس دینے کے علاوہ عوام مسلمین کو بھی حدیث سناتے تھے۔ پھر ایک وقت آیا کہ احادیث کو لکھا گیا اور کتابی شکل دی گئی۔ جگہ جگہ حدیث سنانے کے حلقے ہوتے تھے۔ پھر ایک وقت آیا کہ مشائخ نے تصوف اور توجہ باطن کے ذریعہ تبلیغ کی۔ علماء نے مدارس قائم کئے۔ واعظین نے وعظ کہے۔ غرض کہ یہ امت کسی وقت بھی مجموعی حیثیت سے نفسِ تبلیغ سے غافل نہیں رہی۔ ہر طریقۂ تبلیغ نہایت مؤثر ومفید ثابت ہوا۔

آج کے دور میں تبلیغی جماعت کا طریقہ اصول کی پابندی کے ساتھ نہایت مفید و مؤثر ہے۔ جس طرح مدارس کے عمل کو نیا طریقہ کہہ کر غلط نہیں کہا جا سکتا۔ مدارس میں گھنٹوں کی پابندی، کتابوں کا مخصوص نصاب، مختلف دفاتر وشعبہ جات کا قیام وغیرہ امور بدعت کے دائرہ میں نہیں آتے۔ اسی طرح چلہ اور گشت وغیرہ کی پابندی بدعت نہیں کہلائے گی۔

کام چوں کہ زیادہ پھیل چکا ہے اس لئے ہر جماعت کو عالم میسر نہیں آ سکتا۔ اس مجبوری کی وجہ سے جماعت ہی میں سے کسی کو امیر بنادیا جاتا ہے۔ پھر جماعتوں کو مقید کیا جاتا ہے کہ وہ چھ نمبروں سے زائد بات نہ کہیں۔ اگر کچھ کہنا ہے تو زبانی نہ کہیں بلکہ کتاب سنادیں پھر جو اس میں زیادہ محنت کرتا ہے حق تعالیٰ کی طرف سے اس کو کچھ ملتا بھی ہے۔ چنانچہ بعض ایسے ہوتے ہیں جو جماعت میں کام کرنے اور اصول کی پابندی کی وجہ سے گھنٹوں تقریر کر لیتے ہیں اور ان کی تقریر صحیح ہوتی ہے مگر ایسے لوگ کم ہیں۔

ضعیف حدیث فضائل میں معتبر ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص موضوع روایت بیان کرے تو وہ غلطی پر ہے۔ جماعت کے اصول کی مخالفت کرنے والا ہے۔ اور اپنے اِس عمل کا وہ خود ذمہ دار

ہے نہ کہ جماعت۔

(۲) دعاء میں شرکت کے لئے کچھ لوگ آجائیں تو اس کی گنجائش ہے۔لیکن اس میں مبالغہ کرنا اشتہار چھاپنا اور دعوتیں دینا مناسب نہیں۔اسی میں مفاسد آجاتے ہیں۔فقط۔واللہ اعلم۔

حررہٗ

العبد محمد طاہر عفا اللہ عنہ

مظاہر علوم سہارن پور

۱۴۲۷/۸/۲۴ھ

الجواب صحیح۔مقصود علی۔۱۴۲۷/۸/۲۴ھ

مہر

دارالافتاء مدرسہ مظاہر علوم، سہارن پور

تبلیغی جماعت سے متعلق

هو المصوب

۲۴۶۱۶
۱۸۹۰۰

ا۔تبلیغی جماعت کے ذریعہ آج پوری دنیا میں مسلمانوں کو اسلام اور تعلیماتِ نبوی سے قریب کیا جارہاہے۔ اور اس دوڑ بھاگ،ھویٰ و ہوس کے پُرفتن دور میں دین اسلام سے مسلمانوں کا رشتہ مضبوط و مستحکم کرنے کی کوشش کی جارہی ہےاور اس جماعت کے بڑےفوائد بھی سامنے آرہے ہیں۔اور جو کام صحابہٗ کرام، ان کے بعد سلف صالحین کرتے آرہے ہیں،نماز، روزہ، ذکر، اخلاصِ نیت،عقیدہ وفکر کی درستگی وغیرہ۔یہی باتیں تبلیغی جماعت والے بھی اپنے انداز واسلوب میں بتاتے ہیں۔

جہاں تک بعض کمیوں اور خرابیوں کا تعلق ہےتو اس سے کہیں زیادہ خیر کا پہلو غالب ہے۔

تبلیغ اور وعظ درحقیقت دو الگ کام ہیں۔وعظ صرف علماء ہی کرسکتے ہیں جب کہ تبلیغ کا کام جاہل اور معمولی علم والے بھی کرسکتے ہیں،لیکن ان کو بھی حد درجہ احتیاط برتنا چاہیے کہ مبادا اگر ان کی تبلیغ کے ذریعہ کوئی غلط راہ پر چل پڑے،یا دین میں کوئی فتنہ یا اختلاف کی صورت پیدا ہو جائے تو اس کا وبال اس کے سر تو آئے گا ہی مزید دوسرے لوگ بھی اس سے متاثر ہوں گے۔

جہاں تک ضعیف روایات کی بات ہے یہ فضائل میں تو ٹھیک ہے مگر مسائل میں درست نہیں، اور موضوع تو تمام علماء کے نزدیک مردود ہے۔

تبلیغی جماعت کے نوجوان اگر غیر مناسب حرکت کرتے ہیں تو یہ ان کا ذاتی عمل ہے۔ بعض بد باطن اس جماعت کو بدنام کرنے کے لئے بظاہر جماعت کا روپ دھارتے ہیں۔ حالاں کہ وہ اس جماعت کے بلکہ اسلام کے دشمن ہوتے ہیں۔ وہ ایسی نامناسب حرکت کرتے ہیں تاکہ جماعت کو نقصان لاحق ہو۔ نفس جماعت پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی ایک لمحہ میں دین اور اسلامی تعلیمات کی طرف راغب ہوجاتا ہے، اور کبھی مہینوں اور سالوں کا بھی عرصہ لگ جاتا ہے۔

۲۔ علوم اسلامیہ کی بڑی اور اہم کتابوں کے آغاز و اختتام پر کسی اہم شخصیت کو مدعو کر کے ان سے کتاب کا آغاز و اختتام، حسن آغاز و اختتام اور برکت پر محمول کیا جاتا ہے، مگر نہ یہ عمل مطلوب ہے اور نہ ہی لازم، جب جب موقع مل گیا عمل کرلیا گیا، خصوصاً حدیث کی عظیم کتاب بخاری شریف بڑی اہم کتاب ہے، اس کے اختتام پر حضور ﷺ کی نسبتِ مبارکہ سے خوشی کا اظہار درست ہے، مگر اس کے لئے غیر معمولی تگ و دو کرنا، دعوت نامے اور لفافے تقسیم کرنا، مرد و خواتین کا شریک ہونا غیر ضروری عمل ہے، ہاں یہ الگ بات ہے کہ مستقل کوئی دینی اور اصلاحی جلسہ ہورہا ہے، اور تعداد بھی اچھی ہو تو اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عوام الناس کو حدیث نبوی کا پیغام دیتے ہوئے ختم بخاری شریف ہوجائے تو کوئی حرج نہیں لیکن بالقصد ختم بخاری کے لئے جشن منعقد کرنا اور مختلف طریقے اپنانا بھی مناسب نہیں ہے۔ پھر یہ بھی بدعت ہی کہی جائے گی۔

مسعود حسن حسنی، دارالافتا ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۴۲۷/۸/۱۶ھ

جواب صحیح ہے۔ ناصر علی، دارالافتاء ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۴۲۷/۸/۱۶ھ

مہر

دارالفتاویٰ والاحکام لندوۃ العلماء لکناؤ۔ الھند

مفتی و مجیب و مصدق حضرات کے پیشوا اور دیوبندی قطب الاقطاب و امام ربانی مولانا

رشید احمد گنگوہی بھی ختم بخاری شریف کے سلسلے میں اسی طرح کا فتویٰ صادر کر چکے ہیں۔ ذیل میں سوال و جواب دونوں ملاحظہ فرمائیں:

سوال:— کسی مصیبت کے وقت بخاری شریف کا ختم کرانا قرونِ ثلثہ سے ثابت ہے یا نہیں؟ اور بدعت ہے یا نہیں؟

جواب:— قرونِ ثلثہ میں بخاری شریف تالیف نہیں ہوئی تھی مگر اس کا ختم درست ہے کہ ذکر خیر کے بعد دعا قبول ہوتی ہے۔ اس کی اصل شرع سے ثابت ہے۔ بدعت نہیں۔ فقط۔ رشید احمد گنگوہی

(ص: ۱۰۲۔ فتاویٰ رشیدیہ کامل)

مذکورہ فتاویٰ میں ہیئت مروجہ کے ساتھ تبلیغی جماعت اور ختم بخاری شریف کے جواز کے تعلق سے جو باتیں کہی گئی ہیں وہی باتیں ایسی محفل میلاد النبی ﷺ جو بدونِ قیام بروایاتِ صحیحہ خالی از منکرات ہو اس کے بارے میں سوال ہوتا ہے تو بدعت بدعت کی رٹ لگائی جاتی ہے۔ دیکھیے فتاویٰ رشیدیہ و تذکرۃ الرشید و کتبِ فتاویٰ از علماے دیو بند—

"محفل میلاد جس میں روایات صحیحہ پڑھی جاویں اور لاف و گزاف اور روایات موضوعہ اور کاذبہ نہ ہوں، شریک ہونا کیسا ہے؟

جواب:— ناجائز ہے بسبب اور وجوہ کے۔ فقط۔ (ص ۱۴۸۔ فتاویٰ رشیدیہ از مولانا رشید احمد گنگوہی)

"عقد مجلس مولود اگر چہ اس میں کوئی امر غیر مشروع نہ ہو مگر اہتمام و تداعی اس میں موجود ہے لہٰذا اس زمانہ میں درست نہیں۔ (ص ۸۵ فتاویٰ رشیدیہ)

"انعقاد مجلس میلاد بدون قیام بروایت صحیح درست ہے یا نہیں؟

جواب:— انعقاد مجلس مولود ہر حال ناجائز ہے۔ تداعی امر مندوب کے واسطے منع ہے۔ (فتاویٰ رشیدیہ)

کیا ایک عام آدمی بھی اس بات کو بآسانی نہیں سمجھ سکتا کہ جو کام وہ خود کریں اس کے لئے اصل اور نفس ہر چیز ان کے پیش نظر ہے اس لئے جائز ہے اور جسے ان کے سوا دوسرے سنی مسلمان کریں وہ ناجائز ہے۔ اس موقعہ پر انھیں نہ فضیلت و عظمتِ رسول کا خیال آتا ہے نہ ذکر و رفعتِ

رسول کی طرف ان کا ذہن منتقل ہوتا ہے۔کیا اس طرز فکر وعمل سے سیاست کے ساتھ مذہب میں بھی ایسے علما کے دوہرے کردار اور دوہری پالیسی روز روشن کی طرح واضح نہیں ہو جاتی ہے؟

یہاں ہم ایک بار پھر عرض کریں گے کہ اہل علم ودانش، اصحابِ تحقیق اور ارباب فکر بالخصوص کسی مسلمان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ محض سنی سنائی باتوں پر اعتماد کرے اور حقائق کو نظر انداز کرتا جائے۔اسی طرح کسی مسئلہ میں اگر اپنی مزعومہ رائے کے خلاف کوئی دلیل وثبوت وشہادت اسے مل جائے تو بھی اپنی رائے تبدیل کرنے میں تکلف اور انا پرستی سے کام لیتا رہے۔

یہ سمجھ لینا اور بطور خود یہ طے کر لینا کہ فلاں شخص ایسا ہی ہے۔فلاں عالم میں یہ خرابی ہے۔ فلاں خیال ونظریہ ہی صحیح ہے وغیرہ وغیرہ۔اور پھر اسی بنیاد پر کوئی عمارت تعمیر کر لینا خواہ حقائق اس کے کتنے ہی بر خلاف کیوں نہ ہوں اس سے محققین اور دانشور حضرات کو خصوصاً اس لئے بھی سخت پرہیز کرنا چاہیے کہ ان کے افکار وآرا کا عوام پر اچھا خاصا اثر ہوتا ہے۔

ہندوستانی سیاست میں علماے دیوبند کے سرگرم کردار کی جہاں تک بات ہے اس سلسلے میں اپنی رائے یہاں واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین (شیخ الھند) مولانا محمود حسن (وفات ۱۸/ربیع الاول ۱۳۳۹ھ/ ۳۰/نومبر ۱۹۲۰ء) کی طرف منسوب ریشمی رومال تحریک ایک قابل ذکر اور اہم انگریز مخالف تحریک ہوسکتی ہے مگر اس کی صحت بھی شکوک وشبہات کے دائرے میں ہے۔ بلکہ ایک غیر مقلد عالم حافظ صلاح الدین یوسف کسی طرح اس کا وجود ماننے کو تیار نہیں۔ایک عرض داشت از علماے دارالعلوم دیوبند بخدمت ہز آنر جیمس مسٹن لفٹننٹ گورنر صوبہ متحدہ آگرہ واودھ بمقام میرٹھ مورخہ ۱۸/محرم ۱۳۳۶ھ مطابق ۶/نومبر ۱۹۱۷ء (منقول از الرشید دیوبند، رجب ۱۳۳۶ھ/ ۱۹۱۸ء) پر تبصرہ کرتے ہوئے موصوف لکھتے ہیں:

”علماے دیوبند کی اس متفقہ عرض داشت سے مندرجہ امور واضح ہیں کہ:

☆ مولانا محمود حسن (شیخ الھند) کے متعلق جو باور کرایا جاتا ہے کہ انھوں تحریک ریشمی رومال کے ذریعہ انگریزی حکومت کے خلاف جدوجہد کی تھی، یہ خلاف واقعہ ہے۔انھوں نے انگریز کے خلاف کسی تحریک میں حصہ نہیں لیا۔

☆ مولانا محمود حسن کی گرفتاری محض شبہات کا نتیجہ تھی۔

☆ مولانا محمود حسن سمیت تمام جماعتِ دیوبند سیاسی الجھنوں سے الگ تھلگ اور وطن پرستی یا قوم پرستی سے (جس کے باعث انسان بالعموم سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتا ہے) پاک رہی۔

☆ دیوبندی جماعت ایک بالکل خاموش اور سیاسیات سے محض بے نیاز جماعت ہے۔

☆ یہ عرض داشت ۱۹۱۷ء کی ہے۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ کم از کم ۱۹۱۷ء سے پہلے علمائے دیوبند کے متفقہ اعتراف کے مطابق علمائے دیوبند کا تحریک جہاد یا تحریک استخلاصِ وطن یا کسی بھی سیاسی سرگرمی میں حصہ لینے کا ثبوت نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص ایسا دعویٰ کرتا ہے اور ان کو سیاسی سرگرمیوں میں شریک گردانتا ہے تو اس کا دعویٰ غلط ہے۔

☆ اس متفقہ عرض داشت سے ہمارے اس موقف کی تائید ہوتی ہے کہ علمائے دیوبند کو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ہیرو ثابت کرنا یا ان کو تحریک جہاد کا قائد باور کرانا سراسر تاریخ سازی ہے۔ (ص:۱۱۲۔۱۱۳۔ تحریک جہاد! جماعت اہل حدیث اور علمائے احناف از حافظ صلاح الدین یوسف۔ مطبوعہ دارالکتب الاسلامیہ ٹمیا محل دہلی ۶۔ مارچ ۲۰۰۰ء)

''تحریک ریشمی رومال'' کے عنوان سے حافظ صلاح الدین یوسف (غیر مقلد عالم) نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

انڈیا آفس لائبریری لندن کی دستاویزات ومواد کتاب ''تحریک شیخ الھند'' میں جمع کر دیا گیا ہے جس کے مطابق اس کے بانی مولانا عبیداللہ سندھی ومولانا ابوالکلام آزاد ہیں اور مولانا محمود حسن ان سے متاثر اور آلۂ کار (ص:۱۸۔ تحریک شیخ الھند۔ مکتبہ رشیدیہ لاہور) اس تحریک کے زمانے میں مہتمم صاحبان نے حکومت کے ذمہ داروں سے تعلق رکھا حتی کہ گورنر یوپی کو دارالعلوم دیوبند میں مدعو کیا۔ اس کو ایڈریس بھی پیش کیا۔ اور اس تعلق کا نتیجہ تھا کہ حافظ صاحب (حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند) کو شمس العلماء کا خطاب دیا گیا۔ (ص:۱۰۸۔ ۱۶۰۔ تحریک شیخ الھند) مالکانِ مدرسہ سرکار کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ نمائش کے دربار

میں بھی شرکت کا فخر حاصل ہونے لگا۔ (ص:۳۵۸۔۴۴۰۔تحریک شیخ الھند) اہل مدرسہ دیوبند سیاست سے لاتعلق تھے۔عبیداللہ سندھی نے انھیں ورغلانا شروع کیا جس پر اس کی سرزنش ہوئی۔ (ص:۲۶۲۔تحریک شیخ الھند) اسی وجہ سے دیوبند سے مولانا سندھی کا اخراج ہوا۔ یہ تحریک اسلامی حکومت نہیں بلکہ قومی حکومت قائم کرنے کے لئے تھی۔اس تحریک میں کئی وہابی علماء شامل تھے۔

''اسیر مالٹا'' میں مولانا حسین احمد مدنی نے اور ''حیات شیخ الھند'' میں مولانا سید اصغر حسین نے حجاز میں مولانا محمود حسن کی گرفتاری کو بدظنی وغلط فہمی کا ایک واقعہ قرار دیا ہے—

''بہر حال! شیخ الھند کے یہ دونوں اولین اور مستند سوانح نگار اس امر پر متفق ہیں کہ ان کی گرفتاری انگریز کے خلاف کسی تحریک کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ غلط افواہوں، افتراپردازیوں اور حجاز میں پیش آمدہ مذکورہ فتوائے تکفیر سے انکار اور دیگر مشتبہ امور کا شاخسانہ تھا'' (ص:۱۲۱ تحریک جہاد از حافظ صلاح الدین یوسف مطبوعہ دہلی ۶)— ''جس تحریک ریشمی رومال کا پروپگنڈہ کیا جاتا ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔'' (ص:۱۲۵۔حوالۂ مذکورہ)

مولانا محمود حسن دیوبندی کی قائم کردہ تنظیم جمیعۃ الانصار (در۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۹ء) کا پہلا اجلاس ۱۹۱۱ء میں مرادآباد میں ہوا۔اس تنظیم کی ایک منظور شدہ دفعہ یہ ہے—

''ایسے چھوٹے رسائل بکثرت مفت شائع کرنا جن میں عقائد اسلام کی تعلیم ،فرقۂ آریہ کے جوابات اور وفاداریِ گورنمنٹ کی ہدایات ہوں''۔ (ص:۱۷۳۔تذکرۂ شیخ الھند از مفتی عزیز الرحمٰن۔مدنی دارالتالیف بجنور)

ان سب کے باوجود اگر تحریک ریشمی رومال کو مان بھی لیا جائے کہ مولانا عبیداللہ سندھی وغیرہ کے بیانات صحیح ہیں تب بھی قابل غور پہلو یہ ہے کہ ۱۹۱۵ء کے آس پاس یہ تحریک شروع ہوئی اور دوسری بات یہ ہے کہ مولانا محمود حسن دیوبندی (متوفی نومبر ۱۹۲۰ء) مع مولانا عبیداللہ سندھی (وفات اگست ۱۹۴۴ء) کی یہ ایسی ایک خفیہ کوشش ہے جس میں صرف چند مخصوص راز دار شریک ہیں۔علمائے دیوبند کی جماعت وجمعیت سے اس کا کوئی تعلق بلکہ اس کا انھیں اس وقت کوئی علم بھی نہیں تھا۔ بلکہ حافظ محمد احمد مہتمم دارالعلوم دیوبند جو مولانا محمد قاسم نانوتوی (متوفی ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء) کے فرزند اور قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند (متوفی ۱۹۸۳ء) کے والد تھے ان کی

انگریز نوازی تاریخ دیوبند کا ایک ایسا باب ہے جس سے اس موضوع کے سبھی محققین و مؤرخین اچھی طرح واقف ہیں۔ دارالعلوم دیوبند سے مولانا عبیداللہ سندھی کی وجہ اخراج بھی سیاسی چپقلش ہی تھی۔ چنانچہ:

''بعض مسائل دینیہ مختلفہ فیہا کو درمیان میں رکھا گیا اور مولانا سندھی سے دو بلند پایہ معاصرین کو بدظن کر کے تضلیل و تکفیر پر آمادہ کیا گیا۔ اور اسی اختلاف کی بنیاد پر مولانا سندھی کو دارالعلوم سے الگ کیا گیا۔ ان میں سے ایک بزرگ کو بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہوا چنانچہ انھوں نے مولانا سندھی سے معافی مانگی۔ بہرحال! اصلی سبب وہ امر ہے جس کی بنا پر مسٹر مسٹن گورنر یوپی دیوبند اور دارالعلوم گیا تھا اور مہتمم صاحب کو ''شمس العلماء'' کا خطاب ملا تھا۔ (حاشیہ ص: ۲۹۹۔ حصہ دوم۔ نقش حیات از مولانا حسین احمد مدنی۔ مکتبہ دینیہ دیوبند ۱۹۹۹ء)

حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی لکھنوی (وصال رجب ۱۳۴۴ھ/جنوری ۱۹۲۶ء) نے ۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت شرع کی اور ان کے عقیدت مند مرید مولانا محمد علی جوہر وغیرہ کی جذباتی قیادت نے ہندوستان بھر میں جوش و خروش کا ماحول پیدا کر دیا۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر پنجاب کی خلافت کانفرنس کی ایک تجویز کے مطابق ۱۹۲۰ء میں دہلی کے اندر اجلاس ہوا جس میں جمعیۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۲۰ء ہی میں تحریک ترک موالات بھی شروع ہوئی۔ تحریک خلافت اور جمعیۃ العلماء کی بنیاد خالص مذہبی تھی لیکن ان دونوں کی سیاسی قیادت کانگریس کر رہی تھی جس کی راہ تحریک ترکِ موالات نے ہموار کی تھی۔ ۱۹۱۷ء میں گاندھی عدم تشدد (اہنسا) کا نظریہ ہندوستانیوں کے سامنے پیش کر چکے تھے۔ جنگ عظیم اول (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) میں انگریز اپنی سیاسی و عالمی صورت حال کی مجبوری کے تحت ہندوستانیوں سے وعدہ کر چکے تھے کہ اگر ہندوستانی فوجی مختلف جنگی محاذوں پر برطانوی فوج کے شانہ بہ شانہ لڑیں گے تو ہندوستان کو خود مختاری دے دی جائے گی لیکن حالات قابو میں آنے کے بعد انگریز حسب عادت و معمول ٹال مٹول کرنے لگے جس کی وجہ سے انگریزوں سے ہندوستانیوں کو سخت ناراضی پیدا ہوئی اور ان کے خلاف مہم چھیڑ کر آزادی ہند کی تحریک چلانے پر ہندوستانیوں کی ذہنی آمادگی ہوئی۔ پھر بڑی دانائی و حکمتِ عملی کے ساتھ گاندھی نے اس وقت کی سرگرم مسلم قیادت کو متاثر و مسخر کر لیا اور تحریک خلافت و ترک

موالات و جمعیۃ العلماء کے پلیٹ فارم سے اس وقت کی جو سیاسی پالیسیاں مسلم قائدین نے بنائیں ان پر گاندھی کا قائدانہ رنگ پورے طور پر حاوی اور غالب تھا۔ مسلمانوں کے اندر پیدا ہونے والے برطانیہ مخالف جذبات کا رخ ہر طرف سے موڑ کر تحریکِ آزادیٔ ہند کی طرف گامزن کر دیا گیا۔

ان حالات میں جمعیۃ العلماء کے پلیٹ فارم سے علمائے دیوبند نے کھل کر کانگریس اور گاندھی کی حمایت کی۔ اور تحریک آزادی ہند میں بھرپور حصہ لیا۔ (شیخ الھند) مولانا محمود حسن دیوبندی، مفتی کفایت اللہ شاہجہاں پوری ثم دہلوی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا سید محمد میاں، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی وغیرہ کے نام اس سلسلے میں نہایت نمایاں ہیں۔

علمائے دیوبند کے مذکورہ سیاسی کردار سے کسی کو انکار نہیں۔ مگر تشویش و اضطراب اور تأمل و انکار کا مرحلہ اس وقت آتا ہے جب حقیقی تاریخ کو فرضی و اختراعی تاریخ نویسی کے ذریعہ مستور اور مسخ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جو ہوا اسے چھپانے اور جو نہیں ہوا اسے باور کرانے کی تدبیر کی جاتی ہے۔ اور زیب داستاں کے شوق میں اصل داستان کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا جاتا ہے۔

افکار و نظریات، واقعات و حالات اور رجال و شخصیات کو ان کی اصل شکل میں پیش کرنے کی بجائے اپنے رجحانات و خیالات کے آئینے میں انھیں دیکھنے اور قوم و ملت کے سامنے انھیں اپنی پسندیدہ شکل میں پیش کرنے کی روایت بعض عناصر نے ایک مدت سے قائم کر رکھی ہے۔ جس کی تفصیل کا یہاں موقعہ اور گنجائش نہیں ورنہ ہم ایسے کئی ایک الحاقات و تحریفات کی مثالیں قدیم و جدید کتب و رسائل کے حوالے سے پیش کر سکتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (وصال ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) کی فکر اور شخصیت کو مذہبی و نظریاتی طور پر مجروح کرنے کی مذموم کوشش بہت پہلے ہو چکی ہے۔ چنانچہ حکیم سید محمود احمد برکاتی ٹونکی (مقیم کراچی) نبیرۂ حکیم سید برکات احمد ٹونکی شاگرد مولانا عبد الحق خیرآبادی فرزند علامہ فضل حق خیرآبادی اسی طرح کے الحاق و تحریف و تلبیس کا پردہ چاک کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

"کسی بھی شخصیت سے اعتنا اور اس کے افکار و آرا کے جائزے کے سلسلے میں صحیح اور دیانت

دارانہ طرزِ فکر وعمل یہ ہے کہ ہم یہ تحقیق کریں کہ اس کے افکار وآرا کیا ہیں؟ نہ یہ کہ کیا ہونے چاہئیں؟ اور تحقیق وتلاش کے بعد ان افکار وآرا کو ہی تسلیم کر کے یہ فیصلہ دیں کہ ان کو رد کریں یا قبول؟ اور اس شخصیت کو پسند کریں یا ناپسند؟

یہ طرز فکر وعمل صحیح نہیں ہے کہ پہلے ہم یہ طے کریں کہ صحیح نظریہ یا مسلک یہ ہے لہذا اس شخص کا بھی یہی نظریہ اور مسلک ہونا چاہیے۔ اور اس کے منہ میں اپنے الفاظ کو ڈال دیں۔ اس کی تحریروں میں الحاقات کے ذریعہ اپنے پسندیدہ نظریات شامل کر دیں۔ یا مستقل رسائل وکتب تصنیف کر کے اس کی طرف ان کا انتساب کر کے اسے اپنے پسندیدہ مسلک سے مشرف کر دیں۔

شاہ (ولی اللہ محدث دہلوی) صاحب کے ساتھ تو ابتدا ہی سے یہ معاملہ روا رکھا گیا ہے۔ ان کی کئی کتابوں (تاویل الاحادیث، ہمعات، عقد الجید وغیرہ) میں حذف والحاق کیا گیا۔ اس کے علاوہ ان کی طرف برسبیلِ غلط مستقل چھ کتابیں منسوب کر دی گئیں۔ (ص:۳۳۔ القول الجلی کی بازیافت۔ مطبوعہ لاہور ۱۴۱۱ھ/ ۱۹۹۱ء از حکیم محمود احمد برکاتی)

''شاہ صاحب کی مصنفات کو نایاب کر کے دوسرا قدم یہ اٹھایا گیا کہ اپنی مصنفات کو شاہ صاحب کی طرف منسوب کر دیا گیا اور اپنے نظریات کی تبلیغ شاہ صاحب کے نام سے کی گئی۔ مثلاً

(۱) البلاغ المبین:— پہلی بار ۱۳۰۷ھ میں مطبع محمدی لاہور سے ایک اہل حدیث عالم مولانا فقیر اللہ نے شایع کی۔

(۲) تحفۃ الموٗحدین:— سب سے پہلے ایک اہل حدیث بزرگ حاجی عبدالغفار دہلوی نے شایع کی۔

(۳) قولِ سدید:— کے نام سے بھی ایک رسالہ شایع ہوا جس میں عدم تقلید کی تلقین وتائید کی گئی۔

ظاہر ہے کہ یہ بھی اہل حدیث حضرات نے شایع کیا ہوگا۔

(ص ۵۹۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان از حکیم محمود احمد برکاتی۔ مجلس اشاعت اسلام لاہور)

کچھ ایسا ہی معاملہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (وصال ۱۳۱۷ھ/ ۱۸۹۹ء) اور پایۂ حرمین حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی (وصال ۱۳۰۸ھ/ ۱۸۹۰ء) کا بھی ہے۔ یہ دونوں بزرگ

۱۸۵۷ء کے انقلاب اور انگریزی حکومت کی طرف سے علما و مشائخ کی دار و گیر سے بچنے کے لئے مکہ مکرمہ ہجرت کر گئے اور وہیں ان کا انتقال بھی ہوا۔ جنت المعلیٰ مکہ مکرمہ میں دونوں حضرات مدفون ہیں۔ ان دونوں حضرات کو بھی اب تک اس انداز سے پیش کیا جاتا رہا ہے کہ جیسے ان کی سرپرستی و حمایت ہر مرحلہ اور ہر مسئلہ میں علمائے دیوبند کو مکمل حاصل رہی ہے۔ جب کہ خود ان کی تحریریں واضح طور پر اس حقیقت کا اعلان کر رہی ہیں کہ ان کے مسلک و معمول اور طرز و طریقہ سے علمائے دیوبند دور ہٹے ہوئے ہیں۔ یقین نہ آئے تو ''تقدیس الوکیل عن توہین الرشید والخلیل'' مطبوعہ لاہور وانوار ساطعہ طبع دوم ۱۳۰۷ھ پر مولانا کیرانوی کی تقریظ و تصدیق اور حاجی امداد اللہ صاحب کی لکھی ہوئی کتاب ''فیصلۂ ہفت مسئلہ'' وغیرہ کا مطالعہ کر لیں۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی صاحب کے تعلق سے چند حقائق حاضر خدمت ہیں۔

امداد المشتاق میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نے اپنے خلفا کے بارے میں فرمایا:

''میرے خلفا دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جنھیں میں نے از خود خلافت دی ہے۔ دوسرے وہ جن کو تبلیغ دین کے لئے ان کی درخواست پر اجازت دی ہے۔

جن خلفا کو از خود خلافت دی ہے انھوں نے پوری طرح حاجی صاحب کی اتباع کی۔ مثلاً مولوی لطف اللہ علی گڑھی (متوفی ۱۳۳۴ھ) مولوی احمد حسن کان پوری (م ۱۳۲۲ھ) مولوی محمد حسین الہ آبادی (م ۱۳۲۲ھ) اور مولوی عبد السمیع رام پوری (م ۱۳۱۸ھ)۔

جن خلفا نے حاجی صاحب سے اختلاف کیا ان میں مولوی محمد قاسم نانوتوی (م ۱۲۹۷ھ) مولوی رشید احمد گنگوہی (م ۱۳۲۲ھ) اور مولوی اشرف علی تھانوی (۱۳۶۲ھ) کے اسمائے گرامی سرِ فہرست ہیں۔ (ص ۴۶۔ صابری سلسلہ از وحید احمد مسعود۔ بدایوں ۱۹۷۱ء)

اپنے خلفا کے درمیان مسلکی اختلاف کی اطلاع پا کر ان کے تصفیہ کے لئے حاجی صاحب نے فیصلۂ ہفت مسئلہ کے نام سے ایک مختصر سی کتاب لکھی جو (۱) مولود شریف (۲) فاتحہ (۳) عرس و سماع (۴) ندائے غیر اللہ (۵) جماعت ثانیہ (۶) امکان نظیر (۷) امکانِ کذب کے مسائل میں اِثباتِ مسلک اہل سنت پر مشتمل ہے۔ اس فیصلۂ ہفت مسئلہ کے ساتھ یہ سلوک

ہوا کہ اسے نذر آتش کرادیا گیا۔ اس وقت تک مولانا اشرف علی تھانوی حضرت حاجی صاحب کے مسلک سے کچھ قریب تھے مگر بعد میں انھوں نے بھی انحراف کیا۔ اور مولانا رشید احمد گنگوہی شروع ہی سے اپنے پیرو مرشد کے مسلک و معمول کے برعکس خیالات رکھتے تھے۔ اب نذر آتش کرنے کا حادثہ خواجہ حسن ثانی نظامی (درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء نئی دہلی) کی زبانی سنیے۔

''نذر آتش کرنے کی یہ خدمت والدی حضرت خواجہ حسن نظامی کے سپرد ہوئی جو اس وقت گنگوہ میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے یہاں زیر تعلیم تھے۔ لیکن خواجہ صاحب نے جلانے سے پہلے اس کو پڑھا اور جب ان کو وہ کتاب اچھی معلوم ہوئی تو انھوں نے استاد کے حکم کی تعمیل میں آدھی کتابیں تو جلا دیں اور آدھی بچا کر رکھ لیں۔

اس کے کچھ عرصہ بعد مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا گنگوہی سے ملنے آئے اور ان سے پوچھا کہ میں نے کچھ کتابیں تقسیم کرنے کے لئے آپ کے پاس بھیجی تھیں، ان کا کیا ہوا؟ مولانا گنگوہی نے اس کا جواب ''خاموشی'' سے دیا۔

لیکن کسی حاضر الوقت نے کہا کہ علی حسن (خواجہ حسن نظامی) کو حکم ہوا تھا کہ انھیں جلا دو۔ مولانا تھانوی نے میاں علی حسن سے پوچھا کہ کیا واقعی تم نے کتابیں جلا دیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ استاد کا حکم ماننا ضروری تھا اس لئے میں نے آدھی کتابیں تو جلا دیں اور آدھی میرے پاس محفوظ ہیں۔

حضرت خواجہ صاحب بیان کرتے تھے کہ مولانا تھانوی اس سے اتنے خوش ہوئے کہ آم کھا رہے تھے فوراً دو آم اٹھا کر مجھے انعام میں دیے۔ (ص ۲۲۔ جلد ۳۹۔ شمارہ ۱۲۔ ماہنامہ منادی دہلی)

حضرت حاجی صاحب نے اپنے خلیفہ حضرت صوفی محمد حسین الہ آبادی کے نام ۱۳۱۲ھ/ ۱۸۹۴ء میں مکہ مکرمہ سے ایک خط لکھ کر معلوم کیا کہ ہماری تحریر سے اختلاف کا کچھ تصفیہ ہوا یا نہیں؟ تو آپ نے تحقیقِ حال کر کے حاجی صاحب کو لکھا کہ علمائے دیوبند نے آپ کی تحریر کو نگاہِ غلط انداز سے بھی نہ دیکھا بلکہ فیصلۂ ہفت مسئلہ کو نذر آتش کرا دیا۔ (ص: ۷۴۔ صابری سلسلہ)

ساتھ ہی جرأت و جسارت اور اپنے شیخ کے مقابلے میں سینہ زوری ایسی تھی کہ بقول مولانا

رشید احمد گنگوہی:

''جس فن کے امام حاجی صاحب ہیں ہم ان کے مقلد ہیں۔ باقی فرعیات کے امام ہم ہیں۔ حاجی صاحب کو چاہیے کہ ہم سے پوچھ کر عمل کریں۔''

اور مولوی قاسم نانوتوی نے فرمایا کہ ہماری معلومات زائد اور حاجی صاحب کا علم زائد ہے۔

اور مولوی اشرف علی تھانوی نے تو اس اختلاف کو جائز قرار دینے کے لئے اپنی ساری قابلیت صرف کردی۔ مگر ساتھ ہی از راہِ انصاف یہ بھی تحریر فرمایا کہ بقول شخصے۔ ''تا نباشد چیز کے مردم نگویند چیزہا'' — (ص:۴۹۔ صابری سلسلہ)

فقیہ اسلام امام احمد رضا بریلوی کے خلاف جاری الزام تراشی و بہتان طرازی اور پروپیگنڈہ مہم کے باوجود ہر دور کے مشاہیر نے آپ کے علم وفضل کا اعتراف بھی کیا ہے جس کے چند نمونے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

مولانا سید سلیمان اشرف صدر شعبہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (متوفی ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۹ء) کی ایک محفل کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عابد احمد علی مہتمم بیت القرآن لاہور و سابق لیکچرر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا یہ تحریری بیان ہے:

''غالباً ۱۹۳۳ء کا واقعہ ہے کہ علامہ اقبال مسلم یونیورسٹی میں موجود تھے۔ ایک محفل جس میں میں بھی تھا، دورانِ گفتگو مولانا احمد رضا بریلوی کا تذکرہ آ گیا۔ علامہ مرحوم نے مولانا بریلوی کو خراجِ عقیدت وتحسین پیش کرتے ہوئے کہا۔

ہندوستان کے دور آخر میں ان جیسا طباع و ذہین فقیہ پیدا نہیں ہوا۔ میں نے ان کے فتاویٰ کے مطالعہ سے یہ رائے قائم کی ہے۔ اور ان کے فتاویٰ ان کی ذہانت، فطانت، جودتِ طبع، کمالِ فقاہت اور علوم دینیہ میں تبحر علمی

کے شاہد عدل ہیں۔

مولانا ایک دفعہ جو رائے قائم کر لیتے تھے اس پر مضبوطی سے قایم رہتے تھے۔ یقیناً وہ اپنی رائے کا اظہار بہت غور و فکر کے بعد کرتے تھے لہذا انہیں اپنے شرعی فیصلوں اور فتاویٰ میں کبھی کسی تبدیلی یا رجوع کی ضرورت نہیں پڑی۔" عابد احمد علی۔ یکم اگست ۱۹۶۸ء۔ (اس پورے تحریری بیان کی فوٹو کاپی ہفت روزہ افق کراچی نے اپنے شمارہ ۲۲ر تا ۲۸ر جنوری ۱۹۷۹ء میں شایع کر دیا ہے)

ڈاکٹر سر ضیاء الدین وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۷ء کے درمیانی عرصہ میں مولانا سید سلیمان اشرف (علی گڑھ) کے ساتھ بریلی پہنچ کر ریاضی کے اہم اور پیچیدہ مسئلہ میں امام احمد رضا بریلوی سے استفادہ کیا اور اپنے مسئلہ کا حل پا کر بے حد متعجب و مسرور ہوئے۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد سابق صدر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے والد مولانا ظفر الدین قادری رضوی (متوفی ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء) کے بیان کے مطابق ڈاکٹر سر ضیاء الدین نے اپنے تأثرات بیان کرتے ہوئے کہا:

"میں سنا کرتا تھا کہ علم لدنی بھی کوئی شئی ہے۔ آج اپنی آنکھوں سے میں نے دیکھ لیا۔ میں تو اس مسئلہ کے حل کے لئے جرمنی جانا چاہتا تھا۔ اتفاقاً ہمارے دینیات کے پروفیسر سید سلیمان اشرف صاحب نے میری رہنمائی فرمادی اور میں حاضر ہو گیا۔ یوں معلوم ہو رہا ہے کہ آپ اس مسئلہ کو کتاب میں دیکھ رہے تھے۔ (ص: ۱۵۴۔ جلد اول۔ حیات اعلیٰ حضرت۔ از مولانا ظفر الدین۔ مطبوعہ آرام باغ کراچی)

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی امام احمد رضا بریلوی کے فتاویٰ بنام فتاویٰ رضویہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مولانا احمد رضا خاں مرحوم صاحبِ علم و نظر علمائے مصنفین میں تھے۔ دینی علوم خصوصاً حدیث و فقہ پر ان کی نظر وسیع اور گہری تھی۔ مولانا نے جس دِقتِ نظر اور تحقیق کے ساتھ علماء کے استفسارات کے جوابات تحریر فرمائے ہیں ان سے ان کی جامعیت، علمی بصیرت، قرآنی استحضار، ذہانت و طباعی کا پورا پورا اندازہ

ہوتا ہے۔(ماہنامہ معارف اعظم گڑھ۔شمارہ ستمبر۱۹۶۲ء)

اسی طرح مولانا ملک غلام علی صاحب جو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے نائب و معاون تھے وہ لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ مولانا احمد رضا خاں صاحب کے بارے میں اب تک ہم لوگ سخت غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں۔ ان کی بعض تصانیف اور فتاویٰ کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ جو علمی گہرائی و گیرائی میں نے ان کے یہاں پائی وہ بہت کم علماء میں پائی جاتی ہے۔اور عشقِ خدا و رسول تو ان کی سطر سطر سے پھوٹا پڑتا ہے۔ (ہفت روزہ شہاب لاہور۔شمارہ ۲۰/نومبر۱۹۶۲ء)

آزاد منش صوفی اور اردو کے صاحبِ طرز ادیب خواجہ حسن نظامی (درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء نئی دہلی) لکھتے ہیں:

''اس موقع پر بھی نہایت فخر سے مولانا بریلوی کی اس خدمتِ قومی کا اظہار کرنا چاہتا ہوں جو انھوں نے جنگ بلقان، طرابلس اور کان پور میں کی۔ میرے نزدیک مولانا بریلوی کی جرأت و دلیری علمائے دیوبند، فرنگی محل (لکھنؤ) اور تمام لیڈرانِ گرم و سرد سے بڑھ کر ہے۔ انھوں نے جو کام کیا وہ ایک سے بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ اور نہ ہوسکا۔ اور وہ ان کے بے باکانہ فتاویٰ ہیں جو ان مواقع پر انھوں نے لکھے اور باطل کے مقابلے میں حق کی حمایت کی۔'' (ہفت روزہ خطیب دہلی۔شمارہ ۲۲/مارچ ۱۹۱۵ء)

مختلف افکار و نظریات اور جماعات و جمعیات کے انحرافات و ضلالات کے خلاف امام احمد رضا بریلوی نے اپنی خداداد اسلامی و علمی بصیرت و ژرف نگاہی، جرأت و استقامت، دلیری و دیدہ وری، حق شناسی و حق نگاری اور صراحت و وضاحت کے ساتھ اِحقاقِ حق و اعلائے کلمۃ اللہ کا گراں قدر فریضہ انجام دیا ہے۔ اسے قدرے تفصیل سے جاننے کے لئے ملاحظہ فرمائیں میری تازہ ترین کتاب **''امام احمد رضا اور جدید افکار و تحریکات''** مطبوعہ دار القلم دہلی

۱۴۲۸ھ/ ۲۰۰۷ء۔

بفضلہٖ تعالیٰ رفتہ رفتہ اب حالات بدل رہے ہیں۔ گرد وغبار چھٹ رہے ہیں۔ غلط فہمیاں دور ہو رہی ہیں۔ پروپیگنڈے کا زور ٹوٹ رہا ہے۔ روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں۔ ظلمتیں منہ چھپا رہی ہیں۔ حقائق سامنے آرہے ہیں۔ شب دیجور رخصت ہو رہی ہے۔ خورشیدِ سحر طلوع ہو رہا ہے۔ پھر کس میں اتنا دم اور کس کی مجال ہے جو افق سے ابھرتے ہوئے آفتاب اور اس کی جگمگاتی ہوئی شعاعوں پہ کمند ڈال کر اس کی تابانیوں کو اسیر کر سکے؟؟؟

رات کے ماتھے پہ تابندہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے

یٰسٓ اخترمصباحی
بانی وصدر دار القلم، ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵
موبائل: 09350902937
فون: 011-26986872
فیکس: 011-26987184

جمعة المباركه
۶/محرم الحرام ۱۴۲۸ھ
۲۶/جنوری ۲۰۰۷ء

اجلاسِ بریلی ۱۹۲۰ء میں وفدِ علماے اہل سنت کی حق بیانی

برھانِ ملت حضرت مفتی محمد عبدالباقی برھان الحق جبل پوری (متوفی ۱۴۰۴ھ/ ۱۹۸۴ء) تلمیذ وخلیفۂ امام احمد رضا بریلوی جمعیۃ علماے ہند کے اجلاسِ بریلی کے موقعہ پر وفد علماے اہل سنت کے ہمراہ تھے۔ انھوں نے اجلاس کے چشم دید حالات و واقعات اپنی کتاب ''اِکرام امام احمد رضا'' مطبوعہ مرکزی مجلس رضا لاہور ۱۹۸۱ء میں درج کر دیے ہیں جنھیں یہاں افادۂ عام کے خیال سے پیش کیا جا رہا ہے۔ واضح رہے کہ برہانِ ملت جبل پوری آل انڈیا مسلم پرسنل لا کانفرنس بمبئی ۱۹۷۲ء کے اہم اور خصوصی مقرر تھے اور ذمہ دارانِ بورڈ نے آپ کو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا تاحیات آل انڈیا نائب صدر بنایا تھا۔

یٰسٓ اختر مصباحی

۱۳۳۸ھ مطابق ۱۹۲۰ء میں گاندھی کی تحریکِ ترکِ موالات اور تحریکِ ہندو مسلم اتحاد بہت زور کے ساتھ اٹھی۔ اسی کے ساتھ مسئلۂ خلافت کو ملا دیا گیا۔ سلطانِ ترکی کو خلیفۃ المسلمین، امیر المومنین کہا جانے لگا۔ اس تحریک میں ہندوستان کے بعض پختہ مغز، نامور، ذی اثر، معزز مسلمان شامل ہو گئے اور تحریک زور پکڑ گئی۔ شوکت علی، محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالباری فرنگی محلی وغیرہم نہ صرف شامل بلکہ پیش پیش ہو کر عام مسلمانوں کو شمولیت کی دعوت دینے لگے۔

اعلیٰ حضرت (امام اھل سنت مولانا احمد رضا بریلوی) اور جن علما اور صاحبِ اثر مسلمانوں نے ان تحریکات کو خلافِ شرع اور فتنہ سمجھ کر ان تحریکات میں حصہ نہیں لیا اور ان کا ساتھ نہیں دیا ان کے خلاف تقریروں اور اخباروں میں دھمکیاں دی گئیں۔

اعلیٰ حضرت کو اور ہم لوگوں کو شامل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا گیا۔

اعلیٰ حضرت اور حضرت عید الاسلام مولانا عبدالسلام جبل پوری اور دوسرے علماء کے خلاف نہایت گندے حملے کیے جانے لگے۔ آخر مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی جانب سے اعلیٰ حضرت اور

(بعض دیگر) علمائے حق کے خلاف ایک مضمون شائع ہوا (مولانا فرنگی محلی اور اعلیٰ حضرت کے درمیان طویل خط و کتابت بھی ہوئی) اعلیٰ حضرت کی جانب سے الطاری الداری لھفوات عبدالباری (۱۳۳۹ھ) لکھ کر مولانا عبدالباری کو رجسٹری کی گئی اور چھاپ کر شائع کی گئی۔ مولانا پر اس کا اچھا اثر ہوا۔ انھوں نے ان کا ساتھ تو نہیں چھوڑا لیکن رفتار سست ہوگئی۔

خلافت کمیٹی کی طرف سے ترکوں کے لئے خلافتِ راشدہ کے نہج پر خلافت کے حق میں مضامین اور بیانات شائع ہوئے تو مسئلہ خلافت کی شرعی تحقیق اور وضاحت کے لئے کتاب "دوام العیش فی الائمة من قریش" اعلیٰ حضرت کی طرف سے شائع ہوئی — جس میں بتایا گیا کہ اسلامی نقطۂ نظر سے سلطان ترکی، (اصطلاحی) خلیفۃ المسلمین، امیر المؤمنین تو نہیں ہوسکتا تاہم سلطانِ اسلام کی حیثیت سے ان کی اور سلطنت اسلام کی حیثیت سے ترکی کی امداد و اعانت ہر مسلمان پر بقدر استطاعت فرض ہے۔

ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں آیت کریمہ لاینھکم اللّٰہ عن الذین لم یُقٰتِلوُکم فی الدین۔ الآیۃ پر بہت زور دیا گیا۔ اس سلسلے میں اعلیٰ حضرت کی طرف سے فتویٰ "المحجة المؤتمنه فی آیة الممتحنه" (۱۳۳۹ھ) شائع ہوا جس میں قوی دلائل سے ثابت کیا گیا کہ ہندوستان کے مشرکین، حربی کفار ہیں۔ ان سے وداد و اتحاد اس آیت کریمہ کے تحت نہیں آتا۔ ہندوستان کے طول و عرض میں اس غیر شرعی ممنوعہ اتحاد کے سلسلے میں جا بجا جلسے اور شور و شغب بہت زور پر تھا۔

رجب شریف ۱۳۳۹ھ/ مارچ ۱۹۲۱ء میں اجمیر شریف کی حاضری کے بعد بریلی حاضر ہوا۔ آستانہ پر چند مقتدر علمائے کرام کی مجلسِ شوریٰ ہو رہی تھی۔ مولانا سید سلیمان اشرف صاحب (صدر شعبۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) صدرِ مجلس تھے۔ سب سے سلام و مصافحہ کے بعد میں بھی بیٹھ گیا — معلوم ہوا کہ جمعیت علمائے ہند کے اہتمام سے ابوالکلام آزاد کی زیر صدارت ایک کھلا اجلاس بریلی میں ہو رہا ہے جس میں وہ اپنے مخالفین پر اتمام حجت کریں گے۔ اس امر کا اظہار انھوں نے مختلف اشتہار شائع کر کے کیا ہے۔

کانگریسی اور خلافتی لیڈروں کی طرف سے ہونے والی غیر اسلامی حرکات کو بند کرانے، رفعِ نزاع اور متفقہ لائحۂ عمل تیار کرنے کے لئے علماء کی کوششوں کا جائزہ لیا گیا۔ صدر الشریعہ مولانا امجد علی صاحب (اعظمی) کے مرتب کردہ ستّر سوالات بعنوان "اتمام حجت تامہ" (۱۳۳۹ھ)

شائع ہوکر اراکین خلافت کمیٹی تک پہنچ چکے تھے۔ ابوالکلام آزاد نے ان تمام کوششوں کے برعکس اعلیٰ حضرت کو جلسہ میں شرکت اور رفع منازعت کی دعوت بھیج دی۔ آستانہ پر حاضر علماے ''جماعت رضاے مصطفیٰ'' کی طرف سے اس سے پہلے جمعیت علماے ہند کے اجلاس میں شرکت کرنے اور رفع نزاع کے لئے ایک وفد کا اعلان بذریعہ اشتہار کر چکے تھے جو کھلے اجلاس میں ابوالکلام آزاد اور دوسرے خلافتی لیڈروں سے جا کر گفتگو کرے گا۔

اعلیٰ حضرت کے موقف کے مطابق مولانا امجد علی صاحب (اعظمی) کے مرتب کردہ ستر سوالات کا مجموعہ مسمیٰ بہ ''اتمام حجت تامہ'' طویل اشتہار کی شکل میں چھپ چکا تھا اور وفد کے جانے سے پہلے اجلاس عام کے منتظمین کو بھیجا جا چکا تھا تا کہ وہ ان سوالات کا جواب تیار رکھیں — میں نے ''اتمام حجت تامہ'' بہت غور سے مطالعہ کیا۔ ایک دو خاص شدید اعتراضات جو ''اتمام حجت تامہ'' میں نہ تھے مگر میرے ذہن میں پورے ثبوت کے ساتھ تھے، میں نے انہیں تازہ کرلیا۔

علماء کا وفد ۹ بجے شب کانگریسی جلسہ گاہ کی طرف روانہ ہوا۔ میرے علاوہ بے شمار علما اور عوام اہل سنت بھی وفد کے ہمراہ بڑے وقار و تحمل کے ساتھ جا رہے تھے۔

صدرالشریعہ مولانا امجد علی صاحب اور صدرالافاضل مولانا نعیم الدین صاحب مرادآبادی نے مجھے اپنے درمیان لے لیا۔ ہم جلسہ گاہ پہنچے۔ بہت بڑا اجتماع تھا۔

کانگریسی والنیٹرس نے ہمیں اسٹیج پر پہنچا دیا۔ مجمع کے درمیان اسٹیج تھا۔ اسٹیج کے درمیان صدر جلسہ ابوالکلام آزاد تھے — مولانا نثار احمد کانپوری، مفتی کفایت اللہ دیوبندی وغیرہم اسٹیج کی زینت تھے۔ وفد کے ہمراہ بے شمار مسلمان نعت خوانی کرتے ہوئے اور نعرہ ہائے تکبیر و رسالت بلند کرتے ہوئے بڑی شان و شوکت سے مجمع میں پہنچ گئے — اس وقت مولوی احمد سعید دہلوی تقریر کر رہے تھے اور کانگریس کا ساتھ نہ دینے والے علما پر اشارۃً کنایۃً جملے کس رہے تھے۔ تقریر ختم ہوئی — علماے وفد آزاد کے قریب تھے۔ میں آزاد کی پشت پر تین چار آدمیوں کے پیچھے تھا۔ ابوالکلام آزاد نے بلند آواز سے کہا:

''آپ لوگوں کا صدر کون ہے؟''

مولانا سید سلیمان اشرف صاحب نے کچھ فرمایا۔ میں ان کا جواب نہ سمجھ سکا۔

ابوالکلام آزاد نے سید سلیمان اشرف کو تقریر کرنے کی دعوت دی۔ سید سلیمان اشرف تقریر

کے لئے کھڑے ہوگئے۔تقریر کے دوران انھوں نے اپنا موقف نہایت وضاحت سے بیان کیا۔ اپنے موقف کی حمایت میں قوی دلائل پیش کیے۔اتمام حجت تامہ کے سوالات کا جواب طلب کیا۔ آزاد صاحب کے کچھ اخباری بیانات، کچھ تقریروں اور بعض حرکات پر شدید اعتراضات کیے۔ اپنی کتاب ''الرشاد'' اور ایک اور کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے آزاد صاحب سے جواب طلب کیا اور اپنی پوزیشن صاف کرنے کا مطالبہ کیا— آزاد صاحب کے پاس ان تمام باتوں کا جواب نہ تھا۔

اسی دوران میں بہت پیچ وتاب کھا رہا تھا کہ وہ غیر اسلامی حرکات جن کا ارتکاب یہ لیڈران کرتے ہیں اور اس کی مصدقہ اطلاعات اخبارات کے ذریعہ ملک بھر میں پھیل چکی ہے، کس طرح انکار کررہے ہیں— میں کھڑا ہوگیا۔مفتی کفایت اللہ اور ایک صاحب نے میرا دامن کھینچا مگر میں بڑھ کر آزاد صاحب کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔مولانا سید سلیمان اشرف صاحب نے مجھ سے کہا کہ ''آپ بھی کچھ کہیں گے؟''— میں نے کہا کہ ''آزاد صاحب سے کچھ پوچھنے کے لئے کھڑا ہوا ہوں''— آزاد نے کہا ''کہیے!''— اسٹیج کا ہر فرد اور پورا مجمع مجھے دیکھنے لگا— میں نے آزاد صاحب سے ذرا بلند آواز سے کہا:

''آں جناب نے ابھی ابھی اپنی جوابی تقریر میں زور دے کر فرمایا کہ مجھ پر تمام الزامات غلط اور بے بنیاد ہیں جن کا کوئی ثبوت نہیں۔میری گذارش یہ ہے کہ اخبار زمیندار، لاہور کے فلاں نمبر، فلاں تاریخ میں نہایت نمایاں جلی سرخیوں میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ ''ناگپور میں خلافت کانفرنس کے پنڈال میں امام الہند ابوالکلام آزاد صاحب نے جمعہ پڑھایا اور خطبۂ جمعہ میں مہاتما گاندھی کی صداقت وحقانیت کی شہادت دی— ایک مشرک کی صداقت وحقانیت کی شہادت خطبۂ جمعہ میں!— یہ کیسا اسلام ہے؟

یہ سنتے ہی آزاد کا چہرہ فق ہوگیا— ایک دومنٹ تک مجھے دیکھتے رہے۔پھر بولے، "لعنة الله علی قائلهٖ"۔

میں نے کہا؛ ''آزاد صاحب! یہ کلماتِ لعنت اسی اخبار میں بالاعلان شائع کرا دیجیے تو امید کہ توبہ کے قائم مقام ہوجائیں۔''

پھر میں نے کہا۔ایک بات اور عرض کرنی ہے:

''اخبار تاج (جبل پور) فلاں تاریخ، فلاں نمبر میں ہے کہ ''اللہ آباد کے ایک جلسۂ عام میں مولانا ابوالکلام آزاد صاحب نے کرسیِ صدارت سے اعلان فرمایا کہ مقاماتِ مقدسہ کا فیصلہ اگر چہ ہمارے حسب دل خواہ بھی ہو جائے تب بھی ہم اس وقت تک چین نہ لیں گے جب تک گنگا اور جمنا کی مقدس سرزمین کو آزاد نہ کرالیں گے،،—
بحیثیت مسلمان ہونے کے گنگا جمنا بھی آپ کے نزدیک مقدس ہیں؟ استغفر اللہ!''

اس پر آزاد نے کہا: ''میں نے یہ پرچے نہیں دیکھے،'' لعنۃ اللہ علی قائلہٖ''

اس پر بھی پھر میں نے یہی کہا:

''لعنت کے یہی الفاظ توبہ کے قائم مقام اخبارات میں باعلان شائع ہونے چاہئیں:''

اس کے ساتھ ہی میں نے اتمام حجت تامہ کی جانب توجہ مبذول کراتے ہوئے ابوالکلام آزاد سے کہا:

> ''یہ ستر سوالات کا ایک مجموعہ ہے جس کے ہر سوال کا مفصل اطمینان بخش جواب آپ کی طرف سے دیا جانا چاہیے۔''

اس کے بعد حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا خاں صاحب بریلوی نے ابوالکلام آزاد کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

> ''مقامات مقدسہ کی حفاظت اور خلافتِ اسلامیہ کی خدمت ہر مسلمان پر بقدر وسعت فرض ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں۔ آپ کی خلافِ شرع حرکات میں سے کچھ کا بیان تو مولانا سید سلیمان اشرف کی تقریر میں آچکا ہے۔ باقی کا ذکر جماعت رضائے مصطفیٰ (بریلی) کی طرف سے شائع شدہ اشتہار بعنوان اتمام حجت تامہ میں ہے۔ وہ اشتہار آپ کو پہونچ چکا ہے۔ علاوہ ازیں بعض غیر اسلامی حرکات پر مولانا برہان الحق صاحب نے آپ کا مواخذہ کیا ہے۔ آپ جب تک ان تمام حرکات سے رجوع نہ شائع کریں گے ہم آپ سے علیحدہ ہیں۔''

آزاد صاحب نے وعدہ کیا کہ اجلاس کی روداد میں ان تمام غیر اسلامی حرکات سے رجوع کا اعلان شائع کر دیا جائے گا—

ہمارا وفد اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر واپس روانہ ہوا۔ میں بھی پیچھے پیچھے چلا—

والنٹیر وں نے ہمیں اپنے گھیرے میں لے کر پنڈال کے باہر تک پہنچادیا۔ ہم سب واپس چلے—راستہ میں وفد کی کامیابی کا تذکرہ کرتے ہوئے صدرالافاضل مولانا نعیم الدین صاحب مرادآبادی نے میرا ہاتھ پکڑ کر حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''برہان میاں! آپ کے ابتدائی دوسوالوں نے تو ابوالکلام کو بالکل مبہوت کردیا۔''

ہم سب مکان پر پہنچے۔ معلوم ہوا کہ اعلیٰ حضرت انتظار فرمارہے ہیں— یہاں اعلیٰ حضرت کو پہلے ہی سے کانگریسی پنڈال میں ابوالکلام کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کی پوری رپورٹ مل گئی تھی— پردہ کرا کے اندر ہی وفد کو اعلیٰ حضرت نے بلوایا۔ صدرالافاضل مولانا نعیم الدین صاحب نے یہ عرض کیا:

''حضور! برہان میاں نے بہت جرأت وہمت سے کام لیا، یہ صرف حضور ہی کا فیض ہے۔''

اعلیٰ حضرت نے دعائیں دیں۔ ہم سب باہر آگئے۔ مولانا نعیم الدین صاحب اور مولانا سلیمان اشرف صاحب جو باہر سے تشریف لائے تھے۔ اسٹیشن روانہ ہوگئے۔ ہم لوگوں نے آرام کیا— صبح نمازِ فجر کے بعد ایک صاحب اسٹیشن سے آئے انھوں نے بتایا۔'' دہرہ دون میل میں ابوالکلام آزاد صاحب کو ایک مجمع گھیرے ہوئے تھا۔ میں بھی کھڑا ہوگیا۔ ان کی زبان سے یہ الفاظ سنے:

''بعض باتیں حقیقت ہیں جن سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن اب ہمیں آزادی کا جو مسئلہ حل کرنا ہے اس کے آگے یہ تمام باتیں فی الحال زیادہ توجہ کے قابل نہیں ہیں مگر احتیاط بہر حال ضروری ہے۔''

میں دو ہفتے بریلی رہا۔ پھر واپس چلا آیا۔

کون ہے برطانوی سامراج کا سند یافتہ ایجنٹ؟

جماعتِ اسلامی ہند کے ترجمان سہ روزہ دعوت نئی دہلی مؤرخہ ۷ر ستمبر ۲۰۰۶ء میں ''ایک تحقیق ایک نقطۂ نظر! برطانوی سامراج کے وفادار اور بھی تھے'' کے جلی عنوان سے ایک مضمون نظر سے گذرا جو حیرت انگیز کم شر انگیز زیادہ ہے۔ ''اتحاد بین المسلمین'' کا راگ الاپنے والے حضرات اندر خانہ کیا سوچتے سمجھتے اور کیسی ذہنیت رکھتے ہیں اس کا یہ شاہکار نمونہ ہے۔ اگر کسی دیوبندی یا غیر مقلد اخبار و رسالہ میں یہ مضمون شائع ہوا ہوتا تو چنداں جائے تعجب نہ تھا مگر جماعت اسلامی ہند کے آرگن جس کے صفحات پر اس طرح کا کوئی مضمون کم از کم میری نظر سے کبھی نہیں گذرا ایسے آرگن میں اس کا چھپ جانا یقیناً افسوسناک ہے۔ حیرت بالائے حیرت ہے کہ سنی دیوبندی مسالک کے مروجہ اختلافی مسائل سے عموماً دور رہنے یا عدم دل چسپی کا اظہار کرنے والی جماعتِ اسلامی کو آخر اس مضمون میں کیا خوبی کون سی تحقیق یا ضرورت آن پڑی تھی کہ اس نے اسے شائع کر کے اپنے صفحات کو آلودہ بلکہ اپنے آرگن کی تاریخ کو داغ دار کیا ہے؟

بغیر کسی ثبوت و شہادت کے محض الزامات و اتہامات پر مشتمل مضمون ذیل میں مضمون نگار (ڈاکٹر مغل فاروق پرواز، ظہیر منزل، دودھ پور، علی گڑھ، یوپی) ہی کے قلم سے انھیں کے الفاظ میں نقل کیا جا رہا ہے۔ مضمون نگار نے جو بے بنیاد الزامات عاید کیے ہیں وہ نمبر وار اس طرح ہیں۔

(۱) ''حق نمک کی ادائیگی کے طور پر فضل رسول بدایونی نے تین کتابیں تصنیف فرمائیں:

(۱) سیف الجبار (۲) بوارقِ محمدیہ (۳) تصحیح مسائل — ان تینوں کتابوں کے ذریعہ انھوں نے ایک طرف تو ان علما کو عوام میں بے اثر کرنے کی کوشش کی جو جنگ آزادی میں مصروف تھے اور دوسری طرف عوام کے دلوں میں انگریز حاکم کی عزت و محبت کے لئے راہیں ہموار کرنی شروع دیں۔ چوں کہ فضل رسول بدایونی خانقاہوں سے بھی جڑے ہوئے تھے اس لئے انھوں نے وہ کر دکھایا جو مرزا غلام احمد قادیانی نہ کر سکے۔''

(۲) ''فضل رسول بدایونی کے بعد انگریزوں نے ہندوستان میں مولانا احمد رضا خاں کو اور حجاز میں مولانا احمد زینی وحلان کو اس کام پر مامور کیا۔''

(۳) ''مولانا احمد رضا خاں نے مولانا احمد زینی دحلان سے بازی مارتے ہوئے تین کتابیں تحریر فرمائیں: (۱) اعلام الاعلام بأن هندوستان دار الاسلام (۲) دوام العيش (۳) المحجة المؤتمنة فی آية الممتحنة''۔

''مولانا احمد رضا خاں نے انگریزوں سے چندہ وصولی کو بھی جائز ٹھہرایا اور ان کے دورِ حکومت کو دار الاسلام سے تعبیر کیا۔''

''اپنے عزائم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے مولانا احمد زینی دحلان اور مولانا احمد رضا خاں کی ایک خفیہ ملاقات بھی ہوئی تھی۔''

(۴) ''قادیانی تحریک اور رضا خانی تحریک میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ دونوں تحریکوں کے اغراض و مقاصد میں برصغیر ہند و پاک میں انگریزی حکومت کو استحکام پہنچانا، تحریک آزادی کی مخالفت کرنا، مسلمانوں میں تفرقہ پھیلانا، انگریزوں کے خلاف جہاد کی مخالفت کرنا، مسلمانوں کی عام تکفیر کرنا، ترکِ موالات کی مخالفت کرنا وغیرہ ہے۔''

(۵) ''مرزا غلام احمد قادیانی کا دجل وفریب اول روز سے ہی مسلمانانِ ہند پر مولانا محمد حسین بٹالوی اور شیخ نذیر حسین دہلوی کی کوششوں کے نتیجے میں ظاہر ہو گیا۔''

(۶) ''مولانا زینی دحلان نے اپنے انگریز حاکم کی ناجائز خواہشات کی تکمیل کی خاطر ایک کتاب بنام ''خلاصۃ الکلام فی اُمراءِ البلد الحرام'' تحریر فرمائی۔''

''مولانا احمد زینی دحلان نے انگریز کے دورِ اقتدار کو دار الاسلام سے بھی تعبیر کیا۔''

(ص ۸۔ سہ روزہ دعوت، ابو الفضل انکلیو، نئی دہلی ۲۵۔ جلد ۵۴۔ شمارہ ۸۲، مؤرخہ ۷ ستمبر ۲۰۰۶ء جمعرات ۱۳ شعبان المعظم ۱۴۲۷ھ/۔ بقلم ڈاکٹر مغل فاروق پرواز، علی گڑھ)

مضمون نگار کا مطالعہ اور مبلغِ علم کیا ہے؟ یہ حقیقت ان کی اس تحریر سے صاف عیاں ہے۔ اس تحریر میں بذاتِ خود ان کا کچھ بھی نہیں ہے کیوں کہ ان کا منتہائے علم و مطالعہ ''مطالعۂ بریلویت'' از خالد محمود (مانچسٹر، برطانیہ) اور ''البریلویت'' از احسان الٰہی ظہیر (متوفی ۱۹۸۶ء لاہور) ہے۔ ان دونوں کتابوں بالخصوص ''مطالعۂ بریلویت'' سے نقل کے سوا اس کے اندر واقعۃً

کچھ بھی نہیں ہے۔ اور یہ الزامات و اتہامات سو سال سے بار بار دہرائے جاتے رہے ہیں اور بار بار ان کے جوابات دیے جاتے رہے ہیں۔ سیکڑوں کتب و رسائل کے ہزاروں صفحات ان الزامات و جوابات کی نذر ہو چکے ہیں۔

جھوٹ کو بار بار دہراتے رہنے اور پروپیگنڈہ کے زور پر اپنی بے بنیاد بات عام لوگوں کے ذہن میں اتارنے اور اسے راسخ کرنے کا کا یہ تازہ ترین نمونہ ہے۔ اس ''پروپیگنڈسٹ گروپ'' نے تقریباً ڈیڑھ سو سالہ مسلم تاریخ ہند کا تیاپانچہ کر رکھا ہے اور اپنے کئی ہم نوا جدید عرب علما و مصنفین کو بھی اپنی غلط نویسی کا شکار بنا رکھا ہے جب کہ ضابطہ اور قاعدہ یہ ہے کہ الزام بلا ثبوت اور دعویٰ بلا دلیل مردود و باطلِ محض ہے۔ اور پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں۔ کفیٰ بالمرء کذباً ان یحدث بکل ماسمع (صحیح مسلم) آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بیان کرتا پھرے۔

فرضی تاریخ نویسی، افواہ اور پروپیگنڈہ کے تین نمونے ذیل میں پیش کر کے پھر زیرِ بحث مضمون کے تحلیل و تجزیہ کی طرف ان شاء اللہ خصوصی اور خاطر خواہ توجہ مبذول کی جائے گی۔

(۱) غیر مقلد عالم احسان الٰہی ظہیر لاہوری (متوفی ۱۹۸۶ء) کی عربی کتاب ''البریلویۃ'' جس کی سعودی ریال کے سہارے متعدد زبانوں میں اشاعت اور دنیا بھر میں تشہیر ہوئی اس کے مقدمہ نگار شیخ عطیہ سالم نجدی قاضی محکمۂ مدینہ منورہ اس کتاب اور اس کے مشتملات سے متاثر ہو کر اور اسی کی بے بنیاد تحقیق پر بھروسہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> و من ناحيةِ تكوين مؤسسها كذلك حيث كان اول معلم له هو مرزا قادر بيك الذى هوا خ لمرزا غلام احمد القاديانى۔ فيصدق عليه القول: بأن القاديانية و البريلوية فى خدمةِ المستعمر شقيقان۔ (ص: ٤ البريلوية۔ عقائد و تاريخ۔ تاليف احسان الٰهى ظهير۔ الطبعة الاولىٰ ١٤٠٣ھ / ١٩٨٣م۔ الناشر ادارة ترجمان السنة بلاهور۔ باكستان)
>
> ترجمہ: بریلویت کے بانی کا پہلا استاذ مرزا غلام قادر بیگ مرزا غلام احمد قادیانی کا بھائی تھا۔ لہٰذا یہ کہنا درست ہے کہ سامراج کی خدمت میں

قادیانیت و بریلویت دونوں بھائی بھائی ہیں۔'' (البریلویت)

یہی بات رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے عربی ترجمان نے اپنے اداراتی نوٹ کے اندر دہرائی ہے کہ یہ شخص (احمد رضا بریلوی) مرزا غلام احمد قادیانی بانی قادیانیت کے بھائی مرزا غلام قادر بیگ کا شاگرد ہے۔ (شمارۂ جمادی الاولیٰ والآخرہ ۱۴۰۵ھ/ فروری مارچ ۱۹۸۵ء)

اب حقیقتِ حال سنیے۔ مرزا غلام احمد قادیانی دجال و کذاب کا ایک بھائی مرزا غلام قادر قادیان صوبہ پنجاب کا معزول تھانے دار تھا جو پچپن سال کی عمر میں ۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۳ء میں مر گیا۔

جب کہ مرزا غلام قادر بیگ بریلوی جنھوں نے بعض ابتدائی کتابیں مثلاً میزان و منشعب وغیرہ کی تعلیم امام اھل سنت مولانا احمد رضا حنفی قادری برکاتی (وصال ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء) کو دی تھی ان کے بارے میں امام احمد رضا بریلوی کے تلمیذ و سوانح نگار مولانا محمد ظفر الدین قادری رضوی (وصال ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء) سابق پرنسپل مدرسہ شمس الھدیٰ پٹنہ بہار لکھتے ہیں:

''میں نے جناب مرزا (غلام قادر بیگ) صاحب مرحوم و مغفور کو دیکھا تھا۔ گورا چٹا رنگ عمر تقریباً اسی سال، داڑھی اور سر کے بال ایک ایک کر کے سفید، عمامہ باندھتے تھے۔'' .... خدا کے فضل سے صاحب اولاد ہیں۔ ایک صاحبزادے جن کا نام مرزا عبدالعزیز بیگ صاحب ہے دینیات سے واقف اور طبیب ہیں .... بریلی جامع مسجد کے قریب مکان ہے۔ پنج وقت نماز جامع مسجد میں ادا کرتے ہیں۔ (حیات اعلیٰ حضرت حصہ اول مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی ۱۴۲۴ھ/ ۲۰۰۳ء)

حضرت مرزا غلام قادر بیگ بریلوی کے پوتے مرزا عبدالوحید بیگ بریلوی کے تحریر کردہ سوانحی خاکہ کے دو چار اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

''حضرت مولانا حکیم مرزا غلام قادر بیگ صاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ میرے حقیقی دادا حضرت مولانا مطیع بیگ صاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ اور میرے دادا حضرت مرزا احسن بیگ مرحوم و مغفور لکھنوی کی بیاض کے مطابق حضرت مرزا غلام قادر بیگ صاحب ۲۵ ر جولائی ۱۸۲۷ء مطابق یکم محرم الحرام ۱۲۴۳ھ کو پیدا ہوئے تھے۔ آپ کی

پیدائش محلّہ جھوائی ٹولہ لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ آپ کے والد مرحوم نے لکھنو کی سکونت ترک کر کے بریلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ لہذا آپ جامع مسجد بریلی کے شرق میں واقع مکان محلّہ قلعہ میں رہتے تھے۔ آپ کا مکان آج بھی موجود ہے۔ (ص:۶۱۔ ماہنامہ حجاز جدید دہلی۔ شمارہ اکتوبر ۱۹۸۸ء)

''ہمارا خاندان نسلاً ایرانی یا ترکستانی مغل نہیں ہے اور بیگ کے خطابات اعزازی شاہان مغلیہ کے عطا کردہ ہیں۔ اسی مناسبت سے ہمارے بزرگوں کے ناموں کے ساتھ مرزا اور بیگ کے الفاظ لکھے جاتے رہے ہیں۔ ہمارا سلسلۂ نسب حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔ حضرت احرار رحمۃ اللہ علیہ نسلاً فارقی تھے۔ (ص:۶۱ ماہنامہ حجاز دہلی)

''حضرت امام احمد رضا قادری بریلوی رضی اللہ عنہ کے اجدادِ کرام بھی شاہانِ مغلیہ سے وابستہ رہے ہیں۔ اسی زمانہ سے ہمارے اور امام احمد رضا رضی اللہ عنہ کے خاندان سے قریبی روابط رہے ہیں۔ یہ تعلق و رابطہ حضرت مفتی اعظم ہند مولانا مصطفیٰ رضا بریلوی رضی اللہ عنہ کی حیاتِ ظاہری تک برابر رہا۔ یہاں تک کہ میری دو ہمشیرگان بھی حضرت امام احمد رضا رضی اللہ عنہ کے خاندان میں بیاہی گئیں۔ (ص:۶۱۔ ماہنامہ حجاز دہلی)

''ہمارے خاندان کا کبھی بھی کسی قسم کا کوئی واسطہ و تعلق مرزا غلام احمد قادیانی کذاب سے نہیں رہا۔ حتی کہ ہمارے دور کے عزیزوں کا بھی نہیں۔ (ص:۶۲۔ ماہنامہ حجاز دہلی)

''یہ الزام لگانا کہ حضرت مولانا غلام قادر بیگ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مرزا غلام احمد قادیانی کذاب کے بھائی تھے، انتہائی لغو، بے بنیاد، کذب صریح ہے۔ غلام احمد قادیانی کذاب کا کوئی بھائی غلام قادر بیگ ہوتو یقیناً وہ دیگر شخص ہے۔ اس سے امام احمد رضا کی استاذی و شاگردی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ (ص:۶۲۔ ماہنامہ حجاز دہلی)

''حضرت مولانا مرزا غلام قادر بیگ رحمۃ اللہ علیہ کا وصال بریلی شریف میں ہوا۔ میرے والد مرحوم نے اپنی بیاض میں آپ کی تاریخ وفات ۱۸ر

اکتوبر ۱۹۱۷ء یکم محرم الحرام ۱۳۳۶ھ بعمر نوے (۹۰) سال لکھی ہے۔ آپ محلّہ باقر گنج (بریلی) میں واقع حسین باغ میں دفن کیے گئے۔ (ص:۶۲۔ ماہنامہ حجاز جدید دہلی۔ شمارہ اکتوبر ۱۹۸۸ء)

(۲) پایۂ حرمین حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی (متولد ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۷ء۔ متوفی ۱۳۰۸ھ/ ۱۸۹۱ء) نے کلکتہ بنگال کی ایک دین دار و مُخیر خاتون صولت النساء بیگم (بوقتِ سفرِ حج و زیارت ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء) کے مالی تعاون سے ۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۳ء میں مکہ مکرمہ کے اندر مدرسہ صولتیہ قائم کیا۔

آگرہ میں پادری فنڈر سے ۱۲۷۰ھ/ ۱۸۵۴ء میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی و ڈاکٹر وزیر خاں اکبر آبادی اور حضرت مولانا فضل رسول بدایونی کے بھانجے مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی کا ہونے والا مناظرہ تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ انگریز حکام مولانا کیرانوی سے سخت ناراض تھے اور ۱۸۵۷ء میں دارو گیر کا سلسلہ شروع ہوا تو آپ خاموشی کے ساتھ ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء میں مکہ مکرمہ پہنچ گئے اور پھر زندگی بھر وہیں مقیم رہے۔ کبھی ہندوستان واپسی نہ ہو سکی۔ کیرانہ مظفر نگر کی آپ کی جائداد بھی جنوری ۱۸۶۴ء میں انگریزوں نے نیلام کردی تھی۔ مولانا غلام دستگیر قصوری ھاشمی (وصال ۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء) کی کتاب ''تقدیس الوکیل عن توھین الرشد و الخلیل'' اور مولانا عبدالسمیع بیدل رام پوری سہارن پوری (وصال ۱۳۱۸ھ/ ۱۹۰۰ء) کی کتاب ''انوارِ ساطعہ در بیان مولود و فاتحہ'' طبع دوم ۱۳۰۷ھ پر مولانا کیرانوی کی تحریری تائید و تصدیق مطبوع و موجود ہے۔

اب سنیے الندوۃ العالمیۃ للشباب الاسلامی/ ورلڈ اسمبلی آف مسلم یوتھ/ WAMY کے سکریٹری جنرل مانع بن حماد الجھنی (متوفی ۱۴۲۳ھ/ ۲۰۰۲ء) کی تحریر جو ہندوستان کے ''پروپگنڈسٹ گروپ'' کی تحقیق پر مبنی ہے۔

ترجمہ: دارالعلوم دیو بند کے فارغ التحصیل ایک عالم نے مکہ مکرمہ میں مدرسہ صولتیہ قائم کیا جس نے دینی علوم کے فروغ میں شان دار خدمات انجام دیں۔ (ص: ۳۱۱۔ جلد اول۔ الموسوعة الميسّرہ فی الادیان و المذاهبِ و الاحزاب المعاصرة۔ دارالندوة العالمية

للطباعة والنشر و التوزيع۔ الرياض۔ طبعِ سوم ١٤١٨ھ)

مدرسہ عربی و فارسی و ریاضی دیوبند معروف بہ دارالعلوم دیوبند کا قیام ۱۵رمحرم الحرام ۱۲۸۳ھ/ ۳۰رمئی ۱۸۶۶ء میں ہوا جس کے مجوز ومحرک و بانی حضرت حاجی سید محمد عابد حسین قادری چشتی دیوبندی (وصال ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء) تھے اوراس مدرسہ کے قیام سے آٹھ سال پہلے مولانا رحمت اللہ کیرانوی ہندوستان چھوڑ چکے تھے۔ مکہ مکرمہ کے دوران قیام آپ کی مساعی جمیلہ سے ۱۸۷۳ء میں مدرسہ صولتیہ کا قیام عمل میں آیا۔ لیکن مانع بن حماد سکریٹری جنرل ورلڈ اسمبلی مسلم یوتھ لکھ رہے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ایک عالم نے مدرسہ صولتیہ قائم کیا:

خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے؟
ناطقہ سر بگریباں ہے اس کیا کہیے؟

(۳) کسی تفصیل وتبصرہ کے بغیر ذیل میں چند حوالے نقل کررہا ہوں جن سے مدرسہ دیوبند کے قیام، اس کی تاریخ، اس کے مقصد، اس کے بانی کے مسلک وغیرہ سب کچھ عیاں اور روشن ہوجاتے ہیں۔ ان مستند حوالہ جات کا مطالعہ کر کے آپ خود یہ سوچنے پر مجبور ہوجائیں گے کہ حقیقتِ حال کیا ہے اور ہمیں سنایا بتایا پڑھایا کیا جارہا ہے اور اصل تاریخ کو ایک صدی سے کس طرح مسخ کیا جارہا ہے۔؟

”حاجی (عابد) صاحب نے تین چلّے کیے۔ پہلا جنگل میں دوسرا چودھری صابر بخش کی مسجد میں اور تیسرا مسجد چھتہ میں۔ جب آپ تیسرے چلّے ہی میں تھے کہ آپ کو مدرسہ قائم کرنے کا الہام ہوا۔ جمعہ کی شب خواب دیکھا کہ حضور اکرم ﷺ تشریف فرما ہیں اور حاجی صاحب قدس سرہ کو حکم فرمارہے ہیں کہ یہاں ایک عربی مدرسہ دین اسلام کی بقا اور ترویج کے لئے قائم کیا جائے۔

صبح کو حاجی صاحب نے دیوبند کے سربرآوردہ حضرات کو مسجد چھتہ میں بلایا۔ مولانا مہتاب علی، مولانا ذوالفقار علی، مولانا فضل الرحمٰن، مولانا فضل حق، مولانا نذیر احمد اور دوسرے حضرات شریک ہوئے۔ حضرت حاجی محمد عابد صاحب قبلہ نے ان حضرات کے سامنے اپنے رات کے خواب کو بیان کیا اور ایک عربی مدرسہ کے قیام کی رائے پیش فرمائی۔ اور فرمایا کہ جب پرانے عالم نہ رہیں گے تو کوئی مسئلہ بتانے والا بھی نہ ملے گا۔

ان حضرات نے مکمل طور پر تعاون کا یقین دلایا اور امداد کا وعدہ فرمایا۔ اسی مجلس میں حاجی صاحب قدس سرہ نے اپنا سفید رومال چندہ کے لئے بچھادیا اور ساتھ ہی اپنی جیب سے تین روپے اس رومال پر رکھے۔ اور ہمیشہ دینے کا وعدہ فرمایا۔ ان حضرات نے بھی اپنا نام لکھوایا اور مجلس ختم ہوگئی۔ یہ واقعہ ۲/ ذی قعدہ ۱۲۸۲ھ بروز جمعہ کا ہے۔

صبح ہوئی۔ اشراق کی نماز کے بعد گلے میں جھولی ڈالی اور اپنے تین روپے اس میں ڈالے اور گھر گھر جا کر چندہ کا عمل شروع کردیا۔ اور شام تک چار سو ایک روپے اور آٹھ آنے جمع ہوگئے۔ اور پھر ڈیڑھ ماہ کی مدت میں اتنے روپے جمع ہوگئے کہ ۱۵/ محرم ۱۲۸۳ھ کو دار العلوم کا قیام عمل میں آگیا۔

(ص:۳۔ روداد دار العلوم دیو بند ۱۲۸۳ھ۔ خواب اور چندہ کا واقعہ تذکرۃ العابدین از مولانا نذیر احمد دیو بندی مطبوعہ دہلی ۱۳۱۷ھ میں بھی درج ہے)

''حضرت حاجی صاحب کا ساٹھ برس تک چھتہ کی مسجد میں قیام رہا۔ مشہور ہے کہ تیس سال تک آپ کی تکبیر اولیٰ فوت نہیں ہوئی۔ نماز تہجد کا ایسا التزام تھا کہ ساٹھ سال تک قضا کی نوبت نہیں آئی۔ صاحبِ کشف وکرامات بزرگ تھے۔ رشد وھدایت اور تذکیر وتزکیۂ قلوب کے علاوہ آپ کو فنِ عملیات میں زبردست ملکہ تھا۔ (ص:۲۲۲۔ جلد دوم۔ تاریخ دار العلوم دیو بند از سید محبوب علی رضوی۔ مطبوعہ دہلی ۱۹۷۷ء)

''ارباب حوائج اکثر ان (حاجی محمد عابد) کی خدمت میں آیا کرتے ہیں۔ صبح سے رات دس بجے تک نقوش اور تعویذ تقسیم کرتے ہیں۔ ساکنین دیو بند ان کے بہت معتقد ہیں۔ (ص:۸۰۔ دہلی اور اس کے اطراف۔ از حکیم عبد الحی رائے بریلوی۔ مطبوعہ دہلی)

''بعد نماز مغرب نوافل وختم خواجگان وغیرہ سے فراغ حاصل کر کے جو کوئی مرید یا مہمان ہوتا اس سے باتیں کرتے۔ ہر جمعہ کو بعد نماز مغرب مولود شریف کی محفل کا اہتمام کرتے۔ اس میں بہت زرِ کثیر صرف کرتے تھے اور تا زیست ہمیشہ کراتے رہے۔ (ص:۷۷۔ تذکرۃ العابدین از مولانا نذیر احمد دیو بندی۔ مطبوعہ دہلی ۱۳۱۷ھ)

''حاجی صاحب نے خود ہی شوریٰ سے کہا کہ مدرسہ کے واسطے زمین خریدنی چاہیے۔ اہل شوریٰ نے آپ سے کہا کہ اگر آپ کی رائے یہ ہے تو بہتر ہے مگر آپ ہی جگہ تجویز کر کے خرید فرمائیے۔ چند روز کے بعد حاجی صاحب نے جگہ تجویز کر کے خرید کی۔ اور اس کا بیع نامہ بھی حاجی

صاحب کے نام ہوا۔ اور مولوی رفیع الدین جو مدرسہ کے مہتمم تھے انھیں کے ذمہ مدرسہ کی تعمیر کا اہتمام سپرد کیا۔ اور ایک لاکھ کی لاگت سے مدرسہ تعمیر ہوا۔ (ص:۳۷۔ تذکرۃ العابدین از مولانا نذیر احمد دیوبندی۔ مطبوعہ دہلی ۱۳۱۷ھ)

''الحاج صوفی روشن ضمیر مولانا عابد حسین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بلاشبہ دارالعلوم کے ابتدائی بانی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی اور آفاقی تخیل سے مرحوم کا دل و دماغ بالکل خالی تھا۔ ایک عظیم درس گاہ جو آفاقی تصورات کی حامل ہو کلیۃً حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مرہونِ منت ہے۔ نیز ابتدا کی آویزشیں جن کی محتاط تعبیر شکر رنجی یا مشاجرت ہی سے ہو سکتی ہے۔ میرے نزدیک اس کی واقعیت صرف اتنی نہیں کہ عمارت کے مختصر یا وسیع کرنے پر دونوں بزرگوں کا اختلاف تھا جیسا کہ اپنے بزرگوں سے برابر سنتا رہا۔

مجھے عرض کرنے دیجیے کہ یہ آویزش خالص نظریاتی جنگ تھی۔ میں تفصیلات میں تو ہرگز نہ جاؤں گا اس لئے کہ وہ ایک دل خراش تاریخ کا باب ہے۔ لیکن اپنے علم و مطالعہ کی بنیاد پر اتنا ضرور عرض کر دوں گا کہ جو دیوبند حضرت حاجی عابد حسین المغفور کی زیر تربیت بن رہا تھا وہ یقیناً اس دیوبند سے مختلف ہوتا جس کا تعارف اور شہرت عالم اسلام سے گذر کر اقصائے عالم تک پہنچ چکی ہے۔ (ص:۴۹۔ ماہنامہ البلاغ کراچی، ذوالحجہ ۱۳۸۸ھ/ مارچ ۱۹۶۹ء۔ از مولانا انظر شاہ کشمیری استاذ دارالعلوم دیوبند)

''چوں کہ لوگوں کے دلوں میں خلوص نہیں رہا اس لئے اختلافات رونما ہوتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک وقت وہ آیا کہ آپ (حاجی صاحب) مدرسہ کے کاروبار سے علیحدہ ہو گئے اور فرمایا کہ اب للٰہیت نہ رہی بلکہ نفسانیت آ گئی۔ فقیر کو ان سب باتوں سے کیا غرض؟۔ (ص:۶۷۔ تذکرۃ العابدین از مولانا نذیر احمد دیوبندی)

''سمجھنے کے لئے صرف اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ چھتہ کی مسجد جہاں سے دارالعلوم کی ابتدا ہوتی ہے حضرت حاجی صاحب کی نشست گاہ یہی مقدس عمارت ہے۔ اس مسجد میں رمضان المبارک کے چاروں جمعوں میں اب تک میلاد، حضرت حاجی صاحب کی یاد میں جاری ہے۔ میں نے کیا لکھا بس اس اجمال میں نکتہ سنج ان ساری تفصیلات کو پڑھ لیں جسے میں نے کم از کم تاریخ

نگاری کے تلخ فریضہ کے قطعاً خلاف سنانے سے پہلو بچالیا۔ (حاشیہ۔ص:۵۰۔ ماہنامہ البلاغ کراچی۔ذوالحجہ ۱۳۸۸ھ/ مارچ ۱۹۶۹ء بقلم مولانا انظر شاہ کشمیری)

''——اکابر دیوبند جن کی ابتدا میرے خیال میں سیدنا الامام مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور فقیہ اکبر مولانا رشید احمد گنگوہی سے ہے——دیو بندیت کی ابتدا حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے کرنے کی بجائے مذکورہ بالا دو عظیم انسانوں سے کرتا ہوں—— (ص:۴۸۔ ماہنامہ البلاغ کراچی، ذوالحجہ ۱۳۸۸ھ/ مارچ ۱۹۶۹ء بقلم مولانا انظر شاہ کشمیری)

''ہمارے اکابر حضرت گنگوہی وحضرت تھانوی نے جو دین قائم کیا تھا اس کو مضبوطی سے تھام لو۔ اب رشید و قاسم پیدا ہونے سے رہے۔ بس ان کے اتباع میں لگ جاؤ۔ (ارشاد شیخ زکریا سہارن پوری در مجلس ۱۹ر رمضان المبارک ۱۳۹۰ھ بموجودگی مولانا محمد منظور نعمانی ومولانا ابوالحسن علی ندوی، ص ۱۲۶۔ صحبتے با اولیاء۔ مرتبہ تقی الدین ندوی مظاہری، مطبوعہ مجلس معارف سرکیس، سورت، گجرات۔ طبع اول ۱۳۹۲ھ/ ۱۹۷۲ء)

معروف دیوبندی عالم مولانا خالد محمود (مانچسٹر، برطانیہ) نے مطالعۂ بریلویت کے نام سے پانچ جلدوں پر مشتمل جو کتاب تحریر کی ہے اسے پاک و ہند کے دیوبندی ناشرین شایع کر چکے ہیں۔ مسلک اھل سنت کے خلاف کذب وافترا اور دجل وتلبیس کا اسے شرمناک نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسی کتاب کی جلد اول اور جلد سوم سے اخذ و اقتباس کر کے مضمون نگار نے سارے الزامات واتہامات کا اعادہ کیا ہے۔ اور چوں کہ علماے دیوبند اسے اپنے نزدیک معتمد و مستند نہیں بلکہ قابل فخر کتاب سمجھ رہے ہیں اس لئے ہم نے اس کے منقولہ الزامات واتہامات کے جواب کی ضرورت سمجھی ورنہ مضمون نگار کی اپنی کوئی بات ہوتی تو اسے ہم قابلِ التفات نہیں سمجھتے۔

مولانا محمد سالم قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند اس مطالعۂ بریلویت کی تقریظ (محررہ ۶ر رمضان ۱۴۱۷ھ/ ۱۶ر جنوری ۱۹۹۷ء) میں رقم طراز ہیں۔

''انھیں خصوصی امتیازات کے ساتھ علامہ خالد محمود زید مجدہ نے پیش نظر کتاب ''مطالعۂ بریلویت'' کا عمیق ترین دینی، علمی، فکری، اخلاقی اور تاریخی بنیادوں پر جائزہ لیا ہے جسے عصرِ رواں

میں ایک تاریخ ساز دینی خدمت کے عنوان سے یاد کیا جاسکتا ہے۔اور ادارہ حافظی بکڈپو دیوبند کے اس علمی سرمایہ کے شایع کرنے کو اگر عظیم علمی احسان سے تعبیر کیا جائے تو طالبینِ حق کی نگاہوں میں اسے یقیناً مبالغہ نہیں کہا جائے گا۔(مطالعۂ بریلویت جلد اول مطبوعہ حافظی بکڈپو دیوبند)

اس مطالعۂ بریلویت کے مؤلف مولانا خالد محمود کی ایک بوالعجبی و افترا پردازی اور اندھی دشمنی کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیں جس سے بخوبی اندازہ ہوجائے گا کہ علم وعقل و دیانت و تاریخ کو بالائے طاق رکھ کر اس کے اندر کیا کیا گل کھلائے گئے ہوں گے۔

شہید حریت حضرت مولانا سید کفایت علی کافؔی مرادآبادی کو انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے مرادآباد میں شارعِ عام پر پھانسی دے دی تھی اور آپ نے نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم گنگناتے ہوئے اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کردی۔ان سے اظہار عقیدت اور ان کی نعت گوئی کو خراج محبت پیش کرتے ہوئے امام احمد رضا بریلوی نے اپنے ایک شعر میں فرمایا کہ حضرت کافؔی سلطان نعت گویاں ہیں اور ان شاء اللہ میں آپ کا وزیر اعظم ہوں۔اس مفہوم کو مسخ کرتے ہوئے اور امام احمد رضا سے اپنی اندھی دشمنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مولانا خالد محمود لکھتے ہیں:

”مولانا احمد رضا خاں ان دنوں کن امیدوں سے تھے اسے انھیں کی زبان میں سنیے۔شاعر تھے بات اگل دی۔

کافؔی سلطانِ نعت گویاں ہے رضؔا
اِن شاء اللہ میں وزیرِ اعظم

(سلیس): اے رضا ہم نعت خوانوں (بریلویوں) کو حکومت کی سرپرستی کافی ہے۔ان شاء اللہ کسی نہ کسی وقت ضرور وزیر اعظم بنوں گا۔

ہم نے تاویل کرنے کی کوشش کی۔ہوسکتا ہے شاعری کی وزارت عظمٰی مراد ہو۔مگر معلوم ہوا کہ شاعری میں تو آپ اپنے آپ کو وزیر نہیں بادشاہ سمجھتے تھے۔جو شخص اپنے آپ کو بالفعل بادشاہ سمجھتا ہو وہ وزارت کی تمنا کیسے کرے گا؟ پس ان شاء اللہ کے ساتھ جس وزارت کی امید تھی وہ شریف کی حمایت اور انگریزوں کی خدمت کے صلے میں ملکی وزارت تھی۔(ص ۲۳۵ و ۲۳۶ مطالعۂ بریلویت۔جلد اول۔از خالد محمود، حافظی کتب خانہ دیوبند)

اردو نعتیہ شاعری کے دو عظیم شعرا حضرت مولانا سید کفایت علی کافی مرادآبادی (شہادت

۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء) اور حضرت مولانا حسن رضا بریلوی (وصال ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء) شاگرد داغ دہلوی کا نعتیہ کلام امام احمد رضا بریلوی نے نہایت پسند فرماتے تھے۔ چنانچہ وہ خود ارشاد فرماتے ہیں۔

سوا دو کے کلام کے کسی کا کلام قصداً میں نہیں سنتا۔ مولانا کافی اور حسن میاں مرحوم کا کلام اول سے آخر تک شریعت کے دائرے میں ہے۔ (ص ۱۴۱۔ الملفوظ حصہ دوم۔ مطبوعہ کراچی)

یہی وجہ ہے کہ مولانا کافی مرادآبادی کو سلطانِ نعت گویاں اور اپنے آپ کو ان کا وزیر اعظم قرار دیتے ہوئے امام احمد رضا بریلوی نے اس طرح ارشاد فرمایا ہے:

مہکا ہے مری بوئے دہن سے عالم — یاں نغمۂ شیریں نہیں تلخی سے بہم
کافی سلطانِ نعت گویاں ہے رضا — اِن شاء اللہ میں وزیر اعظم

مولانا کافی مرادآبادی عاشق رسول، عالم و فاضل، طبیب و حکیم، اعلیٰ درجہ کے نعت گو شاعر، اور صف اول کے مجاہدین میں سے تھے۔ حضرت شاہ ابو سعید مجددی رام پوری (وصال ۱۲۴۹ھ/ ۱۸۱۱ء) شاگرد حضرت مولانا رفیع الدین دہلوی و حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے علم حدیث کی تکمیل کی تھی۔ فن شاعری میں شیخ مہدی علی ذکی مرادآبادی (متوفی ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء) شاگرد امام بخش ناسخ کے شاگرد تھے۔ دیوان کافی اور کئی تصنیفات و تراجم آپ کی یادگار ہیں۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے وقت آپ نے برطانوی سامراج کے خلاف نمایاں و قائدانہ کردار ادا کیا۔ انگریزوں کے خلاف آپ نے فتویٰ صادر فرمایا تھا۔ مرادآباد جیل کے پاس مجمع عام کے سامنے جس وقت آپ کو انگریزوں کے حکم سے پھانسی دی گئی اس وقت آپ نے ترنم کے ساتھ یہ نعت رسول پڑھتے ہوئے موت کا استقبال کیا:

کوئی گل باقی رہے گا، نَے چمن رہ جائے گا — پر رسول اللہ کا دین حَسن رہ جائے گا
ہم صفیرو! باغ میں ہے کوئی دم کا چہچہا — بلبلیں اُڑ جائیں گی، سونا چمن رہ جائے گا
اَطلس و کمخواب کی پوشاک پر نازاں نہ ہو — اس تنِ بے جان پر، خاکی کفن رہ جائے گا
جو پڑھے گا صاحبِ لولاک کے اوپر درود — آگ سے محفوظ، اس کا تن بدن رہ جائے گا

سب فنا ہو جائیں گے کافی ولیکن حشر تک
نعتِ حضرت کا زبانوں پر سخن رہ جائے گا

اب سہ روزہ دعوت نئی دہلی کے مضمون نگار کے اہم نکات بلکہ الزامات کا تحقیقی جائزہ لینے کے لئے ان کا نمبر وار خلاصہ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) مرزا غلام احمد قادیانی (۲) تینوں علماے اہل سنت یعنی مولانا احمد رضا بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء) وعلامہ فضل رسول بدایونی (وصال ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء) وشیخ احمد بن زینی دحلان شافعی مکی (وصال ۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۶ء) کی مبینہ انگریز نوازی۔ (۳) دارالاسلام اور جہاد (۴) ترکِ موالات کی مخالفت (۵) عام مسلمانوں میں تفرقہ اوران کی تکفیر (۶) انگریزوں سے چندہ وصولی (۷) مولانا احمد رضا اور شیخ احمد بن زینی دحلان کی خفیہ ملاقات (۸) مولانا احمد رضا کی تین کتابیں (۹) علامہ فضل رسول بدایونی کی تین کتابیں (۱۰) شیخ احمد بن زینی دحلان کی خلاصۃ الکلام (۱۱) محمد حسین بٹالوی ونذیر حسین دہلوی کی ردِّ قادنیت کے سلسلے میں تعریف۔

ہر سوال کا جواب اور ہر الزام کی حقیقت نمبر وار درج کی جارہی ہے جس سے مضمون نگار اور ان کے سرپرستوں وہمنواؤں کا بنایا ہوا شیش محل اس طرح چکنا چور ہوجائے گا کہ اس کے ٹکڑے زمین پر آنے سے پہلے ہوا ہی میں تحلیل ہو کر رہ جائیں گے۔ اِن شاءاللہ

(۱) مرزا غلام احمد قادیانی (پیدائش ۱۲۵۶ھ/ فروری ۱۸۳۵ء۔ موت ربیع الاخر ۱۳۲۶ھ/ مئی ۱۹۰۸ء بمرض ہیضہ وطاعون درلاہور) ہندوستان کا نامور کذاب ودجال گذرا ہے جس نے ایک طرف شریعت اسلامیہ کے احکام ومسائل کو مسخ کرنے کی مذموم کوشش کی تو دوسری جانب اس نے عہد بہ عہد ودرجہ بہ درجہ مجددیت ومحدثیت ومہدویت ومسیحیت ونبوت کا دعویٰ کیا جس کی اولین بنیاد یہ ہے کہ وہ مراق و مالیخولیا کا مریض تھا اور دوسری بنیاد یہ ہے کہ اسے برطانوی سامراج کی درپردہ سرپرستی وپشت پناہی حاصل تھی۔

اس ظالم دجال نے انگریزوں کا تقرب واعتماد حاصل کرنے کے لئے فریضۂ جہاد کو ہی بالکل ساقط کرڈالا۔ عدم استطاعت وقدرت کی بنیاد پر عدمِ فرضیت کی بات اس نے نہیں کہی بلکہ یہ کہا اور لکھا کہ اب کبھی بھی کسی مسلمان پر جہاد فرض نہیں ہوگا۔

علامہ فضل رسول بدایونی کی کتاب "المعتقد المنتقد" (سالِ تالیف ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳ء) پر امام احمد رضا بریلوی نے المعتمد المستند بناء نجاۃ الابد (سالِ تالیف ۱۳۲۰ھ/ ۱۹۰۲ء) کے

نام سے ایک حاشیہ لکھا جس میں مرزا غلام احمد قادیانی کی کفریات شمار کراتے ہوئے امام احمد رضا بریلوی لکھتے ہیں:

''اس کے علاوہ اس کے بہت سے ملعون کفر ہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس کے اور تمام دجالوں کے شر سے محفوظ فرمائے۔ (ص ۲۳۹۔ المعتمد المستند بناء نجاۃ الابد۔ مکتبہ حامدیہ لاہور)
حُسام الحرمین علی منحر الکفر والمین (۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۵ء) میں علمائے حرمین سے آپ نے جو تحریری تصدیقات حاصل کیں ان میں مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے ماننے والوں کی صراحۃً تکفیر ہے۔
ایک استفتاء کے جواب میں امام احمد رضا بریلوی لکھتے ہیں کہ
''مجدد کا کم از کم مسلمان ہونا تو ضروری ہے اور قادیانی کافر و مرتد تھا۔''
(فتاویٰ رضویہ جلد ششم مطبوعہ مبارکپور اعظم گڑھ یو پی)

مضمون نگار کا یہ لکھنا کہ ''قادیانی تحریک اور رضا خانی تحریک میں کوئی خاص فرق نہیں'' محض لغو و باطل ہے۔ شاعر مشرق ڈاکٹر اقبال کی تحقیق یہ ہے کہ:

''قادیان اور دیوبند اگر چہ ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن دونوں کا سرچشمہ ایک ہے اور دونوں اس تحریک کی پیداوار ہیں جسے عرف عام میں ''وھابیت'' کہا جاتا ہے۔ (ص: ۲۶۲۔ اقبال کے حضور۔ اقبال اکیڈمی کراچی ۱۹۷۱ء۔ از نذیر نیازی)

دارالعلوم دیوبند اپنے بانی حاجی سید عابد حسین (وصال ۱۳۳۱ھ/ ۱۹۱۳ء) کی سرپرستی و نگرانی سے آزاد ہونے کے بعد صرف مرکز وھابیت نہیں بنا بلکہ وہ ایک زمانہ تک کانگریسی نظریات کا سینٹر بھی تھا۔ اور گاندھی کی پالیسی کا عربی میں ترجمہ کرکے کانگریس کو ایسے ترجمان فراہم کرتا تھا جو بقول اکبر الہ آبادی:

یہ کانگریسی ملا میں کیا بتاؤں کیا ہیں
گاندھی کی پالیسی کا عربی میں ترجمہ ہیں

چنانچہ مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندی سابق صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند (متوفی ۱۳۶۹ھ/ ۱۹۴۹ء) دارالعلوم دیوبند کی سیاسی تیز روی اور کانگریس نوازی کا ذکر کرتے ہوئے اپنے یہ تأثرات وواقعات بیان کرتے ہیں۔

''درسِ حدیث میں خدا اور رسول کی اطاعت کا درس نہیں دیا جاتا اب تفسیر جلالین، بیضاوی اور درس حدیث میں ''کانگریسیت'' کا سبق پڑھایا جانے لگا ہے۔

مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو کے کارناموں کی نہ صرف تعریف کی جاتی ہے بلکہ ان کی تائید قرآن وحدیث سے پیش کی جانے لگی ہے۔

درس حدیث کا شاید ہی کوئی دن ایسا گذرتا ہوگا جس میں کانگریس کا تذکرہ اور اس میں شمولیت کی تلقین نہ کی جاتی ہو۔ ان ہی تقریروں اور رات دن کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج دارالعلوم نہ صرف ہنود کا مداح ہے بلکہ ان کے رنگ میں بہت کچھ رنگا جاچکا ہے۔ (اخبار وحدت دہلی۔ شمارہ ۲۳ر دسمبر ۱۹۳۷ء۔ بحوالہ اخبار دبدبۂ سکندری رام پور۔ ص ۴۔ شمارہ ۵ر نومبر ۱۹۴۵ء)

قوم پرستی کا ترانہ گاتے ہوئے ایک مضمون نگار یوں رطب اللسان ہیں۔

''گاندھی جی کی آواز ہندوستان کی آواز تھی جس کی بے پناہ تاثیر اور بے پناہ طاقت کا سبب یہی قدیم نظریہ تھا کہ ''قومیں اوطان سے بنتی ہیں'' مذاہب سے نہیں بنتی ہیں۔

چنانچہ جو آواز گاندھی جی کے لبوں سے بلند ہوئی وہی آواز حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے الھلال کے صفحات سے بلند کی اور وہی آواز شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے پاکیزہ لبوں سے سنی گئی۔ (ص ۱۰۷۔ عظیم مدنی نمبر۔ روزنامہ نئی دنیا دہلی۔ شمارہ ۲۵ر نومبر ۱۹۵۹ء)

(۲) علامہ فضل رسول بدیوانی وشیخ احمد بن زینی دحلان مکی وامام احمد رضا بریلوی علیہم الرحمہ و الرضوان میں قدرِ مشترک یہ تھی کہ تینوں اکابر علمائے اہل سنت تھے۔ ان کی عظیم دینی وعلمی خدمات ہیں۔ وھابیت ونجدیت کے یہ حضرات شدید مخالف تھے۔ حجاز مقدس سے ہندوستان تک انھوں نے فتنۂ وھابیت کا تعاقب کیا اور اس کا قلع قمع کرنے میں اپنی بے پناہ توانائی صرف کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خلاف فرقۂ وھابیہ نے طرح طرح کی ہرزہ سرائی والزام تراشی کی۔

شیخ احمد زینی دحلان (متوفی ۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۶ء۔ مدفون جنت البقیع مدینہ طیبہ) ترکی عہد حکومت میں مفتی شافعیہ اور مکہ مکرمہ کے شیخ الاسلام تھے۔ ترکی عہد ہی میں مدینہ طیبہ میں آپ کا

انتقال ہوا۔ دنیا جانتی ہے کہ برطانوی سامراج نے ترکی اقتدار کے خاتمہ کے لئے آل سعود کو استعمال کیا اور سعودیوں کی مالی و عسکری مدد کر کے حجاز مقدس سے ۱۹۲۴ء کے اواخر اور ۱۹۲۵ء کے اوائل میں ترکوں کو نکال باہر کیا۔ برطانوی جاسوس ہمفرے نے شیخ محمد بن عبدالوھاب نجدی (وفات ۱۲۰۶ھ/ ۱۷۹۲ء) کی ذہن سازی کر کے اس کے ہاتھوں وھابی فکر و تحریک کی بنیاد ڈالی اور دوسرے برطانوی جاسوس کرنل لارنس نے عربوں کو عموماً اور آلِ سعود کو خصوصاً ترکوں سے آمادۂ پیکار کرنے کی راہیں ہموار کیں اور کئی سو سالہ عظیم الشان ترکی حکومت کا خاتمہ کیا۔

دفع الزام و ازالۂ شبہات کے لئے علامہ فضل رسول بدایونی کے اجمالی خاندانی پس منظر کے ساتھ مندرجہ ذیل حقائق ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت دانیال قطری ۵۹۹ھ میں قطب الدین ایبک کے ساتھ بدایوں تشریف لائے۔ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیا کے والد حضرت خواجہ احمد بخاری جب بدایوں کے عہدۂ قضا سے مستعفی ہوئے تو آپ کو بدایوں کا منصب قضا پیش کیا گیا جسے آپ نے قبول فرمایا۔ آپ کو حضرت خواجہ عثمان ھارونی چشتی مرشدِ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری سے شرفِ بیعت و خلافت حاصل تھا۔ ۲۹ر ربیع الاخر ۶۱۸ھ میں بدایوں ہی میں آپ کا وصال ہوا۔ آپ کے فرزند ارجمند حضرت رکن الدین بھی عالم و فاضل تھے جن کا خطاب سلطان شمس الدین تھا۔ والد ماجد حضرت دانیال قطری کے وصال کے بعد بدایوں کے قاضی مقرر ہوئے۔ شیخ سلطان شہید چشتی اور شیخ جلال الدین تبریزی سے ارادت و بیعت حاصل کی۔ آپ دہلی کے عہدۂ قاضی القضاۃ پر بھی فائز ہوئے تھے۔ ۲۱ر جمادی الآخرۃ ۶۳۸ھ میں آپ ''شہید طریق'' (۶۳۸ھ) ہوئے۔ اس طرح سلسلہ بہ سلسلہ و عہد بہ عہد یہ خانوادہ دینی و علمی مجد و شرف کا حامل اور مسلمانوں کی نظر میں ہمیشہ معزز و محترم رہا۔ اس خانوادہ کا شجرۂ نسب خلیفۂ سوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے منسلک ہے۔

اسی خانوادہ کے حضرت مولانا عبدالحمید عثمانی قادری بدایونی (ولادت ۱۷ر جمادی الاولیٰ ۱۱۵۲ھ۔ وصال ۱۷ر جمادی الاولیٰ ۱۲۳۳ھ) تھے جنھیں شمس العارفین حضرت سید شاہ آل احمد اچھے میاں قادری برکاتی مارہروی (ولادت ۲۸ر رمضان المبارک ۱۱۶۰ھ مطابق ۴ر اکتوبر ۱۷۴۷ء۔ وصال ۱۷ر ربیع الاول ۱۲۳۵ھ/ مطابق جنوری ۱۸۲۰ء) سے بیعت و خلافت حاصل تھی۔ انھیں کے بلند اقبال فرزند حضرت شاہ عین الحق عبدالمجید عثمانی قادری بدایونی ہیں جن کی

ولادت ۲۹ رمضان المبارک ۱۱۷۷ھ میں ہوئی اور ۷ ارمحرم الحرام ۱۲۳۶ھ/ ۱۸۲۱ء میں آپ کا وصال ہوا۔ حضرت شمس العارفین مارھروی سے آپ کو بھی بیعت و اجازت وخلافت کا فیضان حاصل ہوا اور سلسلۂ قادریہ برکاتیہ کو آپ کی ذات سے کافی فروغ ملا۔ حضرت شاہ عین الحق عبدالمجید بدایونی ہی کے فرزند سیف اللہ المسلول حضرت مولانا معین الحق فضل رسول عثمانی قادری بدایونی (ولادت صفر المظفر ۱۲۱۳ھ/ ۔ وصال ۲ رجمادی الآخرۃ ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء) ہیں جن کے علم وفضل اور علوے مرتبت کا ایک زمانہ معترف ہے۔

حضرت مولانا فضل رسول بدایونی حضرت مولانا نورالحق فرنگی محلی لکھنوی (وصال ربیع الاول ۱۲۳۸ھ/ دسمبر ۱۸۲۲ء) کے خصوصی شاگرد ہیں اور سرزمین حجاز پہنچ کر آپ نے الشیخ عابد سندھی مدنی (وصال ۱۲۵۷ھ/ ۱۸۴۱ء) سے تفسیر اور الشیخ عبداللہ بن عبدالرحمٰن سراج حنفی مکی (وصال ۱۲۶۴ھ/ ۱۸۴۸ء) سے حدیث کی سند حاصل کی۔ حضرت مولانا بدایونی اپنے والد ماجد کے مرید اور آپ کے خلیفہ وجانشین ہوئے۔ آپ نے کئی بار حج وزیارتِ حرمین کیا۔ بغداد مقدسہ کی بھی زیارت کی۔ نقیب الاشراف السید علی بن سلمان القادری البغدادی (وصال ۱۲۸۹ھ) نے آپ کو اجازت وخلافت سے بھی نوازا۔ آپ کی بیدار بختی تھی کہ سرکار دو عالم ﷺ کی زیارت سے خواب میں مشرف ہوئے۔ اسی طرح سیدنا الشیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی بغدادی رضی اللہ عنہ کی بھی آپ نے خواب میں زیارت کی۔

حضرت مولانا فضل رسول بدایونی نے حضرت شمس العارفین مارہروی کی ہدایت کے مطابق علم طب بھی سیکھا اور حکیم سید ببر علی موھانی سے دھول پور (راجپوتانہ) میں طب پڑھ کر ماہر طبیب بن گئے۔ اللہ نے آپ کو دست شفا سے نوازا تھا۔ اور متبحر عالم و فاضل و شیخ طریقت ہونے کے ساتھ آپ ایک مشہور طبیب بھی تھے۔ ایک بار ۱۲۶۸ھ میں آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر (متوفی ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۲ء) کی بیٹی بیمار ہوگئی تو اس نے آپ کو دہلی مدعو کر کے اپنی بیٹی کا علاج کرایا جس سے اس کو شفا مل گئی۔ بہادر شاہ ظفر نے کچھ نذر پیش کرنی چاہی تو آپ نے اسے قبول کرنے کی بجائے اپنی اس خواہش کو اظہار کیا کہ اگر آپ مجھے کچھ دینا ہی چاہتے ہیں تو رسول اکرم ﷺ کا موئے مبارک جو بطور تبرک محفوظ وموجود ہے وہ مجھے عنایت کر دیں۔ چنانچہ بہادر شاہ ظفر نے آپ کی خواہش کے احترام میں وہ موئے مبارک آپ کو دے دیا جسے ہاتھی کے

اوپر ادب واحترام کے ساتھ رکھ کر دہلی سے بدایوں لے جایا گیا اور عرس قادری بدایوں میں آج بھی ہر سال اس کی زیارت کرائی جاتی ہے۔

بہادر شاہ ظفر نے میلاد و قیام اور فاتحہ وشیرینی کے تعلق سے بزبان فارسی آپ سے ایک استفتاء کیا تھا جس کا آپ نے تفصیلی و تحقیقی جواب تحریر فرمایا۔ مولانا محمد یعقوب ضیاء القادری بدایونی کی مرتبہ تاریخ اکمل التاریخ حصہ دوم ص ۱۵۴ تا ص ۱۶۹ میں اسے ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ اثباتِ عقاید اھل سنت وتردید افکار وفرق باطلہ پر مشتمل علامہ فضل رسول بدایونی کی مشہور کتاب ''المعتقد المنتقد'' پر علامہ فضل حق خیر آبادی ومفتی صدر الدین آزردہ دہلوی و شاہ احمد سعید نقش بندی مجددی کی تحریری تصدیقات ہیں۔ یہ کتاب کئی بار چھپ چکی ہے۔

مولانا محمود احمد قادری رفاقتی مظفر پوری مؤلف تذکرۂ علمائے اہل سنت لکھتے ہیں، ''یہ حقیقت ہے کہ حضرت سیف اللہ المسلول (مولانا فضل رسول بدایونی) صفِ اول کے ان ممتاز علما ومشائخ میں تھے جنھوں نے فتنۂ وھابیت کے سد باب کے لئے کوششِ بلیغ فرمائی۔ آپ کی اور علامہ فضل حق خیر آبادی کی ذات قدس صفات کی وجہ سے دور اول میں اہل باطل کے مقابلے میں اھل حق ''بدایونی'' اور ''خیر آبادی'' کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ (ص ۱۹۴۔ تذکرۂ علمائے اہل سنت، مطبوعہ کان پور ۱۳۹۱ھ/ ۱۹۷۱ء مرتبہ مولانا محمود احمد قادری فاقتی)

محبّ الرسول حضرت مولانا عبد القادر عثمانی بدایونی (ولادت ۱۷ر رجب ۱۲۵۳ھ/ ۱۸۳۷ء۔ وصال ۱۳۱۹ھ/ ۱۹۰۱ء) آپ کے نامور فرزند اور علامہ فضل حق خیر آبادی کے شاگرد رشید ہیں جنھیں خاتم الاکابر حضرت سید شاہ آل رسول احمدی مارھروی (وصال ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۹ء) سے بیعت واجازت وخلافت حاصل تھی۔ اور آپ نے بھی اپنے والد ماجد مولانا فضل رسول بدایونی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے الحاد و بے دینی و وھابیت و صلح کلیت کا ردِ بلیغ کیا اور فتنۂ ندویت کے استیصال میں قائدانہ کردار ادا کیا۔ حضرت مولانا مطیع الرسول محمد عبد المقتدر عثمانی بدایونی (ولادت ۱۱ر جمادی الآخرہ ۱۲۸۳ھ۔ وصال ۲۵ر محرم ۱۳۳۴ھ/ ۱۹۱۵ء) اور حضرت مولانا عاشق الرسول محمد عبد القدیر عثمانی بدایونی (ولادت ۱۱ر شوال ۱۳۱۱ھ وصال ۳ر شوال ۱۳۷۹ھ/ مارچ ۱۹۶۰ء) آپ کے فرزندانِ گرامی قدر تھے۔

حضرت مولانا فضل رسول عثمانی بدایونی کے پوتے حضرت مولانا عبد القدیر بدایونی چودہ

سال تک حیدرآباد دکن کی عدالتِ عالیہ میں مفتیِ اعظم کے منصب پر فائز رہے۔ مسجد حرام، مسجد نبوی، مسجد اقصیٰ تینوں مقدس مساجد میں آپ کو مختلف مواقع پر امامت کا شرف ملا۔ فلسطین کے ایک دورہ کے وقت مفتی اعظم فلسطین سید امین الحسینی نے ایک جلوس کے ساتھ شہر سے باہر آ کر آپ کا استقبال کیا۔

اوائل عہد میں حضرت مولانا فضل رسول بدایونی کے بارے میں یہ روایت ملتی ہے کہ آپ اپنے دور میں بدایوں کے صدر مقام سہسوان میں سر رشتہ عدالت تھے۔ اسی طرح بنارس کے بھی کچھ دن صدر الصدور رہے۔ مطالعۂ بریلویت کے مؤلف خالد محمود (مانچسٹر) نے اسی بات کو اچھالنے کی کوشش کی ہے اور سہ روزہ دعوت نئی دہلی کے مضمون نگار نے جسے اس طرح لکھا ہے— ''اکمل التاریخ کی جلد دوم دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ فضل رسول کو انگریز حکومت سے ۲۶۰ روپے ماہوار، نواب محی الدولہ کی کوششوں سے ملنے شروع ہوئے۔'' (سہ روزہ دعوت نئی دہلی ۲۵۔ ۷؍ستمبر ۲۰۰۶ء)

مضمون نگار اور ان کے ہم نواؤں میں سے تقریباً سبھی ہوائی قلم کار اکمل التاریخ کی زیارت سے غالباً محروم ہیں۔ آیئے ہم اصل عبارت کی شکل میں اس کی زیارت کراتے ہیں۔ مولانا محمد یعقوب ضیاء قادری بدایونی (ولادت ۲۶؍رجب ۱۳۱۰ھ/ ۲ جون ۱۸۸۳ء در بدایوں، وصال ۱۲؍جمادی لاخرہ ۱۳۹۰ھ/ ۱۵؍اگست ۱۹۷۰ء در کراچی) تاریخی نام ''سوانحِ فضل رسول'' (۱۳۳۱ھ) اکمل التاریخ (۱۳۳۳ھ) حصہ دوم میں بہ عنوان ''علائقِ دنیوی'' لکھتے ہیں:

''بنارس سے سلسلۂ تعلق ترک کر کے جب آپ پھر وطن تشریف لائے اور آپ کی خداداد قابلیت نے وطن کی چہار دیواری سے نکل کر شہرت و ناموری کے علمی سبزہ زاروں میں گُل گشت شروع کی۔ حکام وقت اور والیانِ ملک نے قدر دانی اور مرتبہ شناسی کے اظہار کے لئے دستِ طلب بڑھانا شروع کر دیے اور آپ کی خدمات کو سرکاری کاموں کی انجام رسی کے لئے مانگنا چاہا۔ آپ نے کچھ دنوں محکمۂ افتاء (جو اس وقت گورنمنٹ میں قائم تھا اور بطور مفتی کے علماء کو عہدے دیے جاتے تھے) کو اپنے کلکِ انصاف جو کی روشنائی سے فروغ بخشا۔ اسی دوران ریاستِ دکن سے محکمۂ قضا کی صدارت کا حکم آیا۔ آپ نے اول الذکر صیغہ سے دست بردار ہو کر ریاست کو روانگی کا تہیہ کر لیا۔ مگر بعد میں بعدِ مسافت کے لحاظ سے وہاں جانا پسند نہ فرمایا۔

حاکم ضلع (بدایوں) کو اپنی کچہری میں عہدۂ جلیلہ سر رشتہ داری کے لئے کسی معزز ممتاز فائق

الاقران والعلم کی تلاش ہوئی۔ضلع بھر میں اس قابلیت کا کوئی شخص موجود نہ تھا۔ ہر پھر کر آپ پر ہی نظر پڑتی تھی۔آخر بہ کمالِ اصرار آپ کو رضامند کیا گیا۔اس وقت ضلع کا صدر مقام سہسوان تھا جہاں اب تحصیل و منصفی کی دو کچہریاں موجود ہیں۔آپ بدایوں سے سہسوان تشریف لے گئے اور غالباً ساڑھے تین سال تک آپ نے جوہرِ ذاتی سے حکام وقت کو اپنا گرویدۂ لیاقت بنائے رکھا۔شیخ محمد افضل بدایونی آپ کی نیابت میں کام کرتے تھے۔(ص:۵۱۔اکمل التاریخ حصہ دوم۔مرتبہ محمد یعقوب ضیا قادری بدایونی، مطبع قادری بدایوں)

"پوری تنخواہ مصارفِ مہمان نوازی میں صرف ہو جاتی۔بعض اوقات خرچ کے لئے مکان سے بھی کچھ طلب کر لیا جاتا۔درس و تدریس کا سلسلہ وہاں (سہسوان) بھی برابر جاری رہتا۔اکثر سہسوان کے علم دوست شرفاء کو آپ سے اور آپ کے تلامذہ سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔

جب آپ نے اس سلسلہ سے بھی قطع تعلق کر لیا۔مدرسہ عالیہ (بدایوں) میں مستقل طور پر حلقہ استفادہ کا اجرا فرمایا۔برابر اہل سہسوان تحصیل علم کی دھن میں بدایوں آتے رہے اور حضرت تاج الفحول (مولانا عبدالقادر عثمانی بدایونی) اور مولانا فیض احمد صاحب (عثمانی بدایونی) کی شاگردی کا فخر حاصل کیا۔

مشائخانہ سیاحی میں جب زیادہ تر قیام حیدرآباد دکن میں (جہاں کی باطنی خدمت سرکار غوثیت مآب کی جانب سے آپ کے سپرد تھی) ہوا۔نواب آصف جاہ خلد مکانی اور تمام امراو اراکین ریاست کو آپ سے عقیدت و ارادت ہوئی۔آپ کے مصارف کے لئے عالی جناب نواب محی الدولہ بہادر خاص مصاحب حضور نظام سابق جنت آشیانی نے کوشش کر کے سترہ روپیہ یومیہ مقرر کرائے لیکن اسی زمانہ میں چند مریدین حضرت زبدۃ العرفاء حافظ محمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ صاحبِ سجادۂ خانقاہِ خیرآباد (اودھ) تقررِ یومیہ کی کوشش اور فکر میں تھے۔اکثر حاضرِ خدمت ہوا کرتے تھے۔آپ نے ان کو مغموم و کبیدہ خاطر دیکھ کر اپنی علوئے ہمتی سے اس یومیہ میں سے چھ روپے ان کے نام کر دیے اور مستقل طور پر خانقاہِ خیرآباد (اودھ) کے لئے یومیہ منتقل کرادیا۔

اس وقت سے یہ یومیہ اب تک گیارہ روپے روزانہ کے حساب سے ریاستِ فرخ نہاد حیدرآباد سے جاری ہے۔جس کی تعداد سرکاری سکہ سے دو سو ساٹھ روپے ماہوار کے قریب ہوتی ہے۔(ص:۵۲۔اکمل التاریخ حصہ دوم مطبوعہ بدایوں)

مذکورہ دونوں حوالوں کی کس عبارت اور کس جملہ میں انگریز داخل ہوگئے اور انگریزی حکومت سے مولانا فضل رسول بدایونی کو ماہانہ وظیفہ ملنا شروع ہوا یہ سمجھنے کی ہم نے کافی کوشش کی مگر تادمِ تحریر ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ اس زمانہ کے بہت سے جلیل القدر علماے کرام مفتی و قاضی وسر شتہ دار وصدر الصدور کے عہدے پر فائز تھے اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (وصال ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) نے بذریعۂ مولوی عبدالحی بڈھانوی (متوفی ۱۲۴۲ھ/ ۱۸۲۸ء) سرکاری ملازمت کی اجازت دے کر خود ہی ہر طرح کا راستہ صاف کر دیا تھا۔ نیز کسی عالم نے اس دور میں ہر طرح کی سرکاری ملازمت کو ناجائز بھی نہیں کہا۔

ان سب کے باوجود حضرت مولانا فضل رسول بدایونی کے والد ماجد نے سرکاری ملازمت کو خلافِ ورع وتقویٰ سمجھتے ہوئے اس پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور جب آپ نے ان سے اپنی بیعت کی خواہش ظاہر کی تو صاف فرمایا کہ تم صدر الصدور کے عہدے پر ماموررہ چکے ہو اس لئے جہاں تم صدر الصدور رہ چکے ہو وہاں جاکر مزدوری کرو اس کے بعد میں تمہیں بیعت کروں گا۔ چنانچہ حضرت مولانا بدایونی نے اپنے والد ماجد کے حکم کی تعمیل کی۔ پھر والد ماجد نے آپ کو بیعت فرمایا۔ اس کے بعد ریاضتِ شاقہ کی ھدایت فرمائی جس پر آپ نے عمل کیا تو والد ماجد نے آپ کو اجازت وخلافت سے سرفراز فرمایا۔

بالآخر آپ نے مستقل طور پر طبابت ودرس وتدریس کا مشغلہ جاری فرمایا اور طبابت کی ساری آمدنی آپ نے اپنے مدرسہ وطلبہ کے لئے وقف فرمادیا۔ بیعت وارشاد کا سلسلہ بھی جاری ہوا اور ہزاروں مسلمان آپ کے مرید ہوئے۔ بے شمار تلامذہ ہوئے۔ اور کچھ منتخب حضرات کو آپ نے اپنی اجازت وخلافت بھی عطا فرمائی۔

سنیت وحنفیت پورے خانوادۂ عثمانیہ بدایوں کا طرۂ امتیاز اور نسبتِ قادریت سرمایۂ افتخار ہے۔ یہ ایک تاریخی وعملی حقیقت ہے اور آج بھی یہ خانوادہ اپنے آبا واجداد کی اس متاعِ عزیز کو حرزِ جاں بنائے ہوئے اپنی قدیم روش پہ گامزن ہے۔ فالحمدللہ علی ذلک۔

سرکاری مناصب قبول کرنے اور سرکاری عہدوں پہ فائز ہو کر خدمات انجام دینے کا جہاں تک سوال ہے تو اس سلسلے میں باغی ہندوستان مرتبہ مولانا عبدالشاہد شیروانی علی گڑھی طبع قدیم

۱۹۴۷ء از مدینہ پریس بجنور مع مقدمہ مولانا ابوالکلام آزاد کا نظرِ ثانی شدہ جدید ایڈیشن ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء اس وقت میرے پیشِ نظر ہے۔ اس کا ایک حوالہ ملاحظہ فرمائیں جس سے مضمون نگار اور ان کے ہمنواؤں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی اور ساری حقیقت عیاں ہو کر سامنے آجائے گی۔

''مولوی کی سیاست غلام دماغ نہیں سمجھ سکتا ہے۔ انگریز سمجھتا ہے۔ سوچو اور غور کرو۔ نوے سال قبل سارے دفاتر پر اسی طبقہ کا قبضہ تھا۔ علما و مشاہیر وقت سرکاری و شاہی محکموں پر قابض تھے۔

مولانا فضل امام خیرآبادی صدر الصدور دہلی، مفتی صدر الدین خاں آزردہ صدر الصدور دہلی، مفتی عنایت احمد کاکوروی منصف و صدر امین کول و بریلی، مولانا فضل رسول بدایونی سرشتہ دار کلکٹری صدر دفتر سہسوان، مفتی انعام اللہ گوپامئوی قاضی دہلی و سرکاری وکیل الہ آباد، مولانا مفتی لطف اللہ علی گڑھی سرشتہ دار صدر امین بریلی، علامہ فضل حق خیرآبادی سرشتہ دار ریذیڈینسی دہلی و صدر الصدور لکھنؤ و مہتمم حضور تحصیل اودھ، مولانا غلام قادر گوپامئوی ناظر سرشتہ دار عدالت دیوانی و تحصیل دار گوڑ گاواں، قاضی فیض اللہ کشمیری سرشتہ دار صدر الصدور دہلی وغیرہم۔

یہ سب اپنے وقت کے بے نظیر و عدیم المثال اکابر علماء تھے۔ حکومت کی باگ ڈور انھیں کے ہاتھ میں تھی۔ مسلمانوں کی سلطنت کی بربادی ان کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ موقعہ کا انتظار تھا۔ ۱۸۵۷ء کا وقت آیا تو سب میں پیش پیش یہی حضرات تھے۔ والیانِ ریاست و اراکین دولت میں ناقوسِ حریت پھونکنے والے یہی تھے۔ عوام کو ابھارنا اور فتویٰ جہاد جاری کرنا انھیں کا کام تھا۔ اور انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد سب سے زیادہ مصائب اٹھانے والے اور آتشِ حریت میں جلنے والے یہی شمع شبستانِ آزادی کے پروانے تھے۔ انگریز نے ان کو جانا اور پہچانا، ایک ایک کر کے تمام عہدوں سے اس طبقہ کو سبک دوش اور اس گروہ کے خلاف پورا محاذ قائم کیا۔
(ص ۲۳۶۔ باغی ہندوستان از مولانا عبد الشاہد شیروانی)

نوابوں کے دربار سرکار سے وابستگی اور ان کے وظائف کا جہاں تک سوال ہے تو حیدرآباد دکن، بھوپال، رام پور، ٹونک، باندہ، فرخ آباد، ڈھاکہ، ارکاٹ وغیرہ کے مسلم نواب اپنی غفلتوں و عیش کوشیوں کے باوجود بہت سے دینی و علمی و رفاہی امور سے دلچسپی رکھتے تھے اور ارباب علم و فضل و کمال کو نوازتے بھی رہتے تھے۔ ان کے دربار، ان کے قائم کردہ مدارس و ادارے، ان کی

اعانت سے چلنے والے ادارے، ان کے مالی تعاون سے لکھی جانے والی کتابیں اور ان کی طرف سے علما و فضلا کو وظائف دیے جانے کا سلسلہ عام تھا۔ حکیم عبدالحی رائے بریلوی ناظم دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنو (متوفی ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۳ء) کی مشہور تاریخی کتاب نزہۃ الخواطر کی صرف آٹھویں جلد کی سرسری ورق گردانی سے مندرجہ ذیل معلومات حاصل ہوئیں۔

مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی کو تاریخ سندھ لکھنے پر نظام دکن کی طرف سے پانچ ہزار روپے کا انعام ملا اور پانچ سو روپے ماہانہ وظیفہ جاری ہوا۔ شیخ احمد بن نظام حیدرآبادی کو آصف اللغات لکھنے پر انعام ملا اور پچاس روپے کا ماہانہ وظیفہ جاری ہوا۔ مولانا عبدالرحمٰن بن مولانا احمد علی محدث سہارن پوری کو طب عثمانی لکھنے پر دس ہزار روپے کا انعام نظام دکن سے ملا اور دو سو روپے ماہانہ وظیفہ جاری ہوا۔

مذکورہ مقامات کے نوابوں اور ان کے یہاں کے اداروں سے کسی نہ کسی انداز سے مختلف مکاتب فکر کے فیض یاب ہونے والے علما و فضلا کے جو اسمائے گرامی کتب تاریخ میں درج ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔ مفتی محمد سعید مدراسی، شیخ محمد طیب مکی، مولانا منصور علی مرادآبادی، مولانا منور علی رام پوری، مولانا ناظر علی دیوبندی، مولانا نورالحسن بھوپالی، مولانا وحیدالزماں حیدرآبادی، مفتی یحییٰ بن ایوب پھلتی، مولانا یوسف علی لکھنوی، مولانا عبدالغنی فرخ آبادی، مولانا عبدالقادر حیدرآبادی، مولانا عبدالکریم ہزاروی، مولانا عبدالکریم بنارسی، مولانا عبداللطیف سنبھلی، مولانا عبداللہ برھان پوری، مولانا عبداللہ عمادی جون پوری، مولانا عبدالواسع امیٹھوی، مولانا عبدالوھاب بہاری، سید علی بلگرامی، مولانا علی عباس چریا کوٹی، مولانا عنایت اللہ علی گڑھی، حکیم فرزند علی شاہ آبادی، مولانا محمد سورتی، قاضی محمد بن عبدالعزیز مچھلی شہری، مولانا محمد بشیر سہسوانی، مولانا محمد حسن بن احمد حسن ٹونکی، وغیرہ۔

نواب مشتاق حسین امروہوی کا جب حیدرآباد سے تعلق ہوا تو ان کی کوشش سے حیدرآباد مرکز علما و فضلا بن گیا۔ جامعہ نظامیہ حیدرآباد کے بانی حضرت مولانا انوار اللہ حیدرآبادی خلیفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی تحریک پر اجمیر شریف کا دارالعلوم معینیہ عثمانیہ ۱۹۱۲ء میں نظام دکن نے ہی قائم کیا تھا۔ مشہور بزرگ حضرت شیخ محمد معصوم نقش بندی کو ریاست رام پور سے چار سو

روپے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ مولانا عبدالحق حقانی دہلوی مؤلف تفسیر حقانی کو حیدرآباد سے وظیفہ ملتا تھا۔ مفتی لطف اللہ علی گڑھی حیدرآباد کے صدر الصدور تھے۔ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی علی گڑھی حیدرآباد کے وزیر مذہبی امور تھے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی و مولانا حمید الدین فراہی بھی نظام دکن کے علمی ادارے کے باتنخواہ مدرس تھے۔ مولانا شبلی نعمانی کو بھی حیدرآباد سے ماہانہ سو روپے کا وظیفہ ملتا تھا۔ اسی طرح خواجہ الطاف حسین حالی کو بھی حیدرآباد سے وظیفہ ملتا تھا۔ ملکۂ بھوپال نے بھی بہت سے علما کے مشاهرے اور وظائف کا باضابطہ انتظام کیا تھا۔ سیرۃ النبی از شبلی نعمانی کے لئے بھوپال سے اچھی خاصی رقم ملی۔ نواب صدیق حسن بھوپالی اور سید سلیمان ندوی بھی بھوپال سے وابستہ تھے۔ علامہ اقبال کو بھی ریاست بھوپال نے نوازا۔ نہایت محتاط و متدین عالم مولانا محمد نعیم فرنگی محلی لکھنوی کو رام پور سے وظیفہ جاری تھا۔ ریاست رام پور و ٹونک کے مدارس سے بہت سے علما و مدرسین وابستہ تھے جنھیں مشاهره و وظیفہ ملا کرتا تھا۔ اس کی اگر تحقیق کی جائے اور تاریخ لکھی جائے تو ایک ضخیم دفتر تیار ہو جائے۔

حافظ محمد احمد فرزند مولانا محمد قاسم نانوتوی مہتمم دارالعلوم دیوبند کے بارے میں مشہور دیوبندی عالم و مؤرخ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی (متولد ۱۲۹۸ھ/ ۱۸۸۱ء۔ متوفی ۱۳۶۰ھ/ ۱۹۴۱ء) لکھتے ہیں:

> ''مدرسہ کا اہتمام حافظ صاحب کے ہاتھ سے نہ نکلا یہاں تک کہ ۳؍ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۷ھ میں خود حافظ صاحب نے دنیا چھوڑ دیا اور حیدرآباد سے واپسی میں کہ مدرسہ ہی کی ضرورت کے لئے سفر کیا تھا اسٹیشن نظام آباد پر انتقال فرما کر حیدرآباد کے مقبرۂ خطۂ صالحین میں دفن ہوئے۔ (۱۹۔ تذکرۃ الخلیل از مولانا عاشق الٰہی میرٹھی مطبوعہ میرٹھ)

مظاہر علوم سہارن پور کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''جمادی الثانیہ ۱۳۴۰ھ میں جب کہ حیدرآباد سے معقول وظیفہ مدرسہ کا مقرر ہوا تو مدرسین نے پھر ترقی چاہی کہ درحقیقت وہ حضرات کتنا ہی خرچ میں تنزلی کرتے مگر موجودہ قلیل تنخواہ میں گذر نہیں کر سکتے تھے اور مقروض ہو کر پریشان و پراگندہ دل رہتے تھے۔ (ص ۱۳۵۔ تذکرۃ الخلیل مطبوعہ میرٹھ)

علامہ فضل رسول بدایونی کے حقیقی بھانجے مولانا فیض احمد بدایونی (ولادت ۱۲۲۳ھ/ ۱۸۰۸ء) ۱۸۵۷ء کے سپہ سالار جنرل بخت خاں و مولانا احمد اللہ مدراسی و ڈاکٹر وزیر خاں اکبر آبادی و شہزادہ فیروز شاہ کے شانہ بہ شانہ برطانوی سامراج کے خلاف محاذ آرا تھے۔ پھر ایسے روپوش ہوئے کہ ان کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔

امام احمد رضا بریلوی کے اجداد میں سے بعض حضرات شاہانِ مغلیہ کے دربار سے منسلک ہو کر دادِ شجاعت دیا کرتے اور نمایاں خدمتِ دین وملت کیا کرتے تھے چنانچہ مولانا ظفر الدین قادری رضوی آپ کے ایک جد کریم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''حضرت حافظ کاظم علی خاں صاحب شہر بدایوں کے تحصیل دار تھے اور یہ عہدہ آج کل کی کلکٹری کے قائم مقام تھا۔ دوسو سواروں کی بٹالین خدمت میں رہتی تھی۔ آٹھ گاؤں جاگیر کے (مغل) شاہی دربار سے دوامی لاخراجی معافی عطا ہوئے تھے۔ وہ اس جدوجہد میں دیے گئے تھے کہ سلطنتِ مغلیہ اور انگریزوں میں جو مناقشات تھے ان کا تصفیہ ہو جائے۔ چنانچہ اسی تصفیہ کے لئے حضرت حافظ صاحب کلکتہ تشریف لے گئے تھے۔ (حیات اعلیٰ حضرت اول مطبوعہ کراچی و لاہور و بمبئی)

امام احمد رضا بریلوی کے دادا مولانا رضا علی بریلوی (وصال ۱۲۸۲ھ/ ۱۸۶۶ء) بریلی کے انگریز مخالف مجاھدین کی مدد میں پیش پیش تھے اور آپ کے اصطبل کے گھوڑے مجاھدین کے لئے وقف رہتے تھے۔ خود امام احمد رضا کا حال یہ تھا کہ لفافہ پر ہمیشہ ٹکٹ الٹا لگاتے تھے اور کہتے تھے کہ میں نے جارج پنجم کا سر نیچا کر دیا۔ زندگی بھر آپ کسی انگریز سے نہ ملے۔

ان بدایونی و بریلوی حضرات کے بارے میں آج تک ان کا کوئی قول و فعل کوئی تحریر اور کوئی ثبوت ایسا نہیں پیش کیا جا سکا جس سے ان کے دامنِ عظمت اور ان کے وقار پہ کوئی آنچ آئے۔ جب کہ دوسری طرف اس کے برعکس معاملہ ہے۔

انگریز دشمنی کا نقارہ پیٹنے والوں کا حال یہ ہے کہ ان کے اکابر اکثر و بیشتر انگریز ملازم تھے۔ مدرسہ اسلامی عربی دیوبند (قائم شدہ ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۶ء) معروف بہ دار العلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس مولانا محمد یعقوب نانوتوی (متوفی ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۵ء) ولد مولانا مملوک علی نانوتوی اجمیر کالج میں مدرس تھے پھر بنارس، بریلی اور سہارن پور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس اور پینشن یافتہ سرکاری ملازم تھے۔ مدرسہ دیوبند کے ذمہ داروں اور مدرسوں کی اکثریت ـــــ

''ایسے بزرگوں کی تھی جو گورنمنٹ کے قدیم ملازم اور حال پینشنر تھے۔ جن کے بارے میں گورنمنٹ کو شک و شبہ کرنے کی گنجائش ہی نہ تھی۔'' (ص: ۲۴۷ حاشیہ سوانح قاسمی مرتبہ مولانا مناظر احسن گیلانی)۔

مولانا محمد مظہر نانوتوی مدرس آگرہ کالج، مولانا محمد منیر دیوبندی مدرس بریلی کالج، مولانا محمد احسن نانوتوی مدرس بنارس و بریلی کالج، دیوبندی شیخ الھند مولانا محمود حسن کے والد مولانا ذوالفقار علی دیوبندی مدرس بریلی کالج تھے۔ مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔

شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل گجرات وصدر مہتمم دارالعلوم دیوبند مولانا شبیر احمد عثمانی (متوفی ۱۳۶۹ھ/ ۱۹۴۹ء) مشہور دیوبندی علما مثلاً مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا محمد یوسف بنوری، مولانا منظور احمد نعمانی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مفتی محمد شفیع دیوبندی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے استاد ہیں۔ ان کی سوانح میں ہے۔

''آپ کے والد محترم کا نام فضل الرحمٰن تھا اور آپ سہارن پور کے قصبہ دیوبند کے رہنے والے تھے۔ مولانا فضل الرحمٰن نے ابتدائی تعلیم دیوبند میں حاصل کی بعد ازاں دہلی کالج میں داخلہ لیا۔ (دو تین جملوں کے بعد) حکومت ہند نے آپ کو ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدۂ جلیلہ پر فائز کیا۔ پنشن تک آپ یوپی کے مختلف اضلاع بالخصوص بجنور میں ڈپٹی انسپکٹر محکمۂ تعلیم کے عہدہ پر رہے۔ (چند جملوں کے بعد) ان کی اولاد میں کئی ہستیاں نہ صرف فخر خاندان تھیں بلکہ ان کو اگر فخر اسلام کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان مقتدر ہستیوں میں فخر الفقہاء مفتی عزیز الرحمٰن، فخر العلماء مولانا مولانا حبیب الرحمٰن سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند اور خود علامہ شبیر احمد عثمانی آسمانِ علم و فضل کے آفتاب و ماہتاب تھے۔ ان کے علاوہ مولانا عامر عثمانی، مولانا یعقوب الرحمٰن اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی بھی صاحبان علم و فضل سمجھے جاتے ہیں۔ (ص ۲۱۱۔ علامہ شبیر احمد عثمانی۔ مرتب ڈاکٹر علی ارشد۔ مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور ۲۰۰۵ء)

اجمیر مقدس اور سرزمین بریلی پر علمائے دیوبند کے قدیم اثرات ثابت کرنے کے شوق میں مشہور دیوبندی عالم خالد محمود مانچسٹر، برطانیہ، لکھتے ہیں:

''بریلی کے اس دور کی اہمیت اس سے واضح ہوتی ہے کہ پہلا مطبع ۱۸۴۷ء میں قائم ہوا۔ یہ پریس بریلی کالج سے متعلق تھا اور اس جہت سے یہ گویا گورنمنٹ پریس تھا۔ اس سے پہلے ایک اردو اخبار (عمدۃ الاخبار نامی) بھی نکلتا تھا جس کے پہلے ایڈیٹر مولوی عبدالرحمٰن تھے جو

محدثین دہلی کے بڑے معتقد تھے۔اس کے ۴۸ سال بعد مولانا محمد احسن نانوتوی نے ۱۸۹۵ء میں یہاں مطبع صدیقی قائم کیا۔

مولانا محمد احسن صدیقی نانوتوی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند کے ہم جد تھے۔آپ نے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی کتاب تحذیرالناس اس مطبع سے شایع کی۔ اس میں بطور مستفتی مولانا محمد احسن کا نام درج ہے۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ بریلی کے اس علمی ماحول میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کس قدر و منزلت سے دیکھے جاتے تھے اور کس طرح بریلی پر مسلکِ دیوبند کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔شہر کی مرکزی عیدگاہ کے امام یہی مولانا محمد احسن صدیقی نانوتوی تھے۔جس طرح ہندوستان کے تمام بڑے شہروں میں اسلام کی علمی قیادت علماے دیوبند کے ہاتھوں میں تھی بریلی میں بھی مسلمانوں میں یہی نظریات غالب تھے۔یہ بات مولانا احمد رضا بریلوی سے بہت پہلے کی ہے۔

یہاں سرشتۂ تعلیم میں بھی یہی حضرات چھائے ہوئے تھے۔۱۸۵۰ء میں بریلی کالج قائم ہوا اور مولانا محمد احسن نانوتوی اس کے شعبۂ فارسی کے صدر مقرر ہوئے۔اور جب عربی شعبہ قائم ہوا تو اس کے صدر بھی آپ ہی بنائے گئے۔دیوبند کے حضرت مولانا ذوالفقار علی (۱۹۰۴ء) بریلی میں انسپکٹر مدارس رہے۔۱۸۵۱ء میں آپ یہیں تھے۔۱۸۵۷ء میں آپ میرٹھ کے ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے پر فائز رہے۔۱۸۵۷ء میں حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی (۱۸۹۱ء) جو شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کے والد تھے بریلی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔(ص ۱۸۔مطالعۂ بریلویت جلد چہارم از خالد محمود مطبوعہ حافظی بکڈپو، دیوبند)

بریلی میں بڑے بڑے علما پیدا ہوئے۔شیخ الھند حضرت مولانا محمود حسن ۱۸۵۱ء میں یہیں پیدا ہوئے۔حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند کے مولد و منشا ہونے کا شرف اسی سرزمین کو حاصل ہے۔آپ بریلی میں ۱۳۴۸ھ میں پیدا ہوئے۔ان سب اکابر کے استاذ حضرت مولانا مملوک علی (۱۲۶۷ھ) تھے جو ۱۸۵۱ء میں فوت ہوئے۔آپ دہلی کالج کے شعبۂ عربی کے صدر تھے اور جس سال آپ فوت ہوئے وہی سال حضرت شیخ الھند کا سالِ ولادت ہے۔(ص ۱۸۔مطالعۂ بریلویت جلد چہارم)

اجمیر شریف حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کی نسبت سے ہندوستان کا ایک بڑا دینی اور روحانی مرکز تھا۔ وہاں کی بڑی علمی شخصیت کون تھی؟ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی۔ جو پہلے بریلی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے تھے اور بعد میں دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس بنے۔ آپ یہاں اجمیر کالج میں صدر مدرس تھے۔ (ص ۲۰۔ مطالعۂ بریلویت جلد چہارم مطبوعہ دیوبند)

(۳) اِعلام الاعلام باَن ہندوستان دار الاسلام (۱۳۰۶ھ/ ۱۸۸۸ء) جس کی پہلی طباعت بشکلِ رسالہ بماہ مارچ ۱۹۲۷ء حسنی پریس بریلی سے ہوئی۔ اس میں امام احمد رضا بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء) تحریر فرماتے ہیں:

> ''دارالاسلام کے دارالحرب ہوجانے کے بارے میں جو تین باتیں ہمارے امام اعظم امام الائمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک درکار ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہاں احکامِ شرک اعلانیہ جاری ہوں اور شریعتِ اسلامیہ کے احکام و شعائر مطلقاً جاری نہ ہونے پائیں۔ اور صاحبین کے نزدیک اسی قدر کافی ہے مگر یہ بات بحمد اللہ یہاں قطعاً موجود نہیں۔'' (اعلام الاعلام مطبوعہ حسنی پریس۔ بریلی)

دوام العیش فی الائمۃ من قریش (۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۰ء) امام احمد رضا بریلوی کے وصال ۱۹۲۱ء کے بعد ۲۵ ربیع الاول ۱۳۴۱ھ/ ۱۹۲۳ء میں حسنی پریس بریلی سے شائع ہوئی اس میں آپ تحریر فرماتے ہیں:

> ''مفلس پر اعانتِ مال نہیں۔ بے دست و پا پر اعانتِ اعمال نہیں۔ ولہذا مسلمانانِ ہند پر حکم جہاد و قتال نہیں۔ (دوام العیش مطبوعہ بریلی)

۱۸۸۸ء میں امام احمد رضا بریلوی نے ایک استفتاء کے جواب میں ہندوستان کو دارالاسلام کہا اور اعلام الاعلام تحریر کیا جس کی اشاعت آپ کے وصال (۱۹۲۱ء) کے تقریباً سات سال بعد ہوئی۔ اس کے اندر ہندوستان کے دارالاسلام ہونے کی وجہ یہ بتائی کہ یہاں احکام و شعائرِ اسلامیہ پر پابندی نہیں نہ ہی انھیں پامال کر کے یہاں مسلمانوں پر اعلانیہ احکام شرک جاری ہیں۔ یہ اساسِ حکم ہے جو شریعتِ اسلامیہ و اصول فقہ کے مطابق ہے۔ اسی طرح اس دور میں آپ کے وصال تک مسلمانانِ ہند پر حکم جہاد نہیں تھا کیوں کہ ان کے اندر قدرت و استطاعتِ جہاد نہیں تھی۔ یہ مسئلہ بھی عین مطابق شریعت ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس دور میں علمائے ہند میں سے کسی

قابلِ ذکر عالم وفقیہ ومفتی نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے اوراس میں جہاد فرض ہونے کا فتویٰ شاید ہی دیا ہو۔اوراگر دیا ہوتو وہ اصولاً صحیح نہیں اور نا قابل عمل بھی تھا۔

ان دونوں باتوں کوایک ساتھ سمجھانے کے لئے میں معترضین ومعاندین سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ۱۵راگست ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان کے لاکھوں مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ ہزاروں مساجد پنجاب وغیرہ مشرکینِ ہند کے قبضے میں چلی گئیں۔ ہزاروں مسلمان عورتوں کی عصمت دری وآبروریزی ہوئی۔ اس دورِ وحشت اثر کے بعد بھی سالہا سال تک ہزاروں ہندو مسلم فسادات میں مسلمانوں کی جان ومال کی تباہی اوران کی عزت وناموس کی بربادی ہوتی رہی۔ اوردسمبر ۱۹۹۲ء میں بابری مسجد ہندوستانی کورٹ وگورنمنٹ وپولیس وملٹری کی موجودگی میں شہید کی گئی اورملک بھر میں مسلمانوں کا وحشیانہ قتل اوران کی خوں ریزی ہوئی۔ مارچ ۲۰۰۲ء میں صرف صوبہ گجرات کے اندر حکومتِ گجرات کی شہ پر تین چار ہزار مسلمان شہید کردیئے گئے۔ ایسے سنگین ایام واوقات میں بھی ہندوستان کے کس طبقہ کے علماء نے ہندوستان کو دارالحرب قراردیااوراس کےاندرجہادفرض ہونے یایہاں سےہجرت کرنے کافتویٰ دیا؟؟؟

حلقۂ دیوبند کے قطب الاقطاب وامام ربانی مولانا رشیداحمد گنگوہی (متوفی ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء) لکھتے ہیں——

”ہند کے دارالحرب ہونے میں اختلاف علماء کا ہے۔ بظاہر تحقیقِ حال بندہ کی خوب نہیں ہوئی۔ حسب اپنی تحقیق کے سب نے فرمایا ہے اوراصل میں کسی کوخلاف نہیں۔ اور بندہ کو بھی خوب تحقیق نہیں کہ کیا کیفیت ہند کی ہے۔فقط۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ (ص ۵۰۵۔ فتاویٰ رشیدیہ مکتبہ تھانوی دیوبند)

”دارالحرب ہونا ہندوستان کا مختلف علمائے حال میں ہے۔ اکثر دارالاسلام کہتے ہیں اور بعض دارالحرب کہتے ہیں۔ بندہ اس میں فیصلہ نہیں کرتا۔ (ص: ۷۔ جلد اول۔ فتاویٰ رشیدیہ۔ کتب خانہ رحیمیہ دہلی)

دیوبندی حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی (متوفی ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء) گومگو اور تردد کی کیفیت میں ہیں۔ رجحان دارالحرب کی طرف ہے مگر یہ بھی کہتے ہیں کہ ہجرت کے معاملے میں

دارالحرب اور سود کے معاملے میں دارالاسلام قرار دینا چاہیے۔ (خلاصۂ مفہوم۔ص:۳۷۱ و ۳۶۲۔از قاسم العلوم مطبوعہ لاہور)

دیوبندی حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانوی (متوفی ۱۳۶۲/۱۹۴۳ء) فرماتے ہیں—

''عموماً دارالحرب کا معنیٰ غلطی سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ جہاں حرب واجب ہو۔ سو اس معنیٰ میں تو ہندوستان دارالحرب نہیں کیوں کہ یہاں بوجہ معاھدہ کے حرب درست نہیں۔ (ص:۱۴۷۔ باب اول۔ملفوظ ۶۱۴۔کمالات اشرفیہ،مطبوعہ ادارہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون)

بینک سے لین دین کے منافع کو سود قرار دیتے ہوئے انیسویں صدی کے بالکل آخر میں مولانا اشرف علی تھانوی (متوفی ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) نے ۱۸۸۷ء میں تحذیر الاخوان عن الربوٰ فی الھندوستان (مسودہ صفر ۱۳۰۵ھ، مبیضہ رمضان ۱۳۰۷ھ) لکھا جو ان کی زندگی ہی میں شائع ہوا اس کے اندر دارالاسلام اور دارالحرب کی بحث کرتے ہوئے مولانا تھانوی لکھتے ہیں:

> ''اور ہندوستان نہ تو صاحبین کے قول پر دارالحرب ہے کیوں کہ اگرچہ احکام شرک کے اس میں علی الاعلان جاری ہیں لیکن احکام اسلام کے بھی بلاخوف وخطر مشتہر ہیں۔ اور دونوں کے باقی رہنے سے دارالحرب نہیں ہوتا۔ اور نہ امام صاحب کے قول پر دارالحرب ہے کیوں کہ اجرائے احکامِ کفر بہ تفسیرِ مذکور یہاں نہیں بلکہ بدستور احکامِ اسلام جاری ہیں اور ایسی صورت میں دارالحرب نہیں ہوتا۔'' (ص:۸۔تحذیر الاخوان عن الربوٰ فی الھندوستان از مولانا اشرف علی تھانوی۔اشرف المطابع تھانہ بھون)

پھر انقلاب ۱۸۵۷ء کے پس منظر میں ایک شبہ کا ازالہ کرتے ہوئے مولانا تھانوی لکھتے ہیں:

> ''شاید کسی کو شبہ ہو کہ غدر سے تو امانِ اول باقی نہیں رہا بلکہ عہدِ ثانی کی ضرورت ہوئی۔ اول تو یہ بات غلط ہے۔ غدر میں صرف باغیوں کو اندیشہ تھا۔ عام رعایا سرکار سے بالکل مطمئن تھی۔ دوسری سلّمنا غایت سے غایت یہ ہوگا کہ بعض کے لئے امانِ اول باقی ہے بعض کے لئے امانِ ثانی۔ یہ بھی مثل دونوں اِجراؤں یا دونوں اتصالوں کے ہوگا اور ترجیح دارالاسلام کو دی جائے گی۔

اور اگر بالفرض و التقدیر اس صورت میں دارالحرب بھی ہوگیا تب بھی دارالحرب اِجرائے احکام اسلام مثلِ جمعہ وعید سے دارالاسلام ہوجاتا ہے۔فی الدر المختار۔ و دارالحرب تصیر دارالاسلام باجراءِ احکامِ اھلِ الاسلام فیھا کجمعة و عید۔ اِن بقی فیھا کَافِرٌ اَصلی و ان لم تتصل بدارالاسلام ۔اس صورت میں بھی ہندوستان دارالاسلام ہوگا۔(ص:۹۔تحذیر الاخوان عن الربوٰ فی الھندوستان از مولانا اشرف علی تھانوی۔ اشرف المطابع تھانہ بھون)

پس تعجب ہے کہ بعض اھلِ اسلام ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر آمدنیِ بینک کو حلال سمجھتے ہیں۔ اور بعض لوگ لے کر خود نہیں کھاتے دوسروں کو کھلا دیتے ہیں۔ یہ ایک اعتبار سے پہلے سے بُرا ہے۔“ (ص:۔۱۰تحذیرالاخوان از مولانا تھانوی)

ابوالحسنات مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی لکھنوی (متولد ذوالقعدہ ۱۲۶۴ھ/ اکتوبر ۱۸۴۸ءمتوفی ربیع الاول ۱۳۰۴ھ/ دسمبر ۱۸۸۶ء۔فرزند مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی متولد شعبان ۱۲۳۹ھ/ اپریل ۱۸۲۴ء۔متوفی شعبان ۱۲۸۵ھ/ دسمبر ۱۸۶۸ء) لکھتے ہیں کہ — ”بلادِ ہند جو قبضۂ نصاریٰ میں ہیں دارالحرب نہیں ہیں ۔(ص ۳۰۲۔جلد اول فتاویٰ عبدالحیٔ فرنگی محلی ۔مطبع یوسفی لکھنؤ)

واضح رہے کہ سب سے پہلے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (وصال ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) نے ہندوستان کے دارالاسلام و دارالحرب ہونے کے مسئلے پر فقہاے احناف کے تین اقوال تحریر کیے اور تیسرے قول کو ترجیح دیتے ہوئے فرمایا کہ — ”وہمیں قولِ ثالث را محققین ترجیح دادہ اندو بریں تقدیر معمولۂ انگریزاں واشباہ ایشاں لاشبہ دارالحرب است“۔(ص:۱۱۰۔جلد اول فتاویٰ عزیزی مطبع مجتبائی دہلی)

اپنے وقت میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے برطانوی سامراج کے پنجۂ استبداد میں پھڑ پھڑاتے اور شعائر اسلام کو پامال ہوتے ہوئے دیکھ کر ہندوستان کے دارالحرب ہونے کو ترجیح دی اور علامہ فضل حق خیرآبادی (متوفی ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء) نے ۱۸۵۷ء میں برطانوی

سامراج اور غاصب وقابض انگریزوں کے خلاف جامع مسجد دہلی میں تقریر کی اور فتوائے جہاد دیا جس پر اس وقت کے مشہور علما کی تحریری تصدیقات ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جہاد کے لئے اس وقت کے علماء نے دو فتاویٰ اس کے علاوہ بھی جاری کیے۔ ایک فتویٰ پر حضرت مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی (متوفی ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء) کا بھی دستخط ہے۔

تاریخی ریکارڈ کے مطابق مجلسِ مذاکرۂ علمیہ کلکتہ بتاریخ ۲۳ر نومبر ۱۸۷۰ء میں مولانا کرامت علی جون پوری خلیفۂ سید احمد رائے بریلوی نے اپنی تقریر میں کہا— ''مملکت ہندوستان بالفعل پادشاہ عیسائی مذھب کے قبضہ واقتدار میں ہے۔ مطابق فقہِ حنفی کے دارالاسلام ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔'' (ص:۳۰۔ اسلامی مذاکرۂ علمیہ کلکتہ مطبع نولکشور لکھنؤ)

علمائے حرمین سے بھی تقریباً ۱۸۷۰ء میں اسی سلسلے میں استفتاء ہوا جس کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ محض غیر مسلم کے ہاتھ میں ملک کے چلے جانے سے نہیں بلکہ کل یا اکثر احکامِ اسلام کے اِجرا اور ان پر عمل کرنے میں خلل واقع ہونے سے کوئی دارالاسلام دارالحرب ہوتا ہے۔ اس طرح کا جواب شیخ جمال بن عبداللہ مفتی حنفیہ مکہ مکرمہ و شیخ احمد بن زینی دحلان مفتی شافعیہ مکہ مکرمہ نے دیا۔ (ص ۳۹۔ مذاکرۂ علمیہ کلکتہ مطبوعہ)

جولائی ۱۸۷۰ء میں ایک فتویٰ دیا گیا کہ احکام اسلام پر عمل کی آزادی کی وجہ سے ہندوستان میں جہاد ناجائز ہے۔ اس فتویٰ پر ان حضرات کے دستخط و مہر ثبت ہیں۔ مولوی محمد علی لکھنوی، مولوی عبدالحیٔ لکھنوی، مولوی فیض اللہ لکھنوی، مولوی محمد نعیم لکھنوی، مولوی قطب الدین لکھنوی، مفتی سعداللہ لکھنوی، مولوی لطف اللہ رام پوری، مولوی غلام علی رام پوری۔ (ص:۲۱۷۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان از ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر۔ ترجمہ صادق حسین۔ ناشر الکتاب انٹرنیشنل، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی ۲۵۔ مطبوعہ ۲۰۰۲ء)

غیر مقلد محدث نذیر حسین بہاری ثم دہلوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/ ۱۹۰۲ء) کے بارے میں ان کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ انھوں نے ہندوستان کو کبھی دارالحرب نہ کہا۔ (۱۳۴۔ الحیاۃ بعد المماۃ از فضل حسین بہاری۔ مکتبۂ شعیب کراچی)

غیر مقلد عالم و مصنف نواب صدیق حسن بھوپالی (متوفی ۱۳۰۷ھ/ ۱۸۹۰ء) لکھتے ہیں:

''پس فکر کرنا ان لوگوں کا جو اپنے حکم مذہبی سے جاہل ہیں اس امر میں کہ برٹش حکومت مٹ

جاوے اور یہ امن و امان جو آج حاصل ہے فساد کے پردے میں جہاد کا نام لے کر اٹھا دیا جائے سخت نادانی و بے وقوفی کی بات ہے۔ بھلا ان عاقبت نا اندیشوں کا چاہا ہوگا یا اس پیغمبر صادق کا فرمایا ہوگا جس کا کہا ہوا آج ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور اس کے خلاف نہیں ہوسکتا۔ (ص ۷۔ ترجمان وھابیہ از نواب صدیق حسن بھوپالی۔ مطبوعہ ۱۳۱۲ھ)

''حنفیہ جن سے یہ ملک بھرا پڑا ہے ان کے عالموں اور مجتہدوں کا تو یہی فتویٰ ہے کہ یہ دارالاسلام ہے اور جب یہ ملک دارالاسلام ہو تو پھر یہاں جہاد کرنا کیا معنی؟ بلکہ عزمِ جہاد ایسی جگہ ایک گناہ ہے بڑے گناہوں سے۔ (ص ۱۵۔ ترجمان وھابیہ از نواب صدیق حسن بھوپالی۔ مطبع محمدی لاہور) ''اس مقام پر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہندوستان دارالحرب ہی ہو تو بھی حکامِ انگلشیہ کے ساتھ جو یہاں کے رئیسوں کا عہد اور صلح ہے اس کا توڑنا بڑا گناہ ہے۔ (ص ۲۶۔ حوالۂ مذکورہ)

لفظ وھابی کی جگہ حکومت انگلشیہ سے اھل حدیث نام رجسٹرڈ کرانے والے معروف غیر مقلد وکیل مولانا محمد حسین بٹالوی (متوفی ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۲۰ء) لکھتے ہیں:

> ''جس شہر یا ملک میں مسلمانوں کو مذہبی فرائض ادا کرنے کی آزادی ہو وہ شہر یا ملک دارالحرب نہیں کہلاتا۔ پھر اگر وہ دراصل مسلمانوں کا ملک یا شہر ہو اور اقوامِ غیر نے اس پر تغلب سے تسلط پالیا ہو تو جب تک اس میں ادائے شعائرِ اسلام کی آزادی ہے وہ بحکمِ حالت قدیم دارالاسلام کہلاتا ہے۔
> (ص: ۱۹۔ الاقتصاد فی مسائل الجہاد از محمد حسین بٹالوی۔ وکٹوریہ پریس لاہور)

تحریک خلافت (۱۹۱۹ء) کے بانی حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی لکھنوی (وصال رجب ۱۳۴۴ھ/ جنوری ۱۹۲۶ء) اپنے ایک خط مطبوعہ اخبار مشرق گورکھپور مورخہ ۶ ر مئی ۱۹۲۰ء میں ہندوستان کو دارالاسلام قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:—

''ہم لوگ ہندوستان کو دارالاسلام سمجھتے ہیں اور اعزازِ دین و اعلائے کلمۃ الحق کی نیت سے قیام کیے ہوئے ہیں اس واسطے ہجرت فرض نہیں جانتے مگر جب چارہ نہ ہو'' الخ۔ (ص ۱۳۸۔ تحریک خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی۔ طبع دوم ۱۹۹۷ء)

مذہبی تحریک خلافت نے جب گاندھی کی قیادت میں مکمل سیاسی روپ اختیار کرتے ہوئے

ترک موالات کی تحریک (۱۹۲۰ء) شروع کی تو مسئلہ خلافت ہی کی طرح مسئلہ موالات کو بھی سیاسی تختۂ مشق بنایا گیا۔ موالات کہتے ہیں قلبی محبت کو اور کسی مسلمان کے لئے از روئے قرآن و حدیث یہود و نصاریٰ و کفار و مشرکین سے قلبی محبت ناجائز ہے۔ موالاتی لیڈر ایک طرف انگریزوں سے ہر طرح کے تعلق کو از روئے مذہب ناجائز کہتے تھے تو دوسری طرف ہندوستانی کفار و مشرکین سے موالات و مؤدت و یاری دوستی کے عملی نمونے پیش کر رہے تھے۔ محض سیاسی و ملکی مفاد کے لئے اہل وطن کے اشتراکِ عمل کی قوت سے انگریزوں کے اقتدار و حکومت کے خاتمہ کی جدوجہد صحیح تھی مگر مذہباً اسے لوگوں پر مسلّط کرنا اور خلافِ شرع حرکات کرنا قطعاً غلط تھا اور غلط ہے۔ چوں کہ قرآن و حدیث میں موالات ہر کافر و مشرک سے ناجائز قرار دیا گیا ہے اس لئے نصاریٰ ہوں کہ یہود ہوں کہ ہنود ہوں کہ مجوس ہوں ہر ایک سے مؤدت و موالات ناجائز ہے۔ اسی موضوع پر امام احمد رضا بریلوی نے اپنے آخری دور میں ایک سوال کے جواب میں المحجة المؤتمنة فی آیة الممتحنة (۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰) تصنیف فرما کر مسئلہ موالات اور اس کے متعلقات کی شرعی و علمی حیثیت واضح کی۔

اسی سلسلے میں ایک استفتاء کے جواب میں امام احمد رضا بریلوی لکھتے ہیں—— ''قرآن عظیم نے بکثرت آیتوں میں تمام کفار سے موالات قطعاً حرام فرمائی۔ مجوس ہوں خواہ یہود و نصاریٰ ہوں خواہ ہنود اور سب سے بدتر مرتدانِ عنود۔ اور یہ سب مدعیانِ ترکِ موالات، مشرکین مرتدین سے یہ موالات برت رہے ہیں۔ پھر ترکِ موالات کا دعویٰ؟ (ص:۱۲۔ جلد۶۔ فتاویٰ رضویہ مطبوعہ مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی)

تحریکِ ترکِ موالات کے چوٹی کے لیڈر مولانا ابوالکلام آزاد نے یہاں تک کہہ دیا کہ —— ''حکومت سے ترکِ موالات اس طرح فرض ہے جس طرح نماز اور روزہ اور دوسرے ارکان اسلام فرض ہیں۔'' (ص:۱۶۴ تبرکاتِ آزاد از غلام رسول مہر۔ مطبوعہ دہلی ۱۹۶۳ء)

اصل مقصدِ تحریک از تحریک خلافت تا تحریک ترک موالات کی نقاب کشائی کرتے ہوئے مولانا آزاد کہتے ہیں کہ —— ''کوشش اور لڑائی صرف اماکنِ مقدسہ اور خلافت کے لئے نہیں بلکہ ہندوستان کو حکومتِ خود اختیاری دلانے کے لئے ہے۔ اگر خلافت کا خاطر خواہ فیصلہ ہو بھی جائے تاہم جدوجہد جاری رہے گی اس وقت تک کہ ہم گنگا و جمنا کی مقدس سرزمین آزاد نہ کرالیں۔ (ص:۲۴۔ دوامغ الحمیر۔ مطبوعہ بریلی ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۰ء)

عبدالقوی دسنوی اس دور کی اتحادی سیاست کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں——

''۱۹۱۹ء میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد کا اس قدر زور تھا کہ کلکتہ اور دہلی کے مسلمانوں نے غیر مسلموں کو بھی جلسوں میں شریک ہونے کے لئے مسجدوں میں آنے کی اجازت دے دی تھی۔ دہلی کے مسلمانوں نے شردھانند سے جامع مسجد میں تقریر کرائی۔'' (ص:٦٦۔ ابوالکلام آزاد۔ ازعبدالقوی دسنوی۔ ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی۔ ۱۹۸۷ء)

جمعیۃ العلماء ہند کے اجلاس بریلی مارچ ۱۹۲۱ء میں مولانا سید سلیمان اشرف (وصال ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۹ء) صدر شعبۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو مولانا ابوالکلام آزاد و مفتی کفایت اللہ دہلوی وغیرنے ۳۵ منٹ خطاب کا وقت دیا تھا۔ آپ نے اپنی تقریر میں حاضرین اجلاس کے ساتھ مولانا آزاد اور مفتی کفایت اللہ وغیرہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا——

''ہر کافر سے موالات حرام، خواہ محارب ہو یا غیر محارب۔ لایتخذ المؤمنون الکٰفرین اولیاء۔ (القرآن)۔ آپ حضرات انگریزوں سے تو موالات حرام بتاتے ہیں اور کافروں سے موالات نہ صرف جائز بلکہ عین حکمِ الٰہی کی تعمیل بتاتے ہیں۔''—— (ص:۷۔ روداد مناظرہ ازارا کین جماعت رضائے مصطفٰی بریلی۔ مطبوعہ قادری پریس بریلی)

استاذ العلماء حضرت مفتی لطف اللہ علی گڑھی (وصال ۱۳۳۴ھ/ ۱۹۱٦ء) کے شاگرد اور پنجاب کے مشہور عالم و شیخِ طریقت حضرت سید مہر علی شاہ چشتی (گولڑہ شریف ضلع راولپنڈی پنجاب۔ وصال ۱۳۵٦ھ/ ۱۹۳٦ء) خلیفۂ حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی چشتی (وصال ۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۳ء) فرماتے ہیں کہ——

''یہود اور مشرکین کی عداوت قرآن شریف میں صراحۃً مذکور ہے۔ پس ترکِ موالات ہندو اور انگریز اور یہود سب سے ہونی چاہیے۔ تفریق اور ترجیح بلا مرجّح ٹھیک نہیں۔'' (ص:۴۷۔ ۲۷۔ باب ۵، فصل ۷، مہر منیر مؤلفہ مولانا فیض احمد چشتی مطبوعہ پاک و ہند)

تحریکِ خلافت (۱۹۱۹ء) کے بطن سے تحریک ترک موالات (۱۹۲۰ء) پیدا ہوئی تھی۔ مسئلہ خلافت پر اس زمانے میں کافی علمی و قلمی معرکہ آرائی تھی۔ امام احمد رضا بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء) خلافتِ شرعیہ اور خلیفۂ شرعی کے لئے شرائطِ سبعہ وغیرہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں——

''خلیفہ میں قریشی ہونے کی شرط جمیع علماء کا مذہب ہے۔ اور بے شک اسی سے صدیق اکبرو

فاروق اعظم نے روز سقیفہ انصار پر حجت فرمائی اور صحابہ میں سے کسی نے اس کا انکار نہ کیا اور بے شک علماء نے اسے مسائلِ اجماع میں گِنا اور سلفِ صالح میں کوئی قول یا فعل اس کے خلاف منقول نہ ہوا۔ یو ہیں تمام زمانوں میں علمائے مابعد سے۔ الخ (ص:۳۶۔ دوام العیش فی الائمۃ من قریش۔ مطبوعہ بریلی ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۳ء)

سلاطینِ ترکی وحکومتِ ترکیہ کی حمایت کے بارے میں امام احمد رضا بریلوی لکھتے ہیں—— ''سلطنتِ علیہ عثمانیہ ایّدھا اللّٰہ تعالیٰ، نہ صرف عثمانیہ ہر سلطنتِ اسلام، نہ صرف سلطنت ہر جماعتِ اسلام، نہ صرف جماعت ہر فردِ اسلام کی خیر خواہی ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اس میں شرطِ قرشیت ہونا کیا معنی؟ دل سے خیر خواہی مطلقاً فرض عین ہے اور وقتِ حاجت دعاء سے امداد و اعانت بھی ہر مسلمان کو چاہیے کہ اس سے کوئی عاجز نہیں۔ اور مال یا اعمال سے اعانت فرضِ کفایہ ہے۔'' (دوام العیش مطبوعہ پاک و ہند)

حضرت سید مہر علی چشتی (گولڑہ ضلع راولپنڈی) مسئلہ خلافت کے بارے میں فرماتے ہیں——

''صحیح حدیث کی رُو سے جناب نبی کریم ﷺ کے بعد صرف تیس برس تک اسلامی خلافت (راشدہ) قائم رہی۔ بعد ازاں سلطنت ہوگئی تھی جس کے لئے حدیث شریف میں ''عضوضیت'' اور جبر کا مفہوم آیا ہے۔ مذہب اسلام ایسی سلطنت کو خلافتِ جاریۂ ضروریہ قرار دیتے ہوئے اس کے جواز کی ذمہ داری قبول کرے تو یزید بن معاویہ اور منصور عباسی بھی سلاطین جابرہ کی بجائے خلفائے نبوی قرار پائیں گے۔ الخ۔ (ص:۲۷۰۔ مہر منیر مطبوعہ پاک و ہند)

بریلی کے اجلاسِ جمعیۃ العلمائے ہند مارچ ۱۹۲۱ء/ رجب ۱۳۳۹ھ میں جس طرح مولانا سید سلیمان اشرف صدر شعبۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے مولانا ابوالکلام آزاد و مفتی کفایت اللہ دہلوی وغیرہ کو مخاطب کرتے ہوئے واضح کیا کہ——

''ہمیں ترکی کی اسلامی سلطنت کی ہمدردی و اعانت سے انکار نہیں۔ یہ امداد و اعانت تمام مسلمانانِ عالم پر فرض ہے۔ نہ ہی ہم انگریزوں کی دوستی کو جائز قرار دیتے ہیں۔ موالات ہر نصرانی و یہودی سے ہر حال میں حرام اور حرام قطعی ہے۔ ہمیں تو ہندو مسلم اتحاد اور اس اتحاد کی بنا پر کیے جانے والے غیر اسلامی افعال و اقوال سے اختلاف ہے۔'' (ص:۶۔ روداد مناظرہ مطبوعہ بریلی)

ٹھیک اسی طرح تحریک کے اندر پائی جانے والی غیر شرعی حرکات کی مخالفت کرتے ہوئے

امام احمد رضا بریلوی کے خلف اکبر مولانا حامد رضا بریلوی (وصال ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء) نے اسی جمعیۃ العلماء ہند کے اسٹیج سے اپنا یہ موقف واضح کیا کہ ــــ

''حرمین شریفین و مقاماتِ مقدسہ و ممالکِ اسلامیہ کی حفاظت و خدمت ہمارے نزدیک ہر مسلمان پر بقدرِ وسعت و طاقت فرض ہے۔ اس میں ہمیں خلاف نہ ہے نہ تھا۔ اسی طرح سلطانِ اسلام و جماعتِ اسلام کی خیر خواہی میں ہمیں کچھ کلام نہ ہے نہ تھا۔ تمام کفار و مشرکین و نصاریٰ و یہود و مرتدین وغیرھم سے ترکِ موالات ہم ہمیشہ سے ضروری و فرض جانتے ہیں۔'' (ص: ۲۸۔ روداد مناظرہ مطبوعہ بریلی)

امام احمد رضا بریلوی تحریر فرماتے ہیں ــــ ''حضرات لیاڈر نے مسئلہ موالات میں سب سے بڑھ کر اودھم مچائی۔ اوروں میں افراط یا تفریط ایک ہی پہلو پر گئے۔ اس میں دونوں کی رنگت رچائی۔ افراط وہ کہ نصاریٰ سے نری معاملت بھی حرام قطعی۔ اور تفریط یہ کہ ہندوؤں سے اتحاد بلکہ ان کی غلامی فرض شرعی۔'' (المحجۃ المؤتمنۃ مطبوعہ بریلی)

''مشرکین سے اتحاد و وداد، دوستی، موالات کہ سب کا حاصل ایک ہے بلکہ اتحاد سب میں زائد ہے حرام قطعی و کبیرۂ شدیدہ ہے۔ (مکتوبات امام احمد رضا بریلوی بنام مولانا عبد الباری فرنگی محلی برائے ھدایت توبہ محررہ۔ شعبان ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۱ء۔ مطبوعہ پاک و ہند)

تحریک عدم اشتراکِ عمل اور عدم تعاون کو تحریک موالات و مؤدت بنانا، اور آیات و احادیث کی غلط تعبیر و تشریح کرنا اور کفار و مشرکین کے ساتھ وداد و محبت کا رشتہ قائم کرنا، نیز شرعی اصول اور تقاضوں کو نظر انداز کرنا، علما و قائدین تحریک کی بنیادی اور زبردست غلطی تھی۔ اگر مسلمانوں کو سیاسی لحاظ سے یہ پیغام دے کر اس تحریک سے وابستہ کیا جاتا کہ انگریز اس ملک کے غاصب و قابض حکمراں ہیں۔ یہ ہمارے ملک کو غلام بنا رہے ہیں۔ ہندوستانیوں پر ظلم و ستم کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کو دوسرے درجے کا شہری بنا رہے ہیں اس لئے ان کے خلاف محاذ بنا کر انھیں ملک سے باہر کیا جائے۔ اس طرح کی باتیں ہوتیں تو بہت سے وہ علما و مشائخ بھی اس تحریک کا کسی نہ کسی انداز سے ضرور تعاون کرتے جو اس کی بے اصولی و بے اعتدالی و کج روی کی وجہ سے اس سے دور رہے۔

اس تحریک کے دوران مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اسلامیہ کالج لاہور، مدرسہ عالیہ کلکتہ وغیرہ پر موالاتی لیڈروں نے تعلیمی بائیکاٹ کے لئے دھاوا بولا مگر ہندوؤں کی کوئی قابلِ ذکر تعلیم گاہ ان

موالاتیوں کی زد میں نہیں آئی۔ یہ بھی اس تحریک ترکِ موالات کا ایک حیرت انگیز پہلو ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۹۵۸ء) اس تحریک کے نمایاں لیڈر رہتے۔ ان کے عزائم بلند تھے۔ انھوں نے ''امام الھند'' بننے کے لئے ''مسئلۂ امامت'' بھی چھیڑا مگر علماء نے ان کا ساتھ نہیں دیا اور کسی معروف عالم نے ان کی تائید نہ کی۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ مولانا محمد علی جوہر ان کے حریف اور ان کی راہ کے سنگِ گراں نہیں بلکہ کوہِ گراں ثابت ہوئے۔ اس لئے کچھ دنوں بعد مولانا آزاد نے مسئلہ امامت کو سرد خانے میں ڈال دیا۔ (خلاصۂ مفہوم: ص: ۱۳۰۔ تحریک خلافت از محمد عدیل عباسی۔ قومی کونسل نئی دہلی)

بانی تحریک خلافت مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے اسی سلسلے میں ۲۶/شوال ۱۳۳۹ھ کو حضرت سید مہر علی چشتی گولڑوی سے ایک استفتا کیا۔ جس کے جواب میں آپ نے لکھا.........

''خلاصہ یہ کہ موجودہ زمانے میں علماء کی کارروائی نہ خلافت ہے نہ امامت۔ الخ (ص: ۴۵۱۔ مہر منیر مطبوعہ پاک وہند)

تحریک ترک موالات ہی نے تحریک ہجرت کی طرف پیش قدمی کی اور خلافتی لیڈروں نے مسلمانانِ ہند کو ہندوستان سے ہجرت کرنے کا حکم دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہزاروں مسلمان افغانستان کی طرف ہجرت کر گئے اور بدحال و پریشاں حال ہو کر ہندوستان واپس آئے تو مفلس و قلاش ہو چکے تھے۔ اس وقت کے ایک مشہور سیاسی لیڈر ظفر حسن ایبک لکھتے ہیں——

''نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں سادہ لوح مسلمان اپنے گھربار سے محروم ہوئے۔ افغانستان پر مالی بوجھ پڑا۔ ہندوستانی مسلمان افغانوں سے اور افغان ہندوستانی مسلمانوں سے کبیدہ خاطر ہوئے۔ اگر کسی نے اس سے فائدہ اٹھایا تو وہ صرف انگریز تھے۔ (آپ بیتی حصہ اول از ظفر حسن ایبک۔ مطبوعہ لاہور)

اس موقعہ پر مسلمانوں کی زمین جائداد ہندوؤں نے خریدی اور ہزاروں مسلمان بے گھر بے در ہوئے۔ چنانچہ رئیس احمد جعفری ندوی لکھتے ہیں——

''خریدنے والے زیادہ تر ہندو ہی تھے۔ ہزاروں مسلمان افغانستان ہجرت کر گئے۔ وہاں جگہ نہ ملی واپس کیسے گئے۔ کچھ مرکھپ گئے۔ جو واپس آئے تباہ حال، خستہ، درماندہ، مفلس، قلاش، تہی دست، بے نوا، بے یارو مددگار، اگر اسے ہلاکت نہیں کہتے ہیں تو کیا کہتے ہیں؟

(ص:۱۰۸۔حیات محمد علی جناح از رئیس احمد جعفری ندوی،مطبوعہ تاج آفس ممبئی)

آریہ سماجی لیڈر سوامی شردھانند جسے موالاتی لیڈروں نے دعوت دے کر جامع مسجد دہلی میں تقریر کرائی تھی اس نے ۱۹۲۳ء میں علاقہ آگرہ و راجپوتانہ میں شدھی سنگھٹن کو متحرک کر کے ''ہندو مسلم اتحاد'' کی قلعی کھول دی اور لاکھوں مسلمانوں کو مرتد بنا دیا۔ادھر ترکی میں مصطفیٰ کمال پاشا نے ۱۹۲۲ء میں سلطان ترکی کی معزولی اور ۱۹۲۴ء میں ترکی پارلیمنٹ میں خاتمۂ خلافت کا باضابطہ اعلان کر کے تحریک خلافت کو بے جان کر دیا۔ساتھ ہی ۱۹۲۴ء ہی میں بیلگام کرناٹک میں گاندھی نے ترکِ موالات کی تحریک جو ۱۹۲۲ء میں ہی تقریباً مردہ ہو چکی تھی اس کے خاتمہ کا باضابطہ اعلان کر دیا۔اس طرح وہ تحریک جسے خلافتی و موالاتی لیدر مذہبی بنیاد پر چلا رہے تھے وہ بالکل جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔

حیرت انگیز اتفاق یہ ہے کہ بیلگام کرناٹک میں ۲۴ ردسمبر ۱۹۲۴ء کو ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی صدارت میں خلافت کانفرنس ہوئی۔۲۶ ردسمبر ۱۹۲۴ء کو اسی جگہ گاندھی کی صدارت میں کانگریس کا اجلاس ہوا۔اور

''بیلگام میں کانگریس ہی کے پنڈال میں ۲۷ ردسمبر ۱۹۲۴ء کو ہندو مہاسبھا کا اجلاس ہوا جس کی صدارت پنڈت مدن موہن مالویہ نے کی۔اس میں کانگریس کے لیڈروں نے بھی شرکت کی۔ مالویہ جی نے دعویٰ کیا کہ ہندو مہاسبھا کوئی فرقہ وارانہ جماعت نہیں۔بیلگام میں آخر کار گاندھی جی نے سپر ڈال دی اور گاندھی،نہرو،سی آر داس معاہدہ تیار ہوا۔جس کا منشا یہ تھا کہ کونسلوں کا داخلہ منظور کیا جائے اور چرخہ کاتنا ممبری کے لئے ضروری قرار دیا جائے۔گاندھی جی نے ترکِ موالات کو خیر باد کہا اور اپنے آشرم واپس چلے گئے۔(ص:۲۵۳۔تحریک خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی۔قومی کونسل نئی دہلی)

''تحریک خلافت کی قیادت ابتدا سے انتہا تک مہاتما گاندھی کے ہاتھوں میں تھی۔بلکہ یہ کہنا صحیح اور بجا ہوگا کہ اگر مہاتما گاندھی اس تحریک میں پوری قوت کے ساتھ شامل ہو کر اس کا کل بار اپنے کاندھوں پر نہ لیتے تو تحریک خلافت میں جو زور پیدا ہوا وہ پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔''(ص:۱۶۔ تحریک خلافت از محمد عدیل عباسی)

''احمد آباد کانگریس کے موقعہ پر مولانا عزیز گل (رفیقِ حضرت شیخ الھند) نے ایک مجمع کے

سامنے تقریر کرتے ہوئے جس میں میں خود موجود تھا کہا کہ ''ہم نے گاندھی کو اپنا رہنما مان لیا ہے۔ آگے جانے کو کہے گا تو آگے جائیں گے۔ پیچھے ہٹنے کو کہے گا تو پیچھے ہٹیں گے۔ لیکن گاندھی کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم مسلمان اپنے خلیفہ کو بھی نہیں مانتے جب وہ راہِ حق سے تجاوز کرتا ہے۔ گاندھی جب تک راہِ حق پر رہے گا وہ ہمارا رہنما ہے۔ (ص:۸۰۔ تحریک خلافت از قاضی عدیل عباسی)

''مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی تو ان کو ''باپو'' کہتے تھے اور کراچی کے مقدمہ میں سزا پانے کے بعد جب وہ راہ میں تھے تو لوگوں نے پوچھا کہ تحریک کا کیا حال ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ میں تو جیل میں ہوں البتہ میں یہ جانتا ہوں کہ رسول کے بعد میرے اوپر مہاتما گاندھی کا حکم نافذ ہے۔ مولانا آزاد سبحانی گاندھی کے آشرم میں چلے گئے تھے اور ایک لباس پہن لیا تھا جو صرف گھٹنا اور کہنی بند تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد قولاً وعملاً گاندھی جی کے ہمنوا تھے۔ (ص:۸۰۔ تحریک خلافت از عدیل عباسی)

خلافت فنڈ کا جو حشر ہوا اس کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد کے دستِ راست مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ندوی لکھتے ہیں—

''ایک قلیل رقم ترکوں تک پہنچی باقی روپے کو مردے کا مال سمجھ لیا گیا۔ اس زمانے میں خود میں اپنی آنکھ سے دیکھتا تھا کہ بڑے بڑے لیڈر کس بے دردی سے قومی روپے اپنی ذات پر اڑا رہے ہیں۔ (ص:۳۸۸۔ ذکر آزاد۔ مطبوعہ دہلی)

خود مولانا محمد علی جوہر نے ۲۵؍دسمبر ۱۹۲۷ء کے پشاور اجلاس میں جو انکشاف کیا وہ چشمِ عبرت سے پڑھنے لائق ہے—

''ہندو رہنما مہاتما گاندھی ہمیشہ خلافت کے سرمایہ سے دورہ کرتا رہا۔ ہماری قید کے بعد بھی مہاتما گاندھی نے دورے کے مصارف خلافت کے سرمایہ سے لیے۔ حتی کہ کانگریس کے لئے ایک کروڑ روپے جمع کرنے کے لئے آپ کے دورانِ سفر کے مصارف بھی خلافت نے ادا کیے۔'' (ص:۱۰۵۔ حیات محمد علی جناح از رئیس احمد جعفری ندوی مطبوعہ ممبئی)

مولانا محمد علی جوہر اور گاندھی کا دورانِ تحریک خلافت وترک موالات ایک طریقہ یہ تھا کہ وہ تنہا یا وفد کے ساتھ بعض مشاہیر علماے ہند سے ملاقات کر کے انھیں اپنا ہم خیال وہم نوا بنانے کی

کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ ایک وفد کے ہمراہ ایک بار گاندھی مونگیر بہار پہنچے اور مولانا محمد علی مونگیری (وفات ربیع الاول ۱۳۴۶ھ/ ۱۹۲۷ء) سے ملاقات کی۔ گاندھی نے اپنے مطالعۂ سیرت کا حوالہ دے کر قرآن حکیم اور پیغمبر اسلام ﷺ کی تعریف وتوصیف کی—

''مولانا مونگیری، گاندھی جی کی ان باتوں کو خاموشی سے سنتے رہے۔ اور جب گاندھی جی اپنی بات کہہ چکے تو مولانا نے پوچھا۔ مجھے تو آپ اسلام کی وہ بات بتائیے جو آپ کو پسند نہیں آئی؟ اور آں حضرت ﷺ کے اس پہلو سے آگاہ کیجیے جسے آپ نے اچھا نہیں سمجھا؟ گاندھی جی اس سوال کے لئے تیار نہیں تھے۔ کچھ چونکے اور فوراً بولے۔ ایسا تو کوئی پہلو میری نظر میں نہیں آیا۔

اس پر مولانا مونگیری نے سوال کیا۔ تو پھر آپ نے ابھی تک اسلام کیوں قبول نہیں کیا؟ گاندھی جی کے پاس جواب نہیں تھا۔ مولانا خفا ہو گئے۔ اور فرمایا کہ آپ نے جو کچھ کہا غلط ہے۔ آپ ہمیں صرف پھانسنا چاہتے ہیں۔ صیّاد بھی پرندوں کو پکڑنے کے لئے انھیں کی بولیاں بولتا ہے۔ (مسٹر احسان بی اے کی آپ بیتی) بحوالہ ص: ۲۷۳ مہر منیر مطبوعہ پاک وہند۔

امام احمد رضا بریلوی کے تلمیذ وخلیفہ اور سوانح نگار مولانا محمد ظفر الدین قادری رضوی (وصال ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء) پرنسپل شمس الہدیٰ پٹنہ لکھتے ہیں—

''اسی زمانہ میں مسٹر گاندھی بریلی شریف پہنچے اور اعلیٰ حضرت (امام احمد رضا بریلوی) سے ملنے کے متمنی ہوئے۔ اعلیٰ حضرت نے قبول نہ فرمایا اور انکار فرمادیا۔ یہاں تک کہ بعض حضراتِ اھل سنت مخلصینِ اعلیٰ حضرت نے بھی سفارش کی اور اسی کو قرینِ مصلحت سمجھا کہ اعلیٰ حضرت ان کی استدعاء کو رد نہ فرمائیں اور ملاقات کا تھوڑا سا وقت مسٹر گاندھی کو دے دیں۔

اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ وہ مجھ سے دینی امور میں گفتگو کریں گے یا دنیوی بہبود کے متعلق؟ دینی امور میں گفتگو کر نہیں سکتے کہ وہ ہمارے دین سے واقف نہیں۔ رہا دنیوی بہبود کے متعلق تو جب میں نے اپنی دنیوی بہبود کی طرف توجہ نہ کی تو دوسروں کی دنیا سنوارنے کی فکر میں کس طرح اپنا وقت ضایع کرسکتا ہوں؟

آپ حضرات جانتے ہیں کہ خداوندِ عالم کی دی ہوئی نعمت ترکۂ آبائی سے میری کافی معیشت ہے مگر میں نے کبھی اس کی طرف توجہ نہ کی۔ (بھائی) حسن میاں رحمۃ اللہ علیہ انتظام کرتے رہے۔ ان کے انتقال کے بعد (بھائی محمد رضا خاں) ننھے میاں سلّمہٗ اس کی دیکھ بھال

کرتے ہیں۔ یہ سن کر وہ لوگ خاموش ہو گئے۔(ص:۴۳۴۔حیات اعلیٰ حضرت (سال تصنیف ۱۹۳۸ء)مطبوعہ مکتبہ نبویہ، گنج بخش روڈ، لاہور۔۲۰۰۳ء)

مولانا محمد علی جوہر و مولانا شوکت علی کی امام احمد رضا بریلوی سے ملاقات و گفتگو کا ایک اہم واقعہ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

''تحریکِ آزادی کے سلسلے میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی آپ کی خدمت میں بریلی حاضر ہوئے اور عرض کی کہ آپ ایک وسیع حلقے کے روحانی پیشوا ہیں۔آپ تحریکِ آزادیِ ہند کے سلسلے میں کانگریس کا ساتھ دیں تو آپ کی شخصیت حالات پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔

آپ نے فرمایا کہ مولانا! میری اور آپ کی سیاست میں فرق ہے۔آپ ہندو مسلم اتحاد کے حامی ہیں اور میں مخالف ہوں۔

علی برادران باہر جا چکے تو مولانا محمد علی جوہر مولانا شوکت علی سے کہنے لگے کہ مولانا احمد رضا خشک ہیں۔

آپ صاحبِ کشف بزرگ تھے۔فوراً کشف سے ان کے احوال پر مطلع ہوئے اور مولانا محمد علی جوہر کو بلایا اور کہا کہ مولانا! میں خشک نہیں ہوں۔ ملک آزاد کرانا ہے تو مسلمانوں کی اپنی علیحدہ تنظیم بنائیں اور ہندوؤں سے بالکل علیحدہ ہو جائیں۔

مولانا جوہر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دست بوسی کی اور حضرت کے موقف سے آگاہ ہوئے۔(ص:۲۔روزنامہ کوہستان لاہور وملتان۔شمارہ،۸/مئی ۱۹۶۹ء)

تحریک خلافت وترک موالات کے علما و قائدین کی حرکات کے بارے میں مولانا اشرف علی تھانوی (متوفی ۱۹۴۳ء) کہتے ہیں——

''اوران لیڈروں کی کیا شکایت کی جاوے؟ بعض مولوی ایسے بدحواس ہوئے کہ نہ ان کو دنیا کی خبر رہی اور نہ ہی دین کی۔ ایمان تک قربان اور نثار کرنے کو تیار ہو گئے۔اور ایک مولوی صاحب نے گاندھی کے عشق میں اپنے ایمان اور دین اور اس میں گذری ہوئی عمر کو اس پر نثار کرنے کا اس شعر میں اقرار کر لیا ہے۔

عمرے کہ بآیات واحادیث گذشت رفتی و نثارِ بت پرستی کردی

ایک لیڈر صاحب نے یہ کہا کہ ''اگر نبوت ختم نہ ہوتی تو گاندھی مستحق نبوت تھا''۔
حیرت ہے کہ ایسا کم فہم نبی ہوتا؟ اگر فہیم ہوتا تو پہلے آخرت پر ایمان لاتا۔'' (ص:۱۲۵۔ حصہ پنجم۔الافاضات الیومیہ۔مولانا اشرف علی تھانوی۔مطبوعہ کراچی)

''یہ پہلے ہی سے اسلام اور ایمان کو ہتھیلی پر لیے پھرتے تھے۔اوپر سے طاغوت کا سہارا مل گیا۔سب کچھ اس کی نذر کر دیا۔ماتھے پر قشقے لگوائے۔جے کے نعرے بلند کیے۔ہندوؤں کی ارتھیوں کو کاندھا دیا۔مساجد میں منبروں پر کافروں کو بٹھا کر مسلمانوں نے مذکر بنا دیا۔حضور ﷺ کے مصلیٰ کی بے حرمتی کی۔آیات و احادیث میں گذری ہوئی عمر کو ایک کافر بت پرست پر نثار کر دیا۔لیڈروں کی اجازت سے مسلمان والنٹیروں نے رام لیلا کا انتظام کیا۔یہ علی الاعلان شایع کیا گیا کہ اگر نبوت ختم نہ ہوتی تو فلاں طاغوت نبی ہوتا—'' (ص:۸۰۔الافاضات الیومیہ،مولانا اشرف علی تھانوی۔جلد ہشتم،مطبوعہ تھانہ بھون)

مولانا خلیل احمد انبیٹھوی سہارن پوری کے احوال و افکار کا ذکر کرتے ہوئے مولانا عاشق الٰہی میرٹھی (متوفی ۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء) لکھتے ہیں۔

''اسی طرح جس وقت گائے کے ذبحے کا ترک شروع ہوا اور بہتیرے مولویوں نے بھی اس کو مباح قرار دے کر بہ مصالحِ دینیہ ترجیح ترک پر فتویٰ دیے تو آپ نے سکوت پسند نہیں کیا۔اور شعار اسلام ہونے کے لحاظ سے اس کی ضرورت علماً و عملاً محقق فرمائی۔اس وقت آپ پر سب وشتم ضرور ہوا مگر چند ہی روز بعد اس کا نتیجہ دیکھ کر ممانعت کا فتویٰ دینے والے خود فرضیت کا فتویٰ دینے لگے۔

غرض اس اصول کے آپ ہمیشہ پابند رہے کہ ہر کارے و ہر مردے۔دنیوی ضروریات پر جس طرح نظر لیڈران قوم کی جائے گی اسی طرح دینی ضروریات پر اول نگاہ پڑنا علما و مشائخ کا منصب ہے۔کہ لیڈرانِ قوم کا فتویٰ جس میں وہ علما کو متفق کرنے کی کوشش کریں کسی طرح دین نہیں ہو سکتا۔ایک بار آپ نے افسوس کے ساتھ فرمایا۔مسلمان اس شورش میں ہلاک ہو جائیں گے کہ لیڈران کو کرلیا آگے اور مولوی ہو لیے ان کے پیچھے۔(ص ۲۱۸۔تذکرۃ الخلیل از مولانا عاشق الٰہی میرٹھی۔مطبوعہ الخلیل مشین پریس میرٹھ)

مولانا شبیر احمد عثمانی شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل گجرات وصدر مہتمم دارالعلوم دیو بند (متوفی ۱۳۶۹ھ/ دسمبر ۱۹۴۹ء) تحریک خلافت وترک موالات کے حامی ہونے کے باوجود لکھتے ہیں کہ:

—''بہت سے خیر خواہ ''ہندو مسلم اتفاق'' کے عواقب کے بعد عوام الناس اور بعض لیڈروں کی ان غلط کاریوں پر متنبہ فرمارہے ہیں جو اس اتفاق کے جوش سے پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً قربانی گاؤ میں بعض جگہ تشدد و مزاحمت کیا جانا، یا قربانی کے جانور کو سجا کر رضا کاران خلافت کا گئو شالہ پہنچانا، یا قشقہ لگانا، یا ہندوؤں کی ارتھیوں کے ساتھ خصوصاً ''رام رام ستیہ ہے'' کہتے ہوئے جانا، یا یہ کہنا کہ امام مہدی کی جگہ امام گاندھی تشریف لائے ہیں۔ یا یہ کہ اگر نبوت ختم نہ ہوگئی ہوتی تو مہاتما گاندھی نبی ہوتے یا قرآن وحدیث میں بسر کی ہوئی عمر کو نثارِ بت پرستی کرنا...... بلاشبہ میں بھی جب اپنی قوم کے بڑے سربرآوردہ لوگوں کو سنتا ہوں کہ وہ اس قسم کے محرمات یا کفریات کے مرتکب ہوتے ہیں اور وہ باتیں زبان سے بے دھڑک نکال دیتے ہین جن کو سن کر ایک مسلمان کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں تو میرا دل پاش پاش ہوجاتا ہے۔ الخ (ص:۴۷۔ علامہ شبیر احمد عثمانی۔ از ڈاکٹر علی ارشد۔ مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ ۲۰۰۵ء)

شاعر مشرق ڈاکٹر محمد اقبال (متوفی ۱۹۳۸ء) پہلے خلافت کمیٹی پنجاب کے سکریٹری تھے پھر اس سے مستعفی ہوگئے۔ ان کے صاحبزادے مسٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں:

> ''اقبال مسئلہ خلافت پر مسلمانوں کے ہندوؤں کے ساتھ مل کر عدم تعاون کی تحریک میں شرکت کے خلاف تھے۔ کیوں کہ کسی قابلِ قبول ہندو مسلم معاہدہ کے بغیر محض انگریز دشمنی کی بنا پر قومیتِ متحدہ کی تعمیر ممکن نہ تھی۔ علاوہ اس کے انھیں خدشہ تھا کہ کہیں ایسے اشتراک اور مسلمانوں کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر قومیتِ متحدہ کے داعی ان کی علیحدہ ملّی حیثیت نہ ختم کردیں۔ جس کے سبب بعد میں انھیں پشیماں ہونا پڑے۔ انھیں اختلاف کی بنا پر اقبال نے صوبائی خلافت کمیٹی سے استعفاء دے دیا''
>
> (ص:۲۴۸۔ ج دوم۔ زندہ رود۔ از جاوید اقبال۔ مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور)

ڈاکٹر اقبال اپنے ایک مکتوب بنام مولانا سید سلیمان ندوی میں لکھتے ہیں—

''اسلام کا ہندوؤں کے ہاتھوں بک جانا گوارانہیں ہوسکتا۔افسوس اہل خلافت اپنی اصل راہ سے بہت دور جا پڑے۔ وہ ہم کوایک ایسی قومیت کی راہ دکھا رہے ہیں جس کوکوئی مخلص ایک منٹ کے لئے قبول نہیں کرسکتا۔(ص:۲۴۹۔ ج دوم۔ زندہ روداز جاوید اقبال مطبوعہ لاہور)

نواب مشتاق احمد خاں حیدرآبادی صاحبزادۂ نواب فخر یار جنگ سابق وزیر مالیات حیدر آباد دکن اپنے ایک مضمون میں اپنا یہ چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں:

''مولانا سید سلیمان اشرف (صدر شعبۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) اپنے خیالات کا اظہار کھلم کھلا اور لگی لپٹی کے بغیر کردیتے تھے۔ رو میں بہ جانے والے لوگوں نے خاص کر بعض علمائے کرام نے انھیں بہت برابھلا کہا اور اخباروں رسالوں میں لعن طعن ہوتی رہی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔

ایک دن جب وہ تفسیر کا درس دے رہے تھے۔ مولانا محمد علی جوہرؔ جنھوں نے اس زمانہ میں اپنا مستقر علی گڑھ بنالیا تھا، طلبہ کے ایک گروہ کے ساتھ مسجد (مسلم یونیورسٹی) میں تشریف لائے اور قریب آکر مولانا پر ایک طنزیہ فقرہ'' چست کردیا۔

.................اس کے بعد جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا۔ مولانا کی اعلیٰ شخصیت اور کردار کی بلندی کا واضح ثبوت مل گیا۔ وہ نہ صرف اپنے موقف پر ڈٹے رہے بلکہ اس گرما گرم بحث میں مولانا محمد علی جوہرؔ جیسے شخص کو نیچا دکھادیا۔ اس دن میں نے مولانا کو بڑے جلال میں دیکھا۔ اور ان کی یہ بات میں کبھی نہیں بھول سکتا کہ:

آپ لوگوں نے مذہبی اصول اور فقہی مسائل کو تماشہ بنادیا ہے۔ میں زندہ رہا تو دیکھوں گا کہ کون حق پر ہے۔(ص:۹۲۔ ماہنامہ ضیائے حرم لاہور۔ شمارہ جون ۱۹۷۷ء)

پروفیسر محمد مسعود احمد مجددی دہلوی (ولادت ۱۳۴۹ھ/ ۱۹۳۰ء۔ دہلی، مقیم کراچی) تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت مفتی اعظم محمد مظہر اللہ مجددی دہلوی قدس سرہ بھی تحریک آزادی ہند سے الگ نہیں رہے۔ البتہ سیاسی معاملات میں بھی ہمیشہ شریعت کو پیش نظر رکھا۔ تحریک خلافت کے آغاز (۱۹۱۹ء) میں کچھ عرصہ شریک رہے لیکن جب تحریک ترک موالات کا آغاز (۱۹۲۰ء) ہوا تو اس سے علیحدہ ہوگئے۔ اور ہندو مسلم اتحاد کے خلاف فتویٰ دیا۔ اس فتویٰ کی بنیاد سیاسی نہ تھی بلکہ خالصۃً شرعی تھی۔

مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی سے حضرت کے مخلصانہ تعلقات تھے۔ یہ حضرات،

حضرت کے پاس آتے جاتے تھے۔ چنانچہ مولانا منور حسین سیف الاسلام تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی صاحبان بھی حضرت مفتی اعظم (دہلی) سے ملتے جلتے تھے مگر حضوری کے بعد یہی کہتے تھے کہ مفتی صاحب اٹل ہیں۔ مشرکوں کے ساتھ کسی صورت میں اشتراک کو جائز نہیں سمجھتے۔''

حضرت نے ہمیشہ سیاسی معاملات کو شریعت کی کسوٹی پر پرکھا۔ اور اس دینی وسیاسی بصیرت کا ثبوت دیا جو ان کے معاصرین علماء میں ماسوا چند ایک کے کسی کو حاصل نہ تھی۔ ترک موالات کے علاوہ جب مشرکینِ ہند کی تالیفِ قلوب کے لئے گائے کی قربانی ترک کرنے کی تحریک خود مسلمانوں کی طرف سے شروع ہوئی تو حضرت نے سخت مزاحمت فرمائی اور اس کے خلاف فتویٰ دیا۔ (ص ۳۰۔ حیات مظہری از پروفیسر محمد مسعود احمد مطبوعہ کراچی)

روزنامہ پیسہ لاہور نے ''آہ! مولانا احمد رضا خاں صاحب'' کے عنوان سے اپنے تعزیتی اداریہ میں لکھا:

''ترک موالات کے متعلق مرحوم (مولانا احمد رضا بریلوی) کی رائے یہ تھی کہ مسلمانوں کے لئے ترک موالات کا حکم صاف اور عام ہے تو اس میں استثناء کی ضرورت نہیں۔ وہ یہ کہ جب اسلام میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے ساتھ یکساں ترک موالات کا حکم ہے تو جس طرح انگریزوں سے اور ان کی حکومت سے ترک موالات کیا جاتا ہے ویسے ہی ہندوؤں سے بھی جو مشرکین میں شمار کیے جاتے ہیں ترک موالات ہونی چاہیے۔ یہ منطق نہایت کمزور ہے کہ انگریزوں سے تو ترک موالات ہو اور ہندوؤں سے محض سیاسی اتحاد کے لئے موالات روا رکھی جائے۔ (روزنامہ پیسہ لاہور۔ شمارہ ۳ نومبر ۱۹۲۱ء)

مولانا سید سلیمان اشرف صدر شعبۂ علوم اسلامیہ یونیورسٹی علی گڑھ کے ایک حاضر باش فیض یافتہ اور اردو کے مشہور ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی اس دور کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ یہاں یہ بات واضح رہے کہ سید سلیمان اشرف نے ''النور'' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو ۱۹۲۰ء ہی میں انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ سے شائع ہوئی تھی اور تحریکِ خلافت وتحریکِ ترکِ موالات کے سلسلے میں سید سلیمان اشرف کا وہی موقف تھا جو امام احمد رضا بریلوی کا تھا۔

''۱۹۲۱ء کا زمانہ ہے۔ نان کوآپریشن کا سیلاب اپنی پوری طاقت پر ہے۔ ''گائے کی

قربانی'' اور''موالات'' پر بڑے بڑے جید اور مستند لوگوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کردیا ہے۔اس زمانہ کے اخبارات، تقاریر، تصانیف اور رجحانات کا اب اندازہ کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیا سے کیا ہوگیا؟

اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ ہورہا ہے اور جو کچھ کہا جارہا ہے وہی سب کچھ ہے۔ یہی باتیں ٹھیک ہیں۔ان کے علاوہ کوئی اور بات ٹھیک ہو ہی نہیں سکتی۔کالج (علی گڑھ) میں عجیب افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔مرحوم (سید سلیمان اشرف) مطعون ہورہے تھے لیکن چہرہ پر کوئی اثر نہ تھا اور نہ معمولات میں کوئی فرق۔

سیلاب گذر گیا۔جو کچھ ہونے والا تھا وہ بھی ہوا۔لیکن مرحوم (سید سلیمان اشرف) نے اس عہدِ سراسیمگی میں جو کچھ لکھ دیا تھا آج تک اس کی سچائی اپنی جگہ قائم ہے۔سارے علما سیلاب کی زد میں آچکے تھے۔صرف مرحوم اپنی جگہ قائم تھے۔(گنجہائے گراں مایہ۔مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی۔از پروفیسر رشید احمد صدیقی)

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے مواقع پر خود امام احمد رضا بریلوی نے کیا عملی اقدامات کیے؟ اس کے جواب میں حضرت مولانا سید اولادِ رسول محمد میاں قادری برکاتی مارھروی (وصال ۱۳۷۵ھ/ ۱۹۵۶ء) کی یہ تحریر ملاحظہ فرمائیں۔

''آج (۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء) سے برسوں پہلے جنگ بلقان (۱۲-۱۹۱۱ء) کے موقعہ پر انھوں (مولانا احمد رضا بریلوی) نے سلطنتِ اسلامی و مظلومین مسلمین کی اعانت و امداد کی مناسب و صحیح شرعی تدابیر لوگوں کو بتائیں۔عام طور پر شائع کیں۔قولاً و عملاً ان کی تائید کی۔خود چندہ دے کر عوام کو اس کی طرف رغبت دلائی۔اور اب بھی لوگوں کو صحیح مفید شرعی طریقے اعانتِ اسلام و مسلمین کے بتاتے رہے۔

مولانا احمد رضا خاں صاحب جو عملی کوشش کر سکتے تھے انھوں نے کیں۔خود چندہ دیا اور اپنے زیر اثر لوگوں سے دلایا۔مسلمانوں کو اسلامی سلطنت کی امداد و اعانت پر توجہ و رغبت دلائی۔ تحفظ سلطنتِ اسلامی کی مفید و کارگر تدابیر بتائیں۔یہ عملی کوشش نہیں تو کیا ہے؟ (ص:۱۲۔برکاتِ مارھرہ و مہمانانِ بدایوں۔مطبوعہ حسنی پریس بریلی از اولادِ رسول محمد میاں قادری برکاتی)

اس بحث کے آخر میں امام احمد رضا بریلوی کا یہ بیانِ ھدایت نشان ملاحظہ فرمائیں:

''آؤاب تمھیں قرآن عظیم کی تصدیقِ دکھائیں اور ان کی طرف سے اس میل اور میل کا راز بتائیں۔ دشمن اپنے دشمن سے تین باتیں چاہتا ہے۔ (۱) اول اس کی موت کہ جھگڑا ہی ختم ہو۔ (۲) دوسرا یہ نہ ہو تو اس کی جلاوطنی کہ اپنے پاس نہ رہے۔ (۳) سوم! یہ بھی نہ ہو سکے تو اخیر درجہ اس کی بے پَری کہ عاجز بن کر رہے۔

مخالف نے یہ درجے ان پر طے کردیے اور ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں، خیر خواہ ہی سمجھے جاتے ہیں۔

(۱) اولاً:— جہاد کے اشارے ہوئے، اس کا کھلا نتیجہ ہندوستان کے مسلمانوں کا فنا ہونا تھا۔ (۲) ثانیاً:— جب یہ نہ بنی تو ہجرت کا بھرّ ادیا کہ کسی طرح دفع ہوں۔ ملک ہماری کبڈیاں کھیلنے کو رہ جائیں۔ یہ اپنی جائدادیں کوڑیوں کے مول بیچیں یا یوں ہی چھوڑ کر جائیں۔ بہرحال ہمارے ہاتھ آئیں۔ ان کی مساجد، مزاراتِ اولیاء ہماری پامالی کو رہ جائیں۔ (۳) ثالثاً:— جب یہ بھی نہ نبھی تو ترکِ موالات کا جھوٹا حیلہ کر کے ترکِ معاملت پر ابھارا ہے کہ نوکریاں چھوڑ دو، کسی کونسل کمیٹی میں داخل نہ ہو، مال گذاری ٹیکس کچھ نہ دو، خطابات واپس کر دو، امرِ اخیر تو صرف اس لئے کہ ظاہر نام کا دنیاوی اعزاز بھی کسی مسلمان کے لئے نہ رہ جائے، اور پہلے تین اس لئے کہ ہر شعبہ اور محکمے میں صرف ہنود رہ جائیں۔ (المحجۃ المؤتمنۃ مطبوعہ بریلی)

یہاں میں تاریخ ماضی کا ایک ورق الٹنا اور تاریخی اعتبار سے بھی قارئین کو یقین دلانا چاہوں گا کہ امام احمد رضا بریلوی نے جو کچھ لکھا اس کی شہادت مذہب کے ساتھ تاریخ بھی دے رہی ہے اور امام احمد رضا کا موقف مبنی بر حقیقت تھا۔

خواجہ الطاف حسین حالی (متوفی ۱۹۱۴ء) لکھتے ہیں۔ ''۱۸۳۵ء میں سرکاری دفتروں اور عدالتوں کی زبان اردو قرار دی گئی تھی۔ اگر اور صوبوں کی نسبت کسی کو کچھ تأمل ہو تو شمال مغربی اضلاع کی نسبت کسی کو بھی تأمل نہیں ہو سکتا کہ یہاں کی قومی زبان اردو ہے۔ یہ صوبہ ان دو شہروں سے گھرا ہوا ہے جو اردو زبان کے سرچشمے سمجھے جاتے ہیں۔ یعنی دہلی اور لکھنؤ۔

اس صوبہ کے ہندو عموماً اردو سے ایسے مانوس ہیں جیسے مسلمان۔ مگر حضرت تعصب وہ ذات شریف ہیں جن کا مقولہ ہے کہ ''من بجہنم لیکن تختۂ یاراں تباہ گردد''۔

فرانس کے مشہور اورینٹلسٹ گارساں دتاسی جنھوں نے اردو زبان کی تحقیقات میں اپنی عمر

صرف کی وہ اس متنازعہ مسئلہ کی نسبت ایک لیکچر میں لکھتے ہیں۔ ''ہندو اپنے تعصب کی وجہ سے ہر ایک ایسے امر کے مزاحم ہوتے ہیں جو ان کو مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلائے۔''

اسپین والوں نے بھی مسلمانوں کے زوال سلطنت کے بطور اسی طرح مسلمانوں کی نشانیاں مٹائی تھیں مگر انھوں نے اپنی حکومت کے زمانہ میں ایسا کیا تھا اور ہمارے ہم وطن بھائی محکوم ہونے کی حالت میں ایسے ارادے رکھتے ہیں۔ (ص۱۴۴۔ حیات جاوید از خواجہ الطاف حسین حالی۔ مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو نئی دہلی۔ طبع پنجم ۲۰۰۴ء)

''اردو زبان جو درحقیقت ہندی بھاشا کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے اور جس میں عربی و فارسی سے صرف کسی قدر اسما اس سے زیادہ شامل نہیں ہیں جتنا کہ آٹے میں نمک ہوتا ہے۔ اس کو ہمارے ہم وطن بھائیوں نے صرف اس بنا پر مٹانا چاہا کہ اس کی ترقی کی بنیاد مسلمانوں کے عہد میں پڑی تھی۔

چنانچہ ۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سر برآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی خط کو موقوف کرانے میں کوشش کی جائے۔ اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔

سرسید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقعہ تھا جب کہ مجھے یقین ہو گیا کہ ''اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے''۔

ان کا بیان ہے کہ ''انھیں دنوں میں جب کہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا ایک روز مسٹر شکسپیر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے، میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر انھوں نے کہا کہ یہ پہلا موقعہ ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے۔ اس سے پہلے تم عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا۔ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے اس سے زیادہ مخالفت وعناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔ انھوں نے کہا کہ اگر آپ کی یہ پیشن گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہے۔ میں نے کہا۔ مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔'' (ص:۱۴۱۔ حیات جاوید از خواجہ حالی)

''مارچ ۱۸۹۸ء میں جس کی ستائیسویں کو سرسید نے دنیا سے رحلت کی، حضور سر مکڈانل

لفٹننٹ گورنر اضلاع شمال مغرب واودھ کی خدمت میں دونوں صوبوں کے بڑے بڑے اور معزز سربرآوردہ ہندوؤں نے پھر ایک میموریل اس غرض سے گذارا کہ تمام سرکاری عدالتوں اور کچہریوں میں بجائے اردوزبان اور فارسی خط کے ہندی بھاشا اور ناگری خط جاری کیا جائے۔

اگرچہ اس زمانہ میں سرسید پر ہجوم رنج والم کے سبب ایسا سکتہ کا سا عالم طاری تھا کہ وہ بالکل نقشِ دیوار بن گئے تھے مگر اسی حالت میں انھوں نے اس مضمون پر ایک آرٹیکل لکھا جو ۱۹/ مارچ کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں سرسید کی وفات سے نو دن پہلے شایع ہوا۔ اور جو کمیٹی مسلمانوں نے الہٰ آباد میں اردو کی حمایت کے لئے قائم کی تھی اس کو اس باب میں بذریعہ تحریر کچھ مشورے دیے۔ اور لکھا کہ اگرچہ اب مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا لیکن جہاں تک ممکن ہوگا میں ہر قسم کی مدد دینے کو موجود ہوں۔

ان کو یقین ہو گیا تھا کہ ہندوؤں کا یہ کام درحقیقت محض قومی تعصب پر مبنی ہے اس لئے وہ اپنے ہندو دستوں کی ناراضی کی مطلق پروانہیں کرتے تھے۔ (ص:۱۴۲۔۱۴۳۔حیات جاوید از خواجہ حالی)

ہندو مسلم اتحاد کے مضر اثرات سے عاجز آکر چند سال بعد ہی مولانا محمد علی جوہر و مولانا حسرت موہانی وغیرہ نے جو موقف اختیار کیا اور مولانا جمال میاں فرنگی محلی فرزند مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے جو راہ اختیار کی اس سے اہل علم واصحابِ مطالعہ اچھی طرح واقف ہیں۔ گویا عملی طور پر ان حضرات نے امام احمد رضا بریلوی کے موقف پر مہر تصدیق ثبت کردی۔

(۵) عام مسلمانوں میں تفریق وتکفیر کی تاریخ پر پردہ ڈالنے کے لئے اس کا آغاز بریلی سے کیا جانا اہلِ توھُّب کا شیوہ بن چکا ہے جب کہ مسلمانوں کو کافر ومشرک بنانے اور گھر گھر میں تفریق پیدا کرنے کا سہرا اس دہلی کے سر ہے جس کا رشتہ نجد سے ملتا ہے۔ اس دہلی سے ہرگز نہیں ملتا جس کا روحانی تعلق بائیس خواجگان کی چوکھٹ اور اس کے توسط سے آستانۂ نبوی اور سرزمین حجاز سے جا ملتا ہے۔ کیا مضمون نگار کو یہ معلوم نہیں کہ تقویۃ الایمان از شاہ محمد اسمٰعیل دہلوی (متوفی ۱۸۳۱ء) کی تردید وابطال میں خود معاصر علما ومشائخ ہند نے درجنوں کتابیں لکھیں؟ اور یہ تقویۃ الایمان ہی متحدہ ہندوستان کے اندر تفریق وتکفیر کی خشتِ اول ثابت ہوئی؟

مسلمانوں کے درمیان شورش پیدا کرنے، انھیں لڑانے بھڑانے، اور شرک خفی کو شرکِ جلی لکھنے کے اقراری مجرم تو خود شاہ اسمٰعیل دہلوی ہیں۔ انھوں نے ہی تو یہ اقبال جرم کیا ہے کہ——

''میں نے یہ کتاب لکھی ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس میں بعض جگہ ذرا تیز الفاظ آ گئے ہیں۔ اور بعض جگہ تشدد بھی ہو گیا ہے۔ مثلاً ان امور کو جو شرک خفی تھے شرکِ جلی لکھ دیا ہے۔ ان وجوہ سے مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی اشاعت سے شورش ضرور ہو گی۔ (چند جملوں کے بعد) گو اس سے شورش ہو گی مگر توقع ہے کہ لڑ بھڑ کر خود ٹھیک ہو جائیں گے۔ (ص ۹۸۔ حکایت ۵۹۔ حکایات اولیاء (ارواحِ ثلثہ) از مولانا اشرف علی تھانوی۔ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند)

انھیں کے بارے میں تو مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ — ''شاہ عبدالعزیز کے بعد جب انھوں نے تقویۃ الایمان اور جلاء العینین لکھی تو تمام علماء میں ہلچل پڑ گئی۔ ان کے رد میں سب سے زیادہ سرگرمی مولانا منورالدین (تلمیذ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی) نے دکھائی۔ متعدد کتابیں لکھیں (چند جملوں کے بعد) ہر طرح سمجھایا لیکن جب ناکامی ہوئی تو بحث ورد میں سرگرم ہوئے اور جامع مسجد (دہلی) کا شہرۂ آفاق مناظرہ ترتیب دیا جس میں ایک طرف مولانا اسمٰعیل اور مولانا عبدالحی تھے اور دوسری طرف مولانا منورالدین اور تمام علمائے دہلی۔ (ص: ۴۸ آزاد کی کہانی۔ مرتبہ عبدالرزاق ملیح آبادی۔ مکتبہ خلیل، اردو بازار لاہور)

اس وہابیت زدہ اسمٰعیلی فکر و تحریک کے خلاف علمائے دہلی مثلاً مولانا شاہ مخصوص اللہ بن شاہ رفیع الدین دہلوی، مولانا محمد موسیٰ بن شاہ رفیع الدین دہلوی، مولانا احمد سعید نقش بندی دہلوی، مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی، مولانا خیرالدین دہلوی، حکیم اجمل خاں کے حقیقی دادا حکیم صادق علی خاں دہلوی، مولانا رشیدالدین دہلوی وغیرہ نے اظہار برأت و بے زاری کیا۔ اس کے خلاف کتب و رسائل تحریر کیے۔ تقریریں کیں۔

اسی کے بارے میں تو مولانا شاہ مخصوص اللہ دہلوی (وصال ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۶۵ء) بن شاہ رفیع الدین دہلوی (وصال ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۸ء) بن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ —

''تقویۃ الایمان — کہ میں نے اس کا نام تفویۃ الایمان، ساتھ فا کے رکھا ہے۔ اس کے رد میں جو رسالہ میں نے لکھا ہے اس کا نام ''معید الایمان'' رکھا ہے۔ اسمٰعیل کا رسالہ ہمارے خاندان کے کیا کہ تمام انبیاء و رسولوں کی توحید کے خلاف ہے۔ (چند جملوں کے بعد) بڑے عم بزرگوار (شاہ عبدالعزیز) کہ وہ بینائی سے معذور ہو گئے تھے۔ اس کو سنا اور یہ فرمایا کہ — اگر بیماریوں سے معذور نہ ہوتا تو ''تحفۂ اثناعشریہ'' کا سا جواب اس کا رد بھی لکھتا۔ (تحقیق الحقیقہ

مطبوعہ ممبئی ۱۲۶۷ھ۔ بحوالہ ص: ۶۲۰۔ انوارِ آفتابِ صداقت مؤلفہ قاضی فضل احمد لدھیانوی۔ مطبوعہ کریمی پریس لاہور ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۲۰ء)

حضرت مولانا ظفر الدین قادری رضوی تحریر کرتے ہیں:

''زبانی اجلّۂ ثقات سے میں نے سنا کہ حضرت مولوی سید شاہ محمد فاخر صاحب الہ آبادی قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ جب اسمٰعیل دہلوی نے تقویۃ الایمان لکھی اور سارے جہاں کو مشرک و کافر بنانا شروع کیا اس وقت حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی صاحب آنکھوں سے معذور ہو چکے تھے اور بہت ضعیف بھی تھے۔ افسوس کے ساتھ فرمایا کہ میں تو بالکل ضعیف ہو گیا ہوں۔ آنکھوں سے بھی معذور ہوں، ورنہ اس کتاب اور اس عقیدۂ فاسدہ کا بھی تحفۂ اثنا عشریہ کی طرح ردلکھتا اور لوگ دیکھتے۔ (ص: ۵۳۱۔ حیات اعلیٰ حضرت از مولانا ظفر الدین رضوی۔ مکتبہ نبویہ لاہور ۲۰۰۳ء)

اسی تقویۃ الایمان از شاہ محمد اسمٰعیل دہلوی کے مضر اثرات اور خوفناک نتائج کی نشان دہی کرتے ہوئے معروف دیوبندی عالم سید احمد رضا بجنوری فرماتے ہیں کہ —

''افسوس ہے کہ اس کتاب کی وجہ سے مسلمانانِ ہند و پاک جن کی تعداد بیس کروڑ سے زیادہ ہے اور تقریباً نوے فی صد حنفی المسلک ہیں۔ دو گروہ میں بٹ گئے ہیں۔ (ص: ۱۰۷۔ انوار الباری۔ جلد ۱۱۔ مرتبہ سید احمد رضا بجنوری، مطبوعہ ناشر العلوم بجنور)

منصبِ امامت از شاہ محمد اسمٰعیل دہلوی پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا سید محمد میاں لکھتے ہیں:

''بدترین قیادت کی دو علامتیں بیان کی ہیں جو اس زمانہ میں سلطنتِ مغلیہ کے ذمہ داروں میں پائی جاتی تھیں۔ پھر ان کے متعلق یہ فیصلہ کیا ہے۔

پس دریں صورت بر افراختن اعلام قتل و قتال و بر انداختن آں مبتدع ضال در حق ملت و اھلِ ملت منفعتے خواہد بخشید۔ و اِلا بعوام و خواص بے شک مضرتے خواہد رسید (منصب امامت ص ۹۶ مطبوعہ مطبع فاروقی دہلی)

پس ایسی صورت میں علم بغاوت بلند کرنا اور اس گمراہ کو جو مذہب کے نام پر من مانی کر رہا ہے معزول اور برخاست کر دینا ملت کے لئے بھی مفید ہوگا اور اہل ملت کے لئے بھی۔ ورنہ ملک کے تمام ہی عوام و خواص کو بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑے گا۔

تقریباً ایک صفحہ کے بعد فرماتے ہیں۔

جہاد بر ایشاں از ارکانِ اسلام است و اہانت ایشاں اعانتِ اسلام۔ (منصب امامت

ص ۹۷) ان کے مقابلے میں جہاد کرنا اسلام کا رکن اور فرض ہے۔ اور ان کو ذلیل اور کمزور کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امداد و اعانت ہے۔

اس کے بعد ص ۹۸ پر اس سے بھی زیادہ سخت الفاظ استعمال کیے ہیں۔ (ص: ۲۵۔۲۶، علمائے ہند کا شاندار ماضی حصہ دوم از مولانا سید محمد میاں۔ مطبوعہ کتابستان دہلی ۶)

یہ انکشاف کس درجہ حیرت انگیز ہوگا کہ حضرت شاہ اسمٰعیل صاحب شہید سلطنتِ مغلیہ کے اولوالعزم فرماں رواؤں کی حکومت کو بھی "سلطنتِ ضالہ" اور گمراہ قیادت قرار دیتے ہیں۔ (حاشیہ ص ۲۵۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی حصہ دوم)

یہی وہ گروہ وھابیہ اسمٰعیلیہ ہے جس کے بارے میں سرسید نے اپنی کتاب اسباب بغاوت ہند مطبوعہ ۱۸۵۸ء میں لکھا ہے کہ —

> "دہلی میں ایک بڑا گروہ مولویوں اور ان کے تابعین کا ایسا تھا کہ وہ مذہب کی رو سے معزول بادشاہ دلی کو بہت برا اور بدعتی سمجھتے تھے۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ دلی کی جن مسجدوں میں بادشاہ کا قبض و دخل اور اہتمام ہے ان مسجدوں میں نماز درست نہیں۔ چنانچہ وہ لوگ جامع مسجد (دہلی) میں بھی نماز نہیں پڑھتے تھے۔ اور غدر سے بہت قبل کے چھپے ہوئے فتاویٰ اس معاملے میں موجود ہیں۔ پھر کبھی عقل قبول کر سکتی ہے کہ ان لوگوں نے جہاد کے درست ہونے میں اور بادشاہ کو سردار بنانے میں فتویٰ دیا ہو؟
> (ص: ۸۱۲۔ حیات جاوید۔ از خواجہ الطاف حسین حالی۔ مطبوعہ قومی کونسل، نئی دہلی۔ طبع پنجم ۲۰۰۴ء)
>
> "ترکوں کو بھی یہ لوگ بدعتی اور ائمۂ مسجد حرام و مسجد نبوی کو بھی بدعتی سمجھتے تھے اس لئے سید احمد رائے بریلوی صاحب نے مریدوں و عقیدت مندوں کو یہ حکم دے رکھا تھا کہ "جب دوسرے لوگ فارغ ہو جائیں تو اپنی جماعت کھڑی ہو۔ (ص: ۲۲۲۔ سید احمد شہید۔ از غلام رسول مہر، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور)

شاہ اسمٰعیل دہلوی نواب وزیر الدولہ رئیس ٹونک کو لکھتے ہیں:

> "معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان کے رہنے والے اکثر اسلام کے مدعی جن

میں عقل مند فضلا، مشائخِ طریقت، مغرور امراء، اوران کے فاسق و فاجر پیرو بلکہ تمام شریرالنفس منافق اور بد خصلت منافقوں نے دین محمدی کو خیر باد کہہ کے کفر وارتداد کا راستہ اختیار کرلیا ہے اور جہاد کی کوشش کرنے والوں پر طعن و تشنیع کی زبان کھول رکھی ہے۔ (ترجمہ مکتوب نمبر ۳۰۔ مکتوباتِ سید احمد شہید۔ مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی)

(۶) انجمن حمایت اسلام لاہور کے زیر اہتمام اسلامیہ کالج لاہور چلتا تھا جس کی کمیٹی کے جنرل سکریٹری علامہ اقبال تھے۔ اوران کے ایک دوست پروفیسر حاکم علی (متوفی ۱۳۶۴ھ/ ۱۹۴۴ء) پرنسپل تھے۔ پروفیسر حاکم علی نے ۱۴/صفر ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۰ء میں امام احمد رضا بریلوی سے ایک استفتاء کیا کہ ۲۰/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو اسلامیہ کالج لاہور کی جنرل کونسل کی میٹنگ میں مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا ہے کہ ترکِ موالات کے لئے ضروری ہے کہ حکومت کی طرف سے کالج کو ملنے والی امداد بند کی جائے اور یونیورسٹی سے کالج کا الحاق بھی ختم کیا جائے۔ پھر ۱۲/ربیع الاول ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۰ء میں چودھری عزیز الرحمٰن (ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول، لائل پور، پنجاب) نے بھی ایک استفتاء کیا کہ انگریزوں سے ترکِ موالات کے لئے اسلامیہ اسکولوں اور کالجوں کو حکومت سے امداد لینی اور یونیورسٹی سے الحاق باقی رکھنا کیسا ہے؟ انھیں سوالات کے جواب میں امام احمد رضا بریلوی نے المحجۃ المؤتمنۃ فی آیۃ الممتحنۃ (۱۳۳۹ھ) لکھ کر اس کے اندر تحقیق و تفصیل کے ساتھ موالات و معاملات کی حقیقت اوران کا فرق بتایا اوران کا شرعی حکم بھی تحریر کیا۔

امام احمد رضا بریلوی کے جواب سے پہلے یہ دو خیالات ملاحظہ فرمائیں:

(۱) بنارس میں ہندو طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے گاندھی نے کہا—" میں پنڈت مدن موہن مالویہ کا ہم خیال ہوں کہ طالب علموں کو اپنے ضمیر کے مطابق کارروائی کرنی چاہیے۔ میں آپ لوگوں سے بڑے زور کے ساتھ کہتا ہوں کہ اگر آپ میری دلیلوں سے قائل نہ ہوں تو ہرگز ہرگز (تعلیم سے) قطعِ تعلق کی پالیسی نہ اختیار کریں۔ (اخبارات ورسائل ۱۹۲۰ء)

(۲) سید سلیمان اشرف صدر شعبۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (وصال ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۹ء) لکھتے ہیں—" اس وقت ہندوستان میں مجموعی تعداد کالجوں کی ایک سو پچیس ہے۔ تین (علی گڑھ، لاہور، پشاور) مسلمانوں کے اور ایک سو بائیس ہندوؤں کے.......... سارے

کالجوں میں مجموعی تعداد ہندوستانی طلبہ کی چھیالیس ہزار چار سو سینتیس (46437) ہے۔ جن میں مسلمان چار ہزار آٹھ سو پچھتر (4875) ہیں۔ ہندو طلبہ کی تعداد اکتالیس ہزار پانچ سو باسٹھ (41562) ہے۔

جس قوم کی تعلیمی حالت یہ ہو کہ سات کروڑ میں سے صرف چار ہزار مشغول تعلیم (عصری) ہوں اس قوم کا یہ اِدعا اور ہنگامہ کہ اب ہمیں تعلیم کی حاجت نہیں۔ اگر خبط وسودا نہیں تو اور کیا ہے؟ (النور از سید سلیمان اشرف، مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ ۱۹۲۰ء)

حکومت سے اسکول و کالج کے لئے تعلیمی امداد و الحاق کے متعلق امام احمد رضا بریلوی مذکورہ سوالات کے جواب میں لکھتے ہیں:

"وہ الحاق و اخذِ امداد اگر نہ کسی امرِ خلاف اسلام ومخالفِ شرع سے مشروط نہ اس کی طرف منجر تو اس کے جواز میں کلام نہیں۔ ورنہ ضرور ناجائز اور حرام ہوگا۔" (المحجة المؤتمنة مطبوعہ بریلی)

خود مانعین کا طرز عمل ان کے کذبِ دعویٰ پر شاھد۔ ریل، ڈاک، تار سے تمتع کیا معاملت نہیں؟ فرق یہ ہے کہ اخذِ امداد میں مال لینا ہے اور ان (چیزوں) کے استعمال میں دینا۔ عجب کہ مقاطعت میں مال دینا حلال ہو اور لینا حرام؟

اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ریل، تار، ڈاک ہمارے ہی مِلک ہیں۔ ہمارے ہی دیے سے بنے ہیں۔ سبحٰن اللہ!

تعلیم کا روپیہ کیا انگلستان سے آتا ہے؟ وہ بھی یہیں کا ہے۔ تو حاصل وہی ٹھہرا کہ مقاطعت میں اپنے مال سے نفع پہنچانا مشروع اور خود نفع لینا ممنوع، اس اُلٹی عقل کا کیا علاج؟ (المحجة المؤتمنة از امام احمد رضا بریلوی مطبوعہ بریلی)

یہ ہیں وہ حقائق ومعلومات جن کے بارے میں فاضل مضمون نگار فرماتے ہیں کہ "مولانا احمد رضا خاں نے انگریزوں سے چندہ وصولی کو بھی جائز ٹھہرایا۔" اس اندھی دشمنی اور الٹی عقل کا کیا علاج؟

(۷) حضرت شیخ احمد بن زینی دحلان شافعی مفتی و قاضی شافعیہ (متولد ۱۲۳۲ھ/ ۱۸۱۷ء۔ متوفی ۱۳۰۴ھ ۱۸۸۶ء) ترکی حکومت کی جانب سے مفتی شافعیہ اور شیخ الاسلام تھے۔ حجاز مقدس سے قسطنطنیہ تک قدر ومنزلت اور عزت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اپنے پہلے سفرِ حج

۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء کے موقعہ پر امام احمد رضا بریلوی نے ان کی زیارت و ملاقات کا شرف حاصل کیا اور سندِ حدیث سے شیخ احمد زینی دحلان نے آپ کو سرفراز کیا۔ جس کا ذکر خود آپ کی بیان کردہ تحریروں اور آپ کے حالات و سوانح سے متعلق کتب میں جابجا مطبوعہ شکل میں ملتا ہے۔ اس کے باوجود اس افسانوی رنگ میں اسے بیان کیا گیا کہ مولانا احمد زینی دحلان اور مولانا احمد رضا خاں کی ایک ''خفیہ ملاقات'' ہوئی۔

اس ''خفیہ ملاقات'' کی میں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ افسانہ نگار کے اس بیان کردہ ''جرم'' (خفیہ ملاقات) میں ہندوستان کے مختلف مکاتب فکر کے بڑے بڑے علماء بھی ملوث اور شریک و سہیم ہیں۔ اور ''خفیہ ملاقات'' کر کے وہ شیخ احمد زینی دحلان سے وہ نعمت حاصل کر رہے ہیں جو ہر عالم دین کے سر کا تاج ہے۔ یعنی سندِ حدیث۔ جس کا سلسلہ رسول اکرم ﷺ سے وابستہ ہے۔

جلد ہشتم نزہۃ الخواطر مطبوعہ حیدر آباد مؤلفہ حکیم سید عبدالحئ رائے بریلوی ناظم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو (متوفی ۱۳۴۱ھ/ ۱۹۲۳ء) کی سرسری ورق گردانی کرنے پر شیخ احمد بن زینی دحلان سے سند حدیث حاصل کرنے والے جو اسماء نظر سے گذرے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

مولانا عبدالحئ فرنگی محلی لکھنوی (متوفی ۱۳۰۴ھ) مولانا سید عبداللہ بلگرامی (متوفی ۱۳۰۵ھ) مولانا محمد نعیم بن مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی لکھنوی (متوفی ۱۳۱۸ھ) مولانا محمد ابراہیم آروی (متوفی ۱۳۱۹ھ) مولانا شاہ محمد حسین الہ آبادی (متوفی ۱۳۲۲ھ) مولانا محمد بن غلام رسول سورتی (متوفی ۱۳۲۴ھ) مولانا قادر بخش سہسرامی (متوفی ۱۳۳۷ھ) مولانا ذوالفقار احمد بھوپالی (متوفی ۱۳۴۰ھ) مولانا خلیل احمد انبیٹھوی سہارن پوری (متوفی ۱۳۴۶ھ) مولانا نور احمد امرت سری (متوفی ۱۳۴۸ھ)

پایۂ حرمین حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی (متوفی رمضان ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء) و مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی و مولانا وزیر خاں اکبر آبادی نے جس پادری فنڈر سے آگرہ (در رجب ۱۲۷۲ھ/ مارچ ۱۸۵۶ء) میں مناظرہ کیا تھا اس کی کتاب ''میزان الحق'' کے جواب میں ''اظہار الحق'' کے نام سے مولانا کیرانوی نے کافی وشافی جواب مؤلف نزہۃ الخواطر کے بیان کے مطابق حضرت احمد زینی دحلان ہی کے حکم سے لکھا تھا۔ جب کہ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد آپ مکہ مکرمہ ہجرت کر گئے تھے۔ چنانچہ حکیم سید عبدالحئ رائے بریلوی آپ کے حالات کے تحت لکھتے ہیں:

فخرج من الهند و سافر الیٰ مکة المبارکة و اقام بمحلة الخندریسة ۔ و صنف بها "اظهار الحق" بامرِ السید احمد بن زینی دحلان الشافعی المکی سنة ثمانین ومأتین و الف۔ شرع فی تصنیفهٖ لست عشرة خلون من رجب و فرغ منه فی آخر ذی الحجة۔ و القی الرحل فی مکة۔ و أسس المدرسة الصولتیة فی رمضان سنة تسعین و مأتین و الف۔ (ص:۱٤۷۔ المجلد الثامن۔ نزهة الخواطر۔ المطبوعة بحیدر آباد الدکن سنة ۱۳۹۷ھ / ۱۹۷٦ء)

(۸) امام احمد رضا بریلوی کی تین کتابوں (اعلام الاعلام، دوام العیش، الحجۃ المؤتمنۃ) کا نام لکھ کر مضمون نگار نے شیخ احمد بن زینی دحلان سے بازی مارنے کی عامیانہ زبان استعمال کی ہے۔ ان تینوں کتابوں کے اصل مباحث و مسائل پر گذشتہ صفحات میں اچھا خاصا مواد آ گیا ہے۔ جن کے ذکر و اعادہ کی ضرورت نہیں۔ مضمون نگار نے عام قارئین کو مرعوب کرنے کے لئے ''مطالعۂ بریلویت'' از خالد محمود سے تین کتابوں کے نام نقل کر دیے ہیں۔ مباحث کو اچھی طرح سمجھنا تو دور کی بات ہے غالب امید یہی ہے کہ وہ اسمائے کتب کا ترجمہ بھی شاید ہی سمجھ پائیں اور اس کا بھی قوی امکان ہے کہ انھوں نے ان کتابوں کی کبھی صورت بھی نہ دیکھی ہوگی۔

(۹) یہی سلوک حضرت مولانا فضل رسول بدایونی (وصال ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء) اور آپ کی تین کتابوں کے ساتھ بھی کیا ہے کہ ''حق نمک کی ادائیگی کے طور پر فضل رسول بدایونی نے تین کتابیں تصنیف فرمائیں۔ (۱) سیف الجبار (۲) بوارقِ محمدیہ (۳) تصحیح مسائل۔''

ان کتابوں میں اثباتِ عقائد اہل سنت اور انکار و ابطالِ عقائد وھابیہ کے سوا اور کیا ہے جو مضمون نگار کی نظر میں قابل گرفت ہو؟ وہ غلطی سے یہی سمجھتے ہیں یا ان کے سرپرستوں نے انھیں یہی سمجھایا ہے کہ جیسے ہی کوئی شخص فرقۂ وھابیہ کی مخالفت کرے بس سمجھ لو کہ وہ انگریزوں کا ایجنٹ ہے۔ اب آگے کسی تحقیق و ثبوت اور کسی دلیل و برھان کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

حسن اتفاق کی بات ہے کہ حضرت مولانا فضل رسول بدایونی کی تالیف المعتقد المنتقد (۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳ء) پر امام احمد رضا بریلوی نے المعتمد المستند (۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) کے نام سے

ایک حاشیہ لکھا جو علماے حرمین کی خدمت (۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۶ء) میں پیش کیا گیا اور اس کی درجنوں علما و مشائخ حجاز نے تحریری تصدیق و تائید فرمائی۔ اس وھابیت شکن جُرم سے بڑا جُرم اور کیا ہوسکتا ہے جس پر واویلا مچانے اور ان علماے کرام کی شان میں زبان درازی کرنے کا موقعہ بلکہ بہانہ کچھ حضرات کو مل جائے؟

سیف الجبار از حضرت مولانا فضل رسول بدایونی کا نام مضمون نگار نے پہلے نمبر پر تحریر کیا جس کا ایک نمونہ آپ ملاحظہ فرمالیں۔ بس اسی سے آپ کو سب کچھ سمجھ میں آجائے گا۔

"مجلس جامع مسجد (دہلی) کی تفصیل یہ ہے کہ پہلے ایک استفتا مرتب ہوا بمہر و دستخط مولوی رشید الدین خاں صاحب و مولوی فضل حق صاحب و مولوی مخصوص اللہ صاحب و مولوی محمد موسیٰ صاحب و مولوی محمد شریف صاحب و مولوی عبداللہ صاحب واخون شیر محمد صاحب کے۔

صبح کے وقت منگل کے دن انتیسویں ربیع الثانی ۱۲۴۰ھ کو کہ مولوی عبدالحیٔ جامع مسجد (دہلی) میں وعظ کہہ رہے تھے۔

مولوی رشید الدین خاں صاحب و مولوی مخصوص اللہ صاحب اور مولوی محمد موسیٰ صاحب مولوی رفیع الدین صاحب مرحوم کے صاحبزادہ اور مولوی محمد شریف صاحب وغیرہ علما و طلبہ خاص و عام حوض پر مجتمع ہوئے۔ جب مولوی عبدالحی وعظ کہہ چکے عبید اللہ طالب علم نے استفتاء پیش کیا کہ اپنی مہر اس پر کردیجیے۔ مولوی عبدالحی نے کہا میں نہیں مہر کرتا کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ اس نے کہا یہی لکھ دیجیے اور اِصرار کیا۔ مولوی عبدالحی نے انکار کیا اور ملال ظاہر کرنے لگے۔ مفتی محمد شجاع الدین علی خاں صاحب نے کہا اس کا تصفیہ ضرور ہے کہ بڑا اختلاف پڑگیا ہے۔ مرزا غلام حیدر شاہزادے طالب علم کی تکرار سے رنجیدہ ہوئے اور مولوی عبدالحیٔ وغیرہ کو مجمع علما میں واسطے مناظرہ کے لائے۔ مجمع بیشمار خاص و عام امیر فقیر کا ہوگیا۔ کوتوال بھی واسطے بندوبست کے آپہنچا۔ پھر مولوی عبدالحیٔ نے فاضلوں سے پوچھا کہ تم کیوں آئے ہو؟ کسی نے کہا کہ آپ کے بلانے کے موافق کہ ہر روز کہا کرتے تھے کہ جس کو تاب مناظرہ کی ہو ہمارے سامنے آوے۔ سن کر چپ ہوگئے۔

مولوی موسیٰ نے کہا کہ تم ہمارے استادوں کو بُرا کہتے ہو۔ بولے کہ میں نہیں کہتا۔ مولوی موسیٰ نے کہا یہ ایسے مسئلے نئے بتاتے ہیں کہ ان سے برائی استادوں کی ثابت ہوتی ہے۔ پوچھا وہ

کیا ہے؟ کہا کہ مثلاً قبر کے بوسے کو شرک کہتے ہو اور ہمارے اکابر اس کے مباشر ہوتے تھے۔ مولوی عبدالحی نے انکار کیا۔ کسی نے کہا کہ لکھ دو تا کہ تمہارے اوپر جھوٹ باندھنے والوں کی تکذیب کی جاوے۔ مولوی عبدالحی نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے لکھ دیا۔ بوسہ دہندۂ قبر مشرک نیست۔

مولوی رشید الدین خاں صاحب کے ہاتھ میں فتویٰ دیا گیا اور قریب مولوی عبدالحی کے آبیٹھے۔ مولوی عبدالحیٔ نے گلہ شکوہ ان سے شروع کیا کہ خاں صاحب مجھے آپ کی خدمت میں دوستی تھی تم برملا مجھے ذلیل کرتے ہو۔ خاں صاحب نے فرمایا کہ ہم تمہارے اعزاز و اظہار کمال کے واسطے آئے ہیں۔ لوگوں نے مشہور کیا ہے کہ تم مسئلے خلاف سلف کے کہتے ہو۔ اس سبب سے تم سے خلق کو وحشت ہے۔ ایسے مجمع میں مفتریوں کی تکذیب ہو جاوے گی۔ مولوی عبدالحیٔ شکوے ہی کی پریشان باتیں کرتے رہے۔

خاں صاحب نے فرمایا کہ تمہارے لوگ کہتے ہیں کہ عبدالعزیز کی راہ راہ جہنم کی ہے۔ اسی وقت گواہی سے یہ بات ثابت ہوگئی۔ لوگ بُرا کہنے لگے۔ مولوی عبدالحیٔ نے بھی تبرا کیا باآواز بلند اور مولوی رشید الدین خاں صاحب سے کہا کہ مولانا عبدالعزیز کی محبت اور اعتقاد علم و بزرگی میں میں مثل تمہارے ہوں۔ طحاوی اور کرخی کے برابر جانتا ہوں۔

پھر استفسار شروع ہوا ہر مسئلے کا جواب دیا کہ چنداں مخالف جمہور کے نہ تھا۔ مولوی اسمٰعیل نے پہلے ہی استفسار سے ارادہ کیا اوٹھ جانے کا۔ مولوی رحمت اللہ صاحب نے کہا کہ ذرا تشریف رکھیے کہ جناب کے بھی دستخط اس تحریر پر ضرور ہیں۔ مولوی اسمٰعیل نے کہا کہ میں کسی کے باپ کا نوکر نہیں ہوں۔ میرے واسطے محتسب لا۔ اے مردود! میرے ساتھ سختی کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ حضرت میں سختی نہیں کرتا عرض کرتا ہوں۔ پھر مولوی اسمٰعیل نے کہا کہ میرے رسالہ کا جواب لکھ۔ مولوی رحمۃ اللہ صاحب نے کہا کہ رسالہ آپ کا میری بغل میں ہے اگر فرمائیے اسی مجمع میں جواب عرض کروں۔ غصہ کھا کر کچھ نہ کہا۔ پھر مولوی رحمۃ اللہ نے کہا کہ جواب عقلی لکھوں یا نقلی؟ کہا جیسا چاہے۔ پھر مولوی رحمۃ اللہ نے کہا کہ رد جواب اس کا لکھو گے؟ کہا کہ میں محکوم کسی کا نہیں ہوں۔ مولوی رحمۃ اللہ نے کہا کہ نئے عقیدے اپنے دل کے بنائے ہوئے کسی سے نہ فرمائیے۔ اور نہیں تو ابھی بحث کر لیجیے۔ مولوی اسمٰعیل اٹھ بھاگے۔ اور چلتے ہوئے رشید الدین خاں صاحب مولوی

عبدالحیٔ سے پوچھا کیے۔ وہ جواب دیتے تھے ایسے کہ قدما کے بہت خلاف نہ تھے۔

تیرہویں سوال میں کہ بدعت کی بحث تھی۔ مولوی عبدالحی نے کہا کہ میرے نزدیک بدعت حسنہ یہی ہے گو اصل ہر بدعت کی بد ہے مگر سبب نیکی کا اس میں ہو تو حسنہ ہو جاتی ہے و اِلّا فلا۔

مولوی رشید الدین خاں صاحب نے کہا کہ اصل ہر بدعت کی بد نہیں ہے بموجب حدیث من سن سنة حسنة و من سن سنة سيئة ۔الحدیث۔ کے اور حدیث من احدث فی امرنا هذا ما لیس منه اور حدیث من ابتدع بدعة ضلالة لا یرضا ها اللّٰه کہ ان تینوں حدیثوں سے ثابت ہوا کہ نیا طریقہ نیک بھی ہوتا ہے بد بھی۔ اور خدا اور رسول کی مرضی کے موافق بھی، مخالف بھی، گمراہ بھی، غیر گمراہ بھی۔ اسی سبب سے علما نے کہا ہے کہ بعض بدعت واجب و مندوب و مباح بعضے حرام و مکروہ۔

مولوی مخصوص اللہ صاحب نے کہا جس بدعت کی وجہ حسن و قبح کی ظاہر نہ ہو وہ کیا ہے؟ مولوی عبدالحیٔ نے کہا سیۂ۔ انھوں نے کہا اس تقدیر پر بدعت و مباح میں کیا فرق ہے؟ مولوی عبدالحیٔ ساکت ہو گئے۔ کسی نے کہا کہ احکام خمسہ میں سے ایک حکم کم ہو گیا۔ پھر مولوی عبدالحیٔ نے کہا کہ ہر بدعت کو برا اس واسطے کہتا ہوں کہ کل بدعة کا کلیہ ظاہر پر رہے اور مخصوص نہ ہو جائے۔ خاں صاحب نے کہا کہ تخصیص سے کیا قباحت لازم آتی ہے اور عمومات میں تخصیص مشہور ہے۔ مولوی محمد شریف نے پڑھا ما من عام اِلا و قد خص منه البعض۔ خاں صاحب نے کہا کہ تینوں حدیثیں مذکورہ بالا تخصیص کو چاہتی ہیں۔ پس تخصیص ضرور ہوئی۔ مولوی عبدالحیٔ نے کہا کہ اصل ہر بدعت کی قبیح بعض علما کا مذہب ہے۔ خاں صاحب نے کہا کہ یہ قول حضرت مجدد کا ہے مگر تمہارے مذہب سے نہایت دور کہ ان کے مذہب میں جس کی اصل شرع میں پائی جائے وہ سنت ہے۔ بدعت وہی ہے کہ جس کی اصل نہ پائی جائے۔

پھر مولوی عبدالحیٔ نے غوطہ میں جا کر کہا کہ یہ قول نووی کا فتح المبین میں لکھا ہے۔ اس وقت فتح المبین شرح اربعین امام نووی کی پیش کی گئی۔ عبارت اس مقام کی بآواز بلند مع ترجمہ پڑھی گئی۔ پھر تو مولوی عبدالحی اچھی طرح سے قائل معقول ہو گئے۔

پھر اذان میں بعد دفن کے کلام ہوا۔ بعد کسی قدر تکرار کے کہا کہ میں کسی کو منع نہیں کرتا۔

پھر کلام ہوا سوم کے فاتحہ میں۔ بعد قیل و قال کے کہا کہ اگر اس دن مین ثواب زیادہ جانتا ہے ممنوع اور اگر ثواب زائد نہیں جانتا اور برعایت مصلحت کے کرتا ہے تو منع نہیں ہے۔ تمام ہوا خلاصۂ نقل مجلس۔

پھر تو یہ حال ہوا کہ ہر ایک مسئلہ میں ادنیٰ ادنیٰ سے آدمی سے قائل ہونے لگے اور اطراف و جوانب میں بھی یہ تقریریں اور تحریریں جا بجا پھیل پڑیں۔ سب پر ظاہر ہو گیا کہ مولوی اسمٰعیل کا طریقہ مخالف ہے تمام سلف صالح کے اور اپنے خاندان کے بھی مخالف ہیں۔ اور سبب اعتبار کا وہی نسبت خاندان کی تھی۔ جب اس کے بھی خلاف ٹھہرے تو کچھ اعتبار نہ رہا اور ساری قلعی کھل گئی اور ہر ایک جگہ جو اہل علم تھے متوجہ ہوئے ان کی بے دینی کے اظہار اور اس کا رد لکھنے پر۔
ایسے سببوں سے آگ ان کے فتنے کی ٹھنڈی ہو گئی اور نئے دین والے انہیں پر زبان دبا کر بات کرنے لگے اور توجیہ بات بنانے میں اور تقیہ جاری ہوا۔ ہزاروں ہزار آدمی اس طریقے سے تائب ہوئے۔ صرف وہی لوگ کہ جن کو سخن پروری کا پاس دین پر غالب ہوا۔ یا جن کو وہ پیشہ واسطہ ہوا دنیا پیدا کرنے کا اُس طریق پر قائم رہے مگر نہایت ذلت و خواری کے ساتھ۔ اہل علم کی مجلسوں میں تقیہ سے گذارا کر کر۔
مولوی اسمٰعیل وغیرہ ارکانِ دین جدید نے بھی اس بحث کو کم کر کے وعظ کو منحصر کیا جہاد کی ترغیب پر۔ اس حیلۂ جمیلہ سے کہ امر محمود ہے بہت لوگ اکٹھے ہوئے اور روپیہ جنس بھی جس کو توفیق ہوئی بقدر حوصلہ دیا۔ ایک جماعت کے ساتھ گئے افغانستان کو اور سید احمد کو امیر المومنین بنایا اور سکھوں پر جہاد کا عزم کیا مگر اس میں بھی وہی پیشین گوئیاں کہ فلانی تاریخ رنجیت سنگھ رئیس کفرۂ سکھ امیر المومنین کے ہاتھ سے مارا جائے گا اور فلانی تاریخ فلاں ملک فتح ہو گا اور نماز عید کی فلانے سال میں امیر المومنین جامع مسجد لاہور میں پڑھیں گے۔ اور اللہ کا یوں حکم ہوا ہے اور لڑائی کے وقت توپ بندوق سکھ کی بند ہو جائے گی بلکہ بعض افغان اسی شرط پر داخل بیعت ہوئے تھے۔
.... جب فوج سکھ متوجہ پشاور ہوئی سننے کے ساتھ بھاگ کر راہ پنجتار کی لی۔ پنجتار کا رئیس فتح خان نام اور سب افغان بہت تعظیم و تکریم سے پیش آئے اور بیعت کی جہاد پر۔ اطاعت و

فرمانبرداری جیسی چاہیے ویسی کی۔ اپنے تمام ملک کا خراج بھی ''امیر المومنین'' کی سرکار میں داخل کرنا قبول کیا اور عامل حاکم ان کے اپنے اپنے مکانوں پر مقرر کرادیے۔ تحصیل وحکم ان کا جاری کرایا اور مقدور والوں نے جو بیچارے وہاں تھے اپنے گھر کے مال سے عورتوں کے زیور تک سے بھی دریغ نہ کیا۔ پاس ایمانداری کا جیسا چاہیے وہ بجالائے۔ واقع میں افغان کی قوم دین داری کے باب میں بڑی مضبوط ہیں۔ دین کے نام پر ان کو جان دینا ایسا عزیز ہے کہ اوروں کو جان رکھنا۔ مولوی اسمٰعیل اتنی ہی حکومت کا تحمل نہ کرسکے آپ سے باہر ہوگئے۔ تظلمات بیجا اور دین جدید کے احکام جاری کردیے۔ الی آخرہٖ۔ (ص: ۵۰ تا ۵۵۔ سیف الجبار از علامہ فضل رسول بدایونی۔ طبع جدید ادارہ مظہر حق بدایوں ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء۔ عکسِ طبعِ دوم مطبع غالب الاخبار سیتاپور اودھ۔ رمضان ۱۲۸۹ھ/ اکتوبر ۱۸۷۲ء)

(۱۰) خلاصۃ الکلام فی امراءِ البلد الحرام للشیخ احمد بن زینی دحلان الشافعی (متوفی ۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۶ء) کے بارے میں مضمون نگار کا کہنا ہے کہ یہ انگریز کی ناجائز خواہش کی تکمیل کے لئے لکھی گئی ہے۔ مضمون نگار کو شاید یہ بھی نہ معلوم ہو کہ یہ کس موضوع کی اور کیسی کتاب ہے؟ انھیں شاید پتہ نہیں کہ بلدِ مقدس اور ارض مبارک کے اصحاب علم وفضل اور مشاہیر امت کے احوال وآثار کے بارے میں یہ کتاب شیخ احمد بن زینی دحلان نے لکھی ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے اندر جا بجا وھابی خیالات وشخصیات پر بالواسطہ وبلاواسطہ تنقید بھی ہے۔ مضمون نگار کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ رد وھابیہ پر آپ کی ایک بہت مشہور کتاب "الدرر السنية فی الرد علی الوهابية" (عربی) ہے جس کی ۱۲۹۹ھ/ ۱۸۸۲ء میں قاہرہ مصر سے پہلی بار اشاعت ہوئی۔ اس کے بعد اس کے نہ جانے کتنے ایڈیشن ممالک عرب وترک وہند وافغان سے مختلف زبانوں میں نکل چکے ہیں۔ خود میں نے ۱۹۸۵ء میں اس کا اردو ترجمہ ''مسائل توسل وزیارت'' کے نام سے کیا جس کی ۱۴۰۶ھ/ ۱۹۸۷ء میں دہلی سے اشاعت ہوئی اور اب تک ہند وپاک سے اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء) کے والد حضرت مولانا خیر الدین قادری نقشبندی دہلوی (وصال ۱۳۲۷ھ/ ۱۹۰۸ء) اور شیخ احمد بن زینی دحلان شافعی کے درمیان کافی انسیت ویگانگت تھی۔ دس جلدوں میں رد وھابیہ پر مولانا خیر الدین نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام ''رجم الشیٰطین'' ہے۔ یہ کتاب مولانا ابوالکلام آزاد کے بقول شیخ احمد زینی دحلان کے زور دینے پر لکھی

گئی (آزاد کی کہانی) ابوالکلام آزاد مزید کہتے ہیں—— شیخ احمد دحلان نے الرد علیٰ الوھابین لکھی وہ فی الحقیقت والد مرحوم کے خیالات کا عکس ہے۔ (آزاد کی کہانی)

شیخ احمد بن زینی دحلان شافعی مکی شیخ محمد بن عبدالوھاب نجدی اوراس کے باطل افکار و خیالات کے بارے میں الدرر السنیة فی الرد علی الوھابیة (اردو ترجمہ بنام مسائل توسل وزیارت) میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''سید علوی حداد فرماتے ہیں کہ اس سے زیادہ واضح یہ بات ہے کہ یہ فریب خوردہ محمد بن عبدالوھاب قبیلۂ تمیم سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے اس کا احتمال ہے کہ یہ اس ذوالخویصرہ تمیمی کی ذریت ہو جس کے بارے میں صحیح بخاری میں ہے۔

ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اس کی نسل سے کچھ لوگ پیدا ہوں گے جو قرآن پڑھیں گے اور وہ ان کی حلق سے آگے نہ بڑھے گا۔ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔ اہل ایمان کو شہید کریں گے اور بت پرستوں کو چھوڑ دیں گے۔ اگر میں انہیں پاؤں تو قوم عاد کی طرح قتل کر دوں۔

چنانچہ یہ خارجی اہل اسلام کو قتل کرتا اور بت پرستوں کو چھوڑ دیتا تھا۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے جب خوارج کو قتل کیا تو ایک شخص نے کہا۔ اللہ کا شکر ہے جس نے انہیں ہلاک کیا اور ان سے ہمیں راحت پہنچائی۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ نہیں! اس کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ ان کی نسل سے کچھ ایسے لوگ باقی ہیں جو مردوں کی پشت میں ہیں عورتوں کے شکم میں نہیں آئے ہیں۔ ان کا آخری شخص دجال کے ہمراہ ہوگا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ بنی حنیفہ مسیلمۂ کذاب کی قوم ہے۔ ان کی وادی ہمیشہ وادیٔ فتنہ رہے گی اور اپنے کذابوں کی وجہ سے قیامت تک فتنے میں رہے گی۔

ایک روایت میں ہے۔ یمامہ کے لئے ہلاکت ہے جو کبھی جدا نہ ہوگی۔

مشکوٰۃ المصابیح کی ایک حدیث ہے۔ آخر زمانے میں کچھ لوگ پیدا ہوں گے جو ایسی باتیں کریں گے جنھیں تم نے یا تمہارے آباواجداد نے کبھی نہ سنی ہوگی۔ اس لئے ان سے بچو۔ وہ

تمھیں گمراہ نہ کردیں اور فتنوں میں مبتلا نہ کردیں۔

بنوتمیم ہی سے متعلق ان آیات کو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا: ان الذین ینادونَکَ من وراءِ الحجرات اکثرھم لایعقلون ۔ (سورۂ حجرات) جولوگ حجروں کے پیچھے سے تمھیں پکارتے ہیں ان میں سے اکثر بے وقوف ہیں۔ لاترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ، (سورۂ حجرات) نبی کی آواز سے اپنی آواز اونچی نہ کرو۔

سید علوی حداد کہتے ہیں، بنوحنیفہ و بنوتمیم و بنووائل کی مذمت میں بہت سی چیزیں ہیں۔ تمہارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اکثر خوارج انہیں کے درمیان پیدا ہوئے۔ محمد بن عبدالوھاب انہیں میں سے ہے۔ اور سرکش جماعت کا امیر عبدالعزیز بن محمد بن سعود بن وائل بھی انہیں میں سے ہے۔

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ میں ابتدا میں ہر موقع پر قبائل کے سامنے اپنے آپ کو پیش کرتا تھا۔ بنوحنیفہ سے زیادہ براجواب مجھے کسی نے نہیں دیا۔

سید علوی حداد کہتے ہیں۔ حبر الامۃ عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی زیارت (قبر مبارک) کے لئے میں طائف پہنچا تو علامہ شیخ طاہر سنبل حنفی بن علامہ شیخ سنبل شافعی سے ملا۔ انھوں نے بتلایا کہ اس فرقہ کے رد میں "الانتصار للاولیاء الابرار" کے نام سے انہوں نے ایک کتاب لکھی ہے۔ شاید اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ اسے فائدہ پہنچادے جس کے دل میں بدعتِ نجدیت داخل نہیں ہوئی ہے۔ اور جس کے دل میں یہ بددینی گھس گئی ہے اس کی فلاح کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ کیوں کہ حدیث بخاری میں ہے۔ دین سے نکل جائیں گے پھر اس میں داخل نہ ہوں گے۔ (ص: ۸۸و۸۹۔ مسائل توسل وزیارت، مطبوعہ دہلی ولاہور)

(۱۱) مضمون نگار نے ردِ قادیانیت کے سلسلے میں مولانا نذیر حسین بہاری ثم دہلوی اور مولانا محمد حسین بٹالوی کی تعریف کی ہے اور انھیں ردِ قادنیت کے سرخیل کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ انھیں معلوم نہیں کہ ردِ قادنیت کے سلسلے میں دیگر بہت سے مشاہیر علماء نے کتنی جدوجہد اور فرقۂ قادیانیت کے سدّ باب واستیصال میں کتنی محنت وجاں کاہی کی ہے اور کتنی قربانیاں دی ہیں۔ دیگر موضوعات کی طرح اس موضوع پر بھی ان کا مطالعہ نہایت ناقص ومحدود بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں ان کا کوئی براہِ راست مطالعہ ہی نہیں ہے۔

بہرحال! انگریز نوازی کے خلاف لکھے گئے اپنے اس بے بنیاد اور خالص متعصّبانہ و معاندانہ مضمون میں وہ یہ لکھنا بھول گئے یا شاید انھیں صحیح طور پر معلوم ہی نہیں کہ انگریزوں کی خدمت میں مذکورہ دونوں حضرات کی کتنی نمایاں خدمات ہیں۔ مولانا نذیر حسین بہاری ثم دہلوی (متولد ۱۲۲۰ھ/ ۱۸۰۵ء۔ متوفی ۱۳۲۰ھ/ ۱۹۰۲ء) استاد اور مولانا محمد حسین بٹالوی (متولد ۱۲۵۶ھ/ ۱۸۴۰ء۔ متوفی ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۲۰ء) ان کے شاگرد تھے۔ یہ دونوں استاذ شاگرد وھابی/ غیر مقلد/ اہل حدیث کے اکابر اور تاریخ ساز علماء ہیں۔

مولانا محمد حسین بٹالوی کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے حکومت ہند کو درخواست دی کہ جماعت اہل حدیث حکومت ہند کی مکمل وفادار اور خیر خواہ ہے اس لئے لفظ وھابی کی جگہ لفظ اھل حدیث لکھنے اور سرکاری کاغذات میں اسی طرح اندراج کرنے کا حکم صادر فرمایا جائے۔ چنانچہ یہ درخواست ۱۹رجنوری ۱۸۸۷ء میں تحریری طور پر منظور ہوئی اور ۱۸۸۸ء میں اس کے لئے سرکاری پروانہ مسٹر جے پی ہیوٹ انڈر سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا نے ۱۱رجون ۱۸۸۸ء کو شملہ سے جاری کیا۔ (ص ۷۴۔ اشاعۃ السنۃ لاہور۔ ج ۱۱۔ شمارہ ۲۔ از محمد حسین بٹالوی)

تبدیلِ نام کے سلسلے میں پیش کردہ درخواست پر دستخط کرنے والوں میں سے چند نمایاں نام یہ ہیں۔ سید محمد نذیر حسین دہلوی، ابوسعید محمد حسین بٹالوی وکیل اھل حدیث ہند، محمد یونس خاں رئیس دتّہ ولی علی گڑھ، قطب الدین روپڑی، محمد سعید بنارسی، سید نظام الدین مدراسی۔ (ص:۴۲۔ اشاعۃ السنۃ مذکورہ)

ملکۂ برطانیہ کی گولڈن جبلی (۱۸۸۶ء) کے موقعہ پر اہل حدیث نے جو سپاس نامہ پیش کیا تھا وہ مولانا محمد حسین بٹالوی کی زبان میں یہ ہے:

"پس واضح ہو کہ جو کچھ اس موقعہ پر اھل حدیث نے کیا ہے۔ وہ امور ذیل ہیں:

(۱) ملکۂ معظّمہ کی تعظیم کرنا اور تعظیمی الفاظ سے ان کو یاد کرنا۔

(۲) ملکۂ معظّمہ کی حکومت پنجاہ سالہ پر خوشی کرنا اور اس خوشی میں مسلمانوں کو کھانا کھلانا۔

(۳) برٹش حکومت کی اِطاعت وعقیدت ظاہر کرنا اور اس کو فرضِ مذہبی بتانا۔

(۴) ملکۂ معظّمہ اور اس کی سلطنت کے لئے دعائے سلامتی وحفاظت وبرکت کرنا۔

وعلیٰ ھذا القیاس۔

ان امور میں کوئی امر بھی ایسا نہیں ہے جس کے جواز پر شریعت کی شہادت نہ پائی جاتی ہو۔"
(ص:۲۲۹۔اشاعۃ السنۃ لاہور۔ج ۹۔شمارہ ۸۔از محمد حسین بٹالوی)

مولانا محمد حسین بٹالوی اپنی کتاب "الاقتصاد فی مسائل الجہاد" کے حوالہ سے اپنے رسالہ اشاعۃ السنۃ مطبوعہ لاہور میں لکھتے ہیں کہ انگریزوں سے دنیا بھر میں کہیں بھی جہاد کرنا جائز نہیں ہے۔انھیں کی زبانی یہ تحریری بیان ملاحظہ کیجیے جس سے لاہور سے پٹنہ تک کے بہت سے علمائے اہل حدیث متفق تھے۔

"۱۸۷۲ء میں ایڈیٹر اشاعۃ السنۃ رسالہ "الاقتصاد فی مسائل الجہاد" تالیف کر چکا ہے جس میں قرآن وحدیث وفقہی دلائل سے ثابت ومدلل کیا ہے کہ اس گورنمنٹ سے مسلمانوں کا ہند کے ہوں خواہ روم یا عرب کے مذہبی جہاد جائز نہیں۔اور اسی سال پنجاب کے عام اہل حدیث نے بذریعہ ایک عرض داشت اپنی عقیدت واطاعتِ گورنمنٹ کا اظہار کیا تھا جس پر گورنمنٹ کی طرف سے اس کی تائید وتصدیق میں ایک سرکلر جاری ہوا تھا جو اشاعۃ السنۃ نمبر ۹۔جلد ۸ میں منقول ہو چکا ہے۔" (ص:۲۶۔جلد ۹۔شمارہ ۱۔اشاعۃ السنۃ لاہور۔از محمد حسین بٹالوی)

انقلاب ۱۸۵۷ء میں شریک مسلمانوں کو باغی و بدکردار ثابت کرتے ہوئے مولانا محمد حسین بٹالوی لکھتے ہیں:

"مفسدۂ ۱۸۵۷ء میں جو مسلمان شریک ہوئے تھے وہ سخت گنہگار اور بحکمِ قرآن وہ مفسد و باغی و بدکردار تھے۔اکثر ان میں عوام کالانعام تھے۔بعض جو خواص وعلماء کہلاتے تھے وہ بھی اصل علومِ دین سے بے بہرہ یا نافہم و بے سمجھ۔باخبر سمجھ دار علماء اس میں ہرگز شریک نہ ہوئے اور نہ ہی اس فتویٰ پر جو اس غدر کو جہاد بنانے کے لئے مُفسد لیے پھرتے تھے انھوں نے خوشی سے دستخط کیے۔

یہی وجہ تھی کہ مولوی اسمٰعیل دہلوی جو حدیث وقرآن سے باخبر اور اس کے پابند تھے اپنے ملک ہندوستان میں انگریزوں سے (جن کے امن وعہد میں رہتے تھے) نہیں لڑے اور نہ اس ملک کی ریاستوں سے لڑے۔اس ملک سے باہر ہو کر قوم سکھوں (جو مسلمانوں کے مذہب میں دست اندازی کرتے تھے،کسی کو اونچی اذان نہیں کہنے دیتے تھے) سے لڑے۔(۵۰۔الاقتصاد فی مسائل الجہاد۔وکٹوریہ پریس لاہور۔از محمد حسین بٹالوی)

غیر مقلد عالم مسعود عالم ندوی لکھتے ہیں:— "مولوی محمد حسین بٹالوی نے جہاد کی منسوخی

پر ایک رسالہ (الاقتصاد فی مسائل الجھاد) فارسی زبان میں تصنیف فرمایا تھا اور مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے بھی شائع کرائے تھے۔ معتبر اور ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ اس کے معاوضے میں سرکار انگریزی سے انھیں جاگیر بھی ملی تھی۔'' (ص:۲۷۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک۔ از مسعود عالم ندوی)

متحدہ ہندوستان کے بڑے بڑے غیر مقلد محدثین کے استاذ مولانا نذیر حسین بہاری ثم دہلوی نے فتویٰ دیا تھا کہ —

''ہندوستان میں شوکت وقوت اور قدرتِ سلاح وآلات مفقود ہیں اور ایمان پیمان یہاں موجود ہے۔ پس جب کہ شرط جہاد اس دیار میں معدوم ہوئی تو جہاد کرنا یہاں سببِ ہلاکت اور معصیت ہوگا۔ (ص:۲۸۵۔ ج ۳۔ فتاویٰ نذیریہ مطبوعہ لاہور)

جہاد کی چار شرطیں بیان کرنے کے بعد مولانا نذیر حسین دہلوی لکھتے ہیں — ''پس جب یہ بات بیان ہو چکی تو میں کہتا ہوں کہ اس زمانے میں ان چار شرطوں میں سے کوئی شرط موجود نہیں تو کیوں کر جہاد ہوگا؟ ہرگز نہیں —'' (ص ۲۸۴۔ جلد ۳۔ فتاویٰ نذیریہ۔ مطبوعہ لاہور)

مزید لکھتے ہیں — ''علاوہ بریں ہم لوگ معاہد ہیں۔ سرکار سے عہد کیا ہوا ہے۔ پھر کیوں کر عہد کے خلاف کر سکتے ہیں؟ عہد شکنی کی بہت مذمت حدیث میں آئی ہے۔'' (حوالۂ مذکورہ)

مولانا نذیر حسین دہلوی کی خدمات کے صلے اور انعامات ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

دہلی: مؤرخہ ۲۷ رستمبر ۱۸۷۷ء — از ڈبلیو جی واٹر فیلڈ افی شیٹنگ کمشنر۔

''مولوی نذیر حسین اور ان کے بیٹے شریف حسین اور ان کے دوسرے گھر والے غدر کے زمانے میں مسز لیسنس کی جان بچانے میں ذریعہ ہوئے۔ حالتِ مجروحی میں انھوں نے ان کا علاج کیا۔ ساڑھے تین مہینے اپنے گھر میں رکھا اور بالآخر دہلی کے برٹش کیمپ میں ان کو پہنچا دیا۔ (چند سطروں کے بعد) ان لوگوں کو اس خدمت کے صلے میں مبلغ دو سو اور چار سو روپے ملے تھے۔ مبلغ سات سو روپے بابت تاوان منہدم کیے جانے مکانات کے ان لوگوں کو عطا کیے گئے۔ یہ لوگ ہماری قوم سے حسنِ سلوک اور الطاف کے مستحق ہیں۔ (ص:۱۳۳۔ الحیاۃ بعد المماۃ از فضل حسین بہاری۔ مطبوعہ کراچی)

۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۳ء میں مولانا نذیر حسین دہلوی کے سفر حج کے موقعہ پر کمشنر دہلی نے یہ سٹرفکلیٹ دیا—

''مولوی نذیر حسین دہلی کے ایک بڑے مقتدر عالم ہیں جنھوں نے نازک وقتوں میں اپنی وفاداری گورنمنٹ برطانیہ کے ساتھ ثابت کی ہے۔ یہ اپنے فرض زیارتِ کعبہ کے ادا کرنے کو مکہ جاتے ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ جس کسی برٹش گورنمنٹ افسر کی مدد چاہیں گے انھیں مدد دے گا۔ کیوں یہ کامل طور سے اس مدد کے مستحق ہیں۔

دستخط: ج ڈی ٹریملٹ بنگال۔ سروس کمشنر دہلی و سپرنٹینڈ ینٹ۔ ۱۰/ اگست ۱۸۸۳ء۔
(ص۴۰۔ الحیاۃ بعد المماۃ۔ مطبوعہ کراچی۔ از فضل حسین بہاری۔)

غیر مقلد عالم مولانا فضل حسین بہاری کے بیان کے مطابق مولانا نذیر حسین دہلوی انقلاب ۱۸۵۷ء کو ہلّڑ بازی کہتے تھے (ص: ۱۲۵۔ الحیاۃ بعد المماۃ۔ مطبوعہ کراچی) اور ہندوستان کو انھوں نے کبھی دارالحرب نہ کہا۔ (ص: ۱۳۴۔ الحیاۃ بعد المماۃ مطبوعہ کراچی)

مضمون نگار کے سبھی الزامات واتہامات کو ہم نے پادر ہوا ثابت کر کے انھیں ھباءً منثوراً بنادیا ہے تاہم خواہش یہ ہے کہ وہ یا ان کے کوئی ہم نوا کچھ اور خامہ فرسائی کریں تو مزید حقائق منظر عام پر لانے میں ہمیں کافی سہولت مل جائے گی اور دہلی سے نجد تک کی خود ساختہ تاریخ کا جائزہ لے کر اس کی بخیہ گری کرنا بھی آسان ہو جائے گا۔ ہمیں امید ہے کہ مذکورہ حقائق جان لینے کے بعد اب یہ سمجھنا اور باور کرنا بےحد واضح اور اظہر من الشّمس ہو چکا ہوگا کہ ''کون ہے برطانوی سامراج کا سندیافتہ ایجنٹ؟''—اور—خود غلط بود آں چہ ماپنداشتیم۔

علامہ فضل رسول بدایونی و امام احمد رضا بریلوی کے مخالفین و معاندین نے صرف اھل سنت وعلماے اھل سنت کو ہی اپنی ستم رانیوں کا نشانہ نہیں بنایا ہے۔ بلکہ خود اپنی تاریخ پر بھی ظلم کیا ہے اور پوری تاریخ کچھ کی کچھ بنادی ہے۔ جس کا صرف ایک نمونہ سردست حاضر خدمت ہے۔ مولانا عامر عثمانی فاضل دارالعلوم دیوبند لکھتے ہیں:

''دارالعلوم کے سلسلے میں عاجز کے بزرگ واقربا کا تذکرہ آپ نے جس انداز میں کیا ہے اس پر چند الفاظ کہنے کو بےاختیار طبیعت چاہتی ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ دارالعلوم دیوبند

کی تاریخ اب وہ نہیں جو آپ سمجھے بیٹھے ہیں بلکہ وہ ہے جسے ''سوانح قاسمی'' میں باور کرایا گیا ہے۔ تاریخ نویسی کا فن پرانا ہے اوراب تاریخ سازی کا دور ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی پر اللہ کی رحمتیں ہوں۔ کچھ تو کرشمے ان کی پرواز خیال نے دکھلائے ہیں۔ کچھ ان بزرگوں نے دکھائے جن کے نزدیک دارالعلوم کے قیام کا کریڈٹ ایک خاص خاندان کو دینا دین وملت کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

ابھی جولائی ۱۹۶۰ء میں خاکسار کراچی گیا تھا۔ یہاں سید محی الدین صاحب جو کبھی دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر بھی تھے جن کی نیک نفسی اور زہدوتقویٰ پر ان کے واقف کاروں میں کوئی اختلاف نہیں اور جن کے گہرے تعلقات مولانا مناظر احسن سے بھی تھے، ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک موقعہ پر انھوں نے واقعہ سنایا کہ جب ''سوانح قاسمی'' چھپنے کی تیاریاں تھیں تو ہمیں اس کے پڑھنے کا بے حد اشتیاق لگا ہوا تھا۔ چھپ کر آ گئی تو ذوق وشوق سے پڑھا۔

لیکن بڑی حیرت ہوئی یہ دیکھ کر کہ جن تاریخی امور کا ہمیں علم تھا ان کا تو دور دور تک اس میں پتہ نہیں مگر ایک نئی تاریخ ضرور موجود ہے۔ اضطراب ضبط نہ ہوا تو سفر کر کے گیلانی صاحب کے پاس پہنچے اور عرض کیا کہ حضرت! یہ آپ نے کیا کیا لکھ دیا؟ گیلانی صاحب کے چہرے پر کرب کی علامات ظاہر ہوئیں اور تأسف کے ساتھ فرمانے لگے۔

کیا بتاؤں بھائی! کمال ہو گیا جو کچھ میں نے لکھا تھا وہ تو کچھ اور ہی تھا۔ ہم نے پوچھا اس کا کیا مطلب ہوا؟ انھوں نے فرمایا! میرے تقریباً پانچ سو صفحات بدل دیے گئے ہیں۔

اس حقیقت کو اور بھی متعدد حضرات جانتے ہیں اور وہ ابھی زندہ ہیں۔ کہ دارالعلوم کی طرف سے چھاپی ہوئی دارالعلوم کی مستند تاریخ ''سوانح قاسمی'' کس بے تکلفی کے ساتھ اصل مسودے میں تغیرات کر کے چھاپی گئی ہے۔ اور تغیرات معمولی نہیں وسیع تر اور بنیادی ہیں۔ (ص:۵۷۔ ماہنامہ تجلی دیوبند۔ شمارہ فروری و مارچ ۱۹۶۱ء)

اب میں مضمون نگار اور ان کے ہم مسلک و ہم نوا کنبہ وقبیلہ کے ''پارسا و پاکباز صالحین و مصلحین'' کی خدمت میں ایک شعر نذر کر کے اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ:

نہ تم صدمے ہمیں دیتے نہ ہم فریادیوں کرتے
نہ کھلتے رازِ سربستہ نہ یوں رسوائیاں ہوتیں

الزام بلاثبوت اور دعویٰ بلا دلیل کے تازہ نمونے

پروپیگنڈہ کی طاقت سے کسی جھوٹ کو سچ کا لبادہ پہنا کر اسے دنیا کے سامنے پیش کرنے کا فن نیا نہیں بلکہ بہت پرانا ہے۔ الزام تراشی و بہتان طرازی کی مذموم صفت کا بھی نہ جانے کب سے رواج ہے جس کا سہارا لے کر کچھ لوگ اپنے حریف فرد و جماعت کی کردار کشی کے جرم کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں۔ آپ کو اگر الزام بلاثبوت اور دعویٰ بلا دلیل کے تازہ نمونے دیکھنے ہوں تو سہ روزہ دعوت نئی دہلی (شمارہ ۷رستمبر ۲۰۰۶ء) کے ایک مضمون کے جواب میں راقم سطور کے اداریہ (ماہنامہ کنزالایمان دہلی، شمارہ ذوالقعدہ/ ذوالحجہ ۱۴۲۷ھ/ دسمبر ۲۰۰۶ء) کا یہ جواب الجواب از ڈاکٹر مغل فاروق پرواز ملاحظہ فرمائیں۔ جواب الجواب لکھنے والے مضمون نگار نے اداریہ کے کئی اہم حقائق اور جواب طلب امور نظر انداز کر دیے ہیں جن کے ذکر و اعادہ کی ہم فی الحال ضرورت نہیں محسوس کر رہے ہیں۔

نمبروار جواب الجواب کو یہاں نقل کیا جارہا ہے اور اس کا جواب بھی نمبروار ہی دیا جارہا ہے۔ دونوں تحریروں کا معیار اور وزن کیا ہے اس کا فیصلہ ہمارے باشعور قارئین خود کر سکتے ہیں۔ انھیں کسی اشارہ ونشان دہی و رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے۔

ڈاکٹر مغل فاروق پرواز (ظہیر منزل، دودھ پور، علی گڑھ۔ یوپی) کا یہ جواب الجواب بلکہ تحریری ردِ عمل (مرسلہ بذریعہ رجسٹری بنام یٰسین اختر مصباحی) پڑھ کر یاد آیا کہ مشہور مؤرخ شبلی نعمانی (متوفی ۱۹۱۴ء) نے کچھ ایسے ہی حالات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''یورپین مؤرخین ایک اعتراض کے بیان کرنے میں جو خود غلط ہوتا ہے پے در پے اور بہت سے جھوٹ ملاتے چلے جاتے ہیں۔ جواب دینے والا ایک جھوٹ کا جواب دینا چاہتا ہے تو اسے ایک اور جھوٹ نظر آجاتا ہے۔ وہ ادھر متوجہ ہوتا ہے تو ایک اور جھوٹ نمایاں ہوتا ہے۔ مسلسل دروغ بیانی اور افتراؤں کے ہجوم پر بے اختیار اس کو طیش آجاتا ہے۔ اور بجائے اس کے کہ وہ سکون اور اطمینان کے ساتھ اصل واقعہ کے انکشاف پر متوجہ ہو، غصے سے بے قابو

ہو جاتا ہے۔خود مجھ پر بھی یہی اثر پڑا لیکن میں ان حریفوں کو یہ موقعہ نہ دوں گا کہ وہ میرے طیش و غضب سے فائدہ اٹھائیں۔ (ص:۴۵۔ اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔طبع جدید ۱۹۹۹ء)

بہر حال! اب نمبر وار جذباتی ردِعمل یا الزام تراشی کا نمبر وار سنجید و مختصر و مستند جواب ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) میں مدیر (ماہنامہ کنز الایمان دہلی) نے میرے اس جملہ کو نشانہ بنانے کی اپنی سی کوشش کی ہے جس میں میں نے رضاخانی تحریک کو قادیانی تحریک کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔موصوف نے دو تین رسائل کا ذکر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ میرا اعتراض بے بنیاد ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ جن دلائل کو بنیاد بنا کر میں نے رضاخانی تحریک کو قادیانی تحریک سے زیادہ مہلک ثابت کیا تھا وہ ان دلائل کو غلط ثابت کرتے مگر انھوں نے ایسا کچھ نہیں کیا بلکہ سیاسی بیان بازی کے سے انداز میں انھوں نے بالکل غیر متعلق حوالہ پیش کیے۔

(۱) مضمون نگار (ڈاکٹر مغل فاروق پرواز) نے توجہ سے لکھنے اور اپنی تحریر کو غور سے پڑھنے کی نہ جانے کیوں ضرورت محسوس نہیں کی۔وہ اب بھی نظرِ ثانی کریں تو انھیں سمجھ میں آجائے گا کہ وہ جن باتوں کو دلائل کہہ رہے انھیں اہل علم کی اصطلاح میں الزامات کہا جاتا ہے جو ثبوت سے عاری ہیں۔ان کے مضمون میں دلائل کیا کسی ایک دلیل کا بھی دور دور تک کوئی وجود نہیں۔

قادیانی ایک گمراہ و مرتد فرقہ ہے جس کا بانی مرزا غلام احمد قادیانی انگریز نوازی کا اقراری مجرم ہے۔اس فرقہ نے ہندوستان کے اندر صوبہ پنجاب کو خاص طور پر متاثر کیا پھر دیگر علاقوں اور بیرون ہند تک اپنا جال پھیلا کر ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کو اپنا شکار بنایا۔اس فتنہ کا قلع قمع کرنے میں حضرت مولانا غلام دستگیر قصوری و حضرت سید مہر علی شاہ گولڑوی و امام احمد رضا بریلوی و حضرت سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری و دیگر علما و مشائخِ اھل سنت نے نمایاں کردار ادا کیا۔

فتنۂ قادیانیت ہندوستان سے ابھر کر دوسرے ممالک تک پہنچا جب کہ صحرائے نجد سے نکل کر ہندوستان میں داخل ہونے والے فتنے کا نام وھابیت ہے۔اس کی سرکوبی میں ہندوستان کے مشاہیر علمائے اہل سنت بالخصوص تلامذۂ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے سرگرم کوششیں کیں۔

حضرت مولانا منورالدین دہلوی، حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی، حضرت علامہ فضل رسول بدایونی، حضرت مفتی ارشاد حسین مجددی رام پوری، حضرت مولانا غلام دستگیر قصوری، حضرت مولانا عبدالقادر عثمانی بدایونی، حضرت مولانا غلام قادر بھیروی لاہوری، حضرت مولانا ھدایت رسول قادری برکاتی لکھنوی، حضرت مولانا انواراللہ حیدرآبادی، امام احمد رضا بریلوی، حضرت سید مہر علی شاہ چشتی گولڑوی و حضرت سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری وغیرھم اس سلسلے میں پیش پیش تھے۔

وھابیت و قادیانیت کی آبیاری برطانوی سامراج نے کی اور ان کے ذریعہ اس نے اپنے کئی بڑے مقاصد حاصل کیے۔ قادیانیت کا معاملہ تو سب کے نزدیک طشت از بام ہے۔ اس کا دائرہ چوں کہ محدود ہے اس لئے اس کے نقصانات بھی محدود ہیں جب کہ وہابیت کے جراثیم مختلف شکلوں میں دنیا بھر کے اندر پھیلے ہوئے ہیں اس لئے اس کی تباہ کاریوں کا دائرہ بھی نہایت وسیع ہے۔ اس موضوع پر بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ جسے تحقیق و تفصیل درکار ہو وہ ان کا مطالعہ کرے۔ تحریکِ وھابیت کو سمجھنے کے لئے غیر مقلد عالم نواب صدیق حسن بھوپالی کی لکھی گئی دو کتابوں ''التاج المکلل'' اور ''ترجمانِ وھابیہ'' کا مطالعہ کافی ہے۔ حضرت مفتی عبدالقیوم ہزاروی کی مشہور کتاب ''تاریخِ نجد و حجاز'' کا مطالعہ نہایت مفید ہے۔

(۲) میں مدیر موصوف نے فضل رسول بدایونی کی عظمت کی بنیاد پر اس پر رکھی ہے کہ وہ نجدیت و وھابیت کے سخت مخالف تھے۔ پہلے انھوں نے خود سے ہی ایک مفروضہ قائم کیا کہ نجدیت و وہابیت ایک بری چیز ہے اور اس کا مخالف عظیم تر۔ پھر آؤ دیکھا نہ تاؤ فضل رسول بدایونی کے ہاتھوں میں عظمت کی ڈگری تھمادی۔ مدیر محترم نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ نجدیت و وہابیت کے مخالف کی حیثیت سے ''احمد بن زینی دحلان'' کے ہاتھوں میں عظمت کی سند تھمادی ہے۔ آگے چل کر رقم طراز ہیں:

> ''دنیا جانتی ہے کہ برطانوی جاسوس ہمفرے نے شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کی ذہن سازی کر کے شیخ نجدی کے ہاتھوں وہابی فکر و تحریک کی بنیاد ڈالی۔''

متذکرہ بالا بحث سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ کے مخالفین میں فضل رسول بدایونی، احمد زینی دحلان اور برطانوی جاسوس ہمفرے کے

اسمائے گرامی سرفہرست ہیں۔ویسے میں موصوف کی اطلاع کے لیے عرض کردوں کہ ہمفرے نے اپنی کتاب میں جو اردو میں ''ہمفرے کے اعترافات'' کے نام سے اور انگریزی میں "Colonization Ideal" کے نام سے چھپی ہے، میں اعتراف کیا ہے کہ اس نے اپنا سارا زور شیخ عبدالوھاب نجدی کو اس کی تحریک سے دور لے جانے پر صرف کیا نہ کہ کسی تحریک کی بناء ڈالنے پر۔

اب میں ہمفرے کی شخصیت کے تار و پود کی طرف آتا ہوں۔ دراصل ہمفرے نے اپنے اعترافات میں ایک نفسیاتی حملہ سے کام لیتے ہوئے اُمت مسلمہ کی ایک عبقری شخصیت کو داغ دار کرنے کی کوشش کی ہے۔اگر عبدالوہاب نجدی ان کا آدمی تھا تو اُس کو اس طرح سے بے نقاب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اپنے تمام تر حربوں کی ناکامی کے بعد انھوں نے شیخ نجدی کو بدنام کرنے کے لیے یہ سب کچھ آخری حربہ کے طور پر کیا ہو؟ جی ہاں یقیناً ایسا ہی ہے۔ملاحظہ فرمائیے''ہمفرے کے اعترافات'' کے آخری پیراگراف سے ایک اقتباس:

> ''اس وقت ہم ان کے ساتھ اپنی دوستی کی معراج پر ہیں۔مرکزی حکومت تمام جزیرۃ العرب میں اپنا اثر ونفوذ قائم کرنے میں کامیاب ہوچکی ہے۔ اگر کوئی ناگوار حادثہ رونما نہ ہوا تو بہت جلد اسلامی زمینوں پر بکھیرے ہوئے یہ بیج تناور درختوں میں تبدیل ہوجائیں گے اور ہمیں ان سے اپنے مطلوبہ پھل حاصل ہوں گے۔''

یہاں چند سوالات کا قائم ہونا لازمی ہے۔کیا ہمفرے اُمت مسلمہ کا کوئی ہمدرد ہے جو ان راز و نیاز والی باتوں کے افشا پر بضد ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر اُس نے عبدالوہاب نجدی کو راہِ راست سے دور لے جانے کے لیے اتنا سب کچھ کیوں کیا۔اور اگر وہ اُمتِ مسلمہ کا دشمن ہے تو پھر اپنے مطلوبہ نتائج کی برآمدگی سے پہلے اس کا اظہار کیوں کررہا ہے۔یہی ہے اجتماع ضدین جو ہمفرے کی کاوشوں کو فضل رسول بدایونی، احمد زینی دحلان اور احمد رضا خاں کی صف میں لاکر کھڑا کرتا ہے۔

(۲) علامہ فضل رسول بدایونی اور شیخ احمد بن زینی دحلان شافعی مکی جلیل القدر و عظیم المرتبت علمائے اہل سنت میں سے تھے۔ان کا علم و فضل اور ان کی دینی و علمی خدمات ان کی فضیلت و عظمت کی بنیاد ہیں۔وھابیت کا ابطال و استیصال ان کی عظمت و خدمت کا ایک حصہ ہے۔نھی عن

المنکر کا ایک جُز ہے۔ اس لئے ان کی شخصیت کا یہ پہلو بھی نہایت گراں قدر ہے۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی عہدِ طالب علمی ہی میں انحراف و کج روی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ شیخ ابن حزم ظاھری و شیخ ابن تیمیہ حرانی کے افکار و خیالات کا ان پر اثر اور رفتہ رفتہ غلبہ ہو گیا تھا۔ ان کی آزاد خیالی و گمراہی سے ان کے اساتذہ اور اہل خانہ سخت نالاں اور بے زار تھے۔ ان کے حقیقی بھائی شیخ سلیمان بن عبدالوہاب نجدی نے ان کے اعتقادی ضلالات کے خلاف "الصواعق الالٰهية فی الرد علی الوهابية"۔ (مطبوعہ استنبول، ترکی) کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اس دور کے سیکڑوں علما و مشائخ اہل سنت نے تحریکِ وہابیت کی شدید مزاحمت کی۔ جگہ جگہ تقریریں کیں۔ سیکڑوں کتب و رسائل تحریر کیے اور شیخ نجدی کو در بدر پھرنے پر مجبور کیا۔

برطانوی سامراج نے شیخ نجدی کا استعمال کیا۔ ان کے افکار کی اشاعت کر کے مسلمانانِ عالم کا اسلام سے رشتہ کمزور کرنے اور انھیں باہم متصادم کرنے کی سازش و کوشش کی۔ ''ہمفرے کے اعترافات'' اسی کا ایک حصہ ہے۔ برطانوی سامراج کے گماشتے جو کام کرتے ہیں اور جن افراد کا استعمال کرتے ہیں ان کے حالات عموماً ضبط تحریر میں لاکر اپنی کارروائی و کارستانی تاریخی یادگار کے طور پر محفوظ کر لیتے ہیں۔ یہ ان کا قدیم معمول ہے۔ کسی دوسرے کو اس سے نقصان ہو یا اس کی رسوائی ہو اس سے انھیں کوئی غرض نہیں۔ کچھ وقت گذرنے اور منصوبہ مکمل ہونے یا قریب تکمیل ہونے پر یا جب ان کا دل چاہتا ہے وہ اسے شائع بھی کر دیتے ہیں۔

مضمون نگار کے ممدوح اور ''امت مسلمہ کی عبقری شخصیت'' کے بارے میں مولانا انور شاہ کشمیری شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند فرماتے ہیں۔

اما محمد بن عبدالوهاب النجدی فانه کان رجلاً بليداً قليل العلم فكان يتسارع الیٰ الحكم بالكفر۔ (ص:۷۔ ج۔۱۔ فیض الباری مطبوعه مصر۔ مرتبه مولانا بدرعالم میرٹھی)

(ترجمہ) محمد بن عبدالوھاب نجدی ایک غبی و کند ذہن اور کم علم شخص تھا جو حکم کفر لگانے میں بڑی جلد بازی کیا کرتا تھا۔

مولانا خلیل احمد انبیٹھوی سہارن پوری نے اس وقت کے حالات کے پیش نظر وھابیت

سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''ہمارے نزدیک ان (محمد بن عبدالوھاب نجدی) کا حکم وہی ہے جو صاحب درمختار (علامہ ابن عابدین شامی) نے فرمایا ہے کہ وہ خوارج کی ایک جماعت ہے شوکت والی جس نے امام پر چڑھائی کی تھی تاویل سے کہ امام کو باطل یعنی کفر یا ایسی معصیت کا مرتکب سمجھتے تھے جو قتال کو واجب کرتی ہے۔اس تاویل سے یہ لوگ ہماری جان و مال کو حلال سمجھتے اور ہماری عورتوں کو قیدی بناتے ہیں۔(چند جملوں کے بعد) ان کا حکم باغیوں کا ہے۔(ص ۱۹۔المھند علی المفند۔ مطبع قاسمی دیوبند ۱۹۲۶ء)

اس خیال اور جواب کی مندرجہ ذیل حضرات نے بھی مذکورہ کتاب میں تحریری تصدیق و تائید کی ہے۔

(شیخ الھند) محمود حسن دیوبندی صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند۔مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا عبدالرحیم رائے پوری، مولانا حبیب الرحمٰن دیوبندی، مولانا محمد احمد بن مولانا محمد قاسم نانوتوی، مفتی کفایت اللہ شاہجہاں پوری، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی، مولانا محمد مسعود احمد بن مولانا رشید احمد گنگوہی۔

''ہمفرے کے اعترافات'' سے مضمون نگار کے نقل کردہ آخری پیراگراف سے چند سطور پہلے کے یہ تاریخی حقائق پیش کر دیے جاتے تو قارئین بڑی آسانی سے ''محمدین'' یعنی محمد بن عبدالوھاب اور ان کے سیاسی و عسکری حلیف و معاون محمد بن سعود کا اصل چہرہ دیکھ لیتے۔انھیں کی اولاد بنام آل الشیخ (محمد بن عبدالوھاب) اور آل السعود (محمد بن سعود) کی سعودی عرب کے اندر مشترکہ طور پر مذہبی و سیاسی حکمرانی ہے۔

ہمفرے لکھتا ہے:

> ''محمد بن عبدالوھاب کی دعوت کے برسوں بعد جب چھ نکاتی پروگرام کامیابی کی منزلیں طے کر چکا تو نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت نے ارادہ کیا کہ اب سیاسی اعتبار سے بھی جزیزۃ العرب میں کوئی کام ہونا چاہیے۔یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے عُمال میں سے محمد بن سعود کو محمد بن عبدالوہاب کے ساتھ اشتراکِ عمل پر مامور کیا۔اور اس کام کے لئے محمد بن عبدالوہاب کے پاس خفیہ طور پر ایک

نمائندہ بھی بھیجا تا کہ وہ اس کے سامنے حکومت برطانیہ کے مقاصد کی توضیح کرے۔ اور ''محمدین'' کے اشتراکِ عمل کی ضرورت پر زور دے۔ اور تاکید کرے کہ دینی امور کے فیصلے کلی طور پر محمد بن عبدالوہاب کے ہاتھ میں ہوں گے اور سیاسی امور کی نگرانی محمد بن سعود کی ذمہ داری ہوگی۔''

نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کا ہدف مسلمانوں کے جسم وجان دونوں پر اپنا اثر قائم کرنا تھا اور تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ سیاسی حکومتوں سے دینی حکومتیں زیادہ دیرپا اور طاقتور رہی ہیں۔

اس طرح دینی اور سیاسی شخصیتوں کے اتحادِ عمل کے نتیجے میں انگریزوں کا بھلا ہورہا تھا۔ اور ہر آنے والا دن اس بھلائی میں اضافہ کررہا تھا۔ ان دونوں رہبروں نے نجد کے قریب ''درعیہ'' کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت خفیہ طور پر جی کھول کر ان کی مالی اعانت کررہی تھی۔'' (ص:۱۱۹و۱۲۰۔ ہمفرے کے اعترافات۔ مطبوعہ ہندوپاک)

اس سے بہت پہلے اپنی اس یادداشت میں ہمفرے لکھ چکا ہے کہ:

''اس دن کے بعد سے میرا مقصد محمد بن عبدالوھاب کو رہبری اور پیشوائی کی فکر دینا ہوگیا۔ مجھے اس کے قلب وروح میں اتر کر شیعہ سنی فرقوں کے علاوہ اسلام میں ایک تیسرے فرقے کی سربراہی کی پیش کش کو اس کے لئے قابل عمل بنانا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری تھا کہ پہلے اس کے ذہن کو بے جا محبتوں اور اندھے تعصّبات سے پاک کردوں۔ اور اس عنوان سے اس کی آزاد خیالی اور بلند پروازی کو تقویت پہنچاؤں۔ (ص:۵۳۔ ہمفرے کے اعترافات)

(۳) میں مدیر موصوف نے ''اعلام الاعلام بان ھندوستان دار الاسلام'' کے دفاع میں نہایت بچکانہ طرز اختیار کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''ہندوستان سو سال پہلے بھی دارالاسلام تھا، آج بھی ہے اور ان شاء اللہ آئندہ بھی دارالاسلام ہی رہے گا۔''

متذکرہ بالا عبارت سے تو صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ مدیر محترم ''فتویٰ'' کی ماہیت، پس منظر، حیثیت اور حقیقت سے بالکل ہی بے خبر ہیں۔ وہ فتویٰ جو فتاویٰ رضویہ جلد اول میں ہے۔

جس کی تکرار "اعلام الاعلام بان ھندوستان دارالاسلام" میں بھی کی گئی ہے وہ مخصوص پس منظر رکھتا ہے۔ اور فتویٰ ویسے بھی مخصوص معنوں میں دیا جاتا ہے۔ اور اُس وقت جن حالات کے پس منظر میں یہ فتاویٰ دیے گئے تھے وہ صرف اور صرف ہندوستان سے اسلام کو الوداعی سلام کے ہم معنی ہی قرار دیے جاسکتے ہیں۔

آگے چل کر موصوف نے رشید احمد گنگوہیؒ، محمد حسین بٹالویؒ اور چند دیگر شخصیات کے حوالے سے تحریر فرمایا ہے کہ انھوں نے بھی ہندوستان کو کبھی دارالحرب نہیں کہا۔ دراصل موصوف کو ایک آزاد خیال رائے رکھنے والے میں اور ایک ایجنٹ میں فرق کرنا نہیں آتا۔ مولانا احمد رضا خاں صاحب کا موازنہ ان شخصیات سے نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ خانصاحب کی طرح انھوں نے تکفیری مہم میں سرگرم کردار ادا نہیں کیا اور نہ ہی ان شخصیات میں سے کسی نے کسی ''تحذیر الناس'' کے صفحہ ۱۴ کے جملے کے ساتھ صفحہ ۲۸ کا جملہ ملا کر آخر میں صفحہ ۳ کا جملہ لکھ کر ایک پیراگراف بنایا۔ اور نہ ہی اُسے لے کر حرمین شریفین تشریف لے گئے۔ اور نہ ہی کسی دوسری طرح کی بد دیانتی کا اس پایہ کا ثبوت ان حضرات میں سے کسی کے ہاں ملتا ہے۔

(۳) امام احمد رضا بریلوی اپنے عہد کے ایسے فقیہ و مفتی تھے کہ شاہی اهتمام و انتظام میں تقریباً سو علما و فقہاے اہل سنت کے مرتبہ مجموعۂ فتاویٰ بنام "الفتاویٰ الھندیة" کے بعد تنہا آپ کے لکھے گئے فتاویٰ بنام "العطایا النبویة فی الفتاویٰ الرضویة" جیسی عظیم فقہی خدمت کا پورے برصغیر ہندو پاک میں آج بھی کوئی جواب نہیں۔ بارہ ضخیم مجلدات پر مشتمل فتاویٰ رضویہ (مطبوعہ بریلی و مبارکپور و بمبئی و لاہور) فقہ حنفی کا ایک شاہکار فقہی انسائیکلو پیڈیا ہے۔ ترجمہ و تخریج کے بعد حال ہی میں رضا فاؤنڈیشن لاہور نے فتاویٰ رضویہ کو تیس جلدوں میں شائع کر دیا ہے۔ اسی طرح عربی زبان میں امام احمد رضا بریلوی کے تحریر کردہ حاشیۂ شامی بنام "جد الممتار علیٰ رد المحتار" کی دو جلدیں المجمع الاسلامی مبارکپور اعظم گڑھ، یوپی کی طرف سے شایع ہو چکی ہیں۔ یہ دونوں فقہی خدمات اپنی مثال آپ ہیں۔

مرجع فتاویٰ ہونے کی حیثیت سے ہزاروں خواص و عوام اور علماے کرام امام احمد رضا بریلوی سے استفتاء کیا کرتے تھے جن کا انھیں مدلل جواب فتاویٰ کی شکل میں ملا کرتا تھا۔ فتاویٰ رضویہ جلد اول میں ہمیں دارالاسلام و دارالحرب سے متعلق نہ کوئی رسالہ نظر آیا نہ کوئی مسئلہ۔ نہ ہی

جلد اول کا یہ موضوع ہے۔ اس میں طہارت ونجاست ومیاہ وتیمّم کے مسائل ومباحث ہیں۔ معلوم نہیں کس کتاب سے مضمون نگار نے یہ حوالہ نقل کیا ہے۔

بہر حال! ایک استفتاء کے جواب میں امام احمد رضا نے ہندوستان کے دارالاسلام اور دارالحرب ہونے نہ ہونے کے تعلق سے تحقیقی بحث فرمائی جس کا نام اعلام الاعلام بان ہندوستان دار الاسلام" (۱۳۰۶ھ۔ طبع اول ۱۹۲۷ء حسنی پریس بریلی) ہے۔ اس کے اندر امام احمد رضا بریلوی تحریر فرماتے ہیں۔

"ہمارے امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ بلکہ علماے ثلثہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم کے مذہب پر ہندوستان دارالاسلام ہے دارالحرب ہرگز نہیں ہے کہ دارالاسلام کے دارالحرب ہو جانے میں جو تین باتیں ہمارے امام اعظم امام الائمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک درکار ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہاں احکام شرک علانیہ جاری ہوں اور شریعتِ اسلام کے احکام و شعائر مطلقاً جاری نہ ہونے پائیں۔ اور صاحبین کے نزدیک اسی قدر کافی ہے۔ مگر یہ بات بحمد اللہ یہاں قطعاً موجود نہیں۔ اہل اسلام جمعہ وعیدین واذان واقامت ونماز باجماعت وغیرھا شعائر شریعت بغیر مزاحمت علی الاعلان ادا کرتے ہیں۔ فرائض، نکاح، رضاع، طلاق، عدت، رجعت، مہر، نفقات، حضانت، نسب، ھبہ، وقف، وصیت، شفعہ وغیرھا بہت معاملاتِ مسلمین ہماری شریعتِ غراء بیضاء کی بنا پر فیصل ہوتے ہیں کہ ان امور میں حضراتِ علماء سے فتویٰ لینا اور اس پر عمل وحکم کرنا حکّامِ انگریزی کو بھی ضرور ہوتا ہے اگرچہ ہنود ومجوس ونصاریٰ ہوں۔ اور بحمد اللہ یہ بھی شوکت وجبروتِ شریعتِ علیّہ عالیہ اسلامیہ اعلی اللّٰہ تعالیٰ حکمھا السامیہ ہے کہ مخالفین کو بھی اپنی تسلیم اتباع پر مجبور فرماتی ہے۔ و الحمدللّٰہ رب الغلمین۔

فتاویٰ عالمگیریہ میں سراج وھاج سے نقل کیا۔

اعلموا ان دارالحرب تصیر دارالاسلام بشرطٍ واحدٍ و ھو اظھار حکم الاسلام فیھا۔

جان لو کہ بے شک دارالحرب ایک ہی شرط سے دارالاسلام بن جاتا ہے۔

وہ یہ ہے کہ وہاں اسلام کا حکم غالب ہو جائے۔ (ص:۱۰۵، ۱۰۶۔ ج ۱۴۔
فتاویٰ رضویہ مترجم۔ رضا فاؤنڈیشن لاہور)

اس کے آگے متعدد قدیم فقہی کتب سے امام احمد رضا بریلوی نے اپنے موقف کو واضح و مدلل کیا ہے۔ اگر اس مسئلۂ شرعیہ کی وضاحت پر طعن و تشنیع اور مخصوص پس منظر کی دہائی ایسے لوگ دینے لگیں جو فتویٰ کی ابجد سے بھی ناواقف ہوں تو اسے ان کی بدنصیبی اور حالات کی ستم ظریفی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

مضمون نگار کے ممدوح علمائے دیوبند و اہلِ حدیث اگر ہندوستان کو دارالاسلام کہیں اور لکھیں تو بالکل صحیح اور امام احمد رضا بریلوی اسے دارالاسلام کہیں اور لکھیں تو انگریزوں کے ایجنٹ؟ یہ ہے معیارِ حق و انصاف! فیاللعجب۔

اللہ رے خود ساختہ قانون کا نیرنگ
جو بات کہیں فخر وہی بات کہیں ننگ

ہندوستان کو دارالحرب کہہ کر یہاں سے مسلمانوں کی ہجرت کا جو علماء درس دے رہے تھے وہ درحقیقت ہندوستان سے اسلام کو الوداع کہنے کا شعوری یا غیر شعوری جرم کر رہے تھے۔ اور یہ وہی لوگ تھے جو تحریک ترک موالات کو ہندو مسلم اتحاد کا ذریعہ بنا کر شعائر و احکام اسلام کو کفر کی دہلیز پر قربان کر رہے تھے۔ زحمت نہ ہو تو تحریک ہجرت کی تاریخ اور ہندوستان سے افغانستان ہجرت کر کے پھر لٹے پٹے تباہ حال مسلمانوں کی ہندوستان واپسی کی المناک داستان پڑھ لیجیے۔

جس وقت امام احمد رضا بریلوی نے ہندوستان کو دارالاسلام کہا اس وقت اور اس زمانہ میں ہندوستان کے کسی قابلِ ذکر عالم نے دارالحرب کہا ہو تو یہ اس کا تفرد ہے۔ جمہور علماء اسے دارالاسلام سمجھتے اور کہتے تھے۔ اُس زمانے میں ہندوستان کو دارالحرب کہہ کر مسلمانانِ ہند پر جہاد یا ہجرت کو واجب کرنا نہ اسلام کی خیر خواہی تھی نہ مسلمانوں کی بلکہ یہ حکم کند چھری سے مسلمانوں کو ذبح کرنے اور اسلام کو آزار پہنچانے کے مترادف تھا۔

ہندوستان کے دارالاسلام ہونے اور اسے دارالاسلام کہنے کا یہ مطلب تھا اور یہ مطلب ہے

کہ اپنی اسلامی شناخت کے ساتھ اپنے اسلامی اصول واحکام پر عمل کرتے ہوئے مسلمانانِ ہند یہاں تھے اور یہیں رہیں گے۔ اپنا تشخص ہر حال میں قائم رکھیں گے اور اسی کے ساتھ اپنی زندگی گذاریں گے۔ یہ سرزمین ہماری ہے جس سے ہم کسی قیمت پر دست بردار نہیں ہوں گے۔ اس کے چپے چپے اور اس کی وادی و کوہسار پر ہمارا پورا پورا حق ہے۔ اس لئے یہ اعلانِ عام ہے کہ:

کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر، کبھی غنچہ و گل و خار پر
میں چمن میں چاہے جہاں رہوں، مرا حق ہے فصلِ بہار پر

فتویٰ اور حالات کے پس منظر کا جہاں تک مسئلہ ہے اسے سمجھنے کے لئے مضمون نگار کو زیادہ آگے بڑھنے اور دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ملک کے ہنگامی حالات/ ایمرجنسی پیریڈ (۱۹۷۵ء تا ۱۹۷۷ء) میں جب کہ نس بندی مہم کا زور تھا۔ اسی دوران آل انڈیا ریڈیو سے ایک تقریر نشر ہوئی جس میں کہا گیا کہ اب تک اس کے منفی پہلو کی جانب زیادہ توجہ دی گئی ہے اب اس کے مثبت پہلو پر بھی علما کو غور کرنا چاہیے۔ روزنامہ قومی آواز لکھنؤ نے اس کی تائید میں اداریہ لکھا۔ دیگر اخبارات ورسائل اور عوام وخواص میں یہ تقریر زیر بحث آئی۔ مثبت پہلو پر غور کرنے کا مطلب سب نے یہی سمجھا کہ علماء کو حکومتِ وقت کی طرف سے چلائی جانے والی نسبندی مہم اور نسبندی کے جواز کی صورتیں تلاش کرنی چاہئیں۔ یہ تقریر مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند (متوفی ۱۹۸۳ء) کی تھی۔

۱۹/اکتوبر ۱۹۷۶ء میں نس بندی کے بارے میں قاری محمد طیب صاحب کا انٹرویو آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوا جس کی خبر اور تبصرہ ۲۰/اکتوبر کے اخبارات میں شہ سرخیوں کے ساتھ شایع ہوکر ملک بھر میں موضوع بحث بنا۔ متن کا یہ حصہ خصوصیت کے ساتھ زیر بحث آیا:

''بحالتِ موجودہ حضرات علمائے کرام سے بطور خاص میری درخواست ہوگی کہ وہ آج کی تباہ کن مشکلات میں سابق علما کی طرح مسئلہ کے مثبت پہلو کی طرف بھی توجہ فرمائیں۔ (روزنامہ الجمعیۃ دہلی، شمارہ ۲۰/اکتوبر ۱۹۷۶ء)

افراتفری اور خوف و ہراس کے اسی ماحول میں ایک فتویٰ سائیکلو اسٹائل کے ذریعہ اتر پردیش کے مختلف شہروں اور ملک کے مختلف مقامات تک پہنچا جسے ہزاروں مسلمانوں نے

پڑھا کہ نس بندی حرام ہے۔ حرام ہے حرام ہے۔ یہ فتویٰ ایمر جنسی کے بعد مختلف مجلّات و کتب میں شایع بھی ہو چکا ہے۔ سی آئی ڈی محکمہ اور انتظامیہ نے نسبندی حرام ہونے کا فتویٰ دیکھ کر فوراً مفتی کی گرفتاری کا پروگرام بنایا لیکن اس کے ضعف و پیری اور ملک کے طول و عرض میں اس کے وسیع عوامی اثرات کو دیکھتے ہوئے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا کہ اس اقدام سے مذہبی حلقے سخت مشتعل ہو جائیں گے جس کے بعد حکومت کے سامنے طرح طرح کے مسائل اور پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی۔ یہ فتویٰ مفتی اعظم مولانا مصطفیٰ رضا بریلوی (وصال ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۱ء) خلف اصغر امام احمد رضا بریلوی کا تھا۔

مضمون نگار کی یہ دانش مندی و دور اندیشی قابل داد ہے کہ تحذیر الناس کی بحث چھیڑ کر اپنی ٹوٹی ہوئی گردن پر بلاوجہ وہ ایک نیا بوجھ لاد رہے ہیں۔ صفحہ ۱۴ و صفحہ ۲۸ و صفحہ ۳ کی عبارتیں الگ الگ ہوں یا انھیں ایک ساتھ جمع کیا جائے یا ان کا خلاصۂ مفہوم بیان کیا جائے، ہر صورت میں ان پر شرعی مؤاخذہ ہے جس سے توبۂ شرعیہ کے سوا کسی طرح نجات نہیں مل سکتی۔ مؤلف تحذیر الناس نے مختلف مواقع پر خاتم پیغمبراں رسول انس و جاں ﷺ کو آخر النبیین ماننے اور آپ کی خاتمیتِ زمانی و مرتبی کی توضیح کرنے کے باوجود تین مواقع پر جو کچھ لکھا اور فرض کیا ہے وہ حد درجہ قابل مؤاخذۂ شرعیہ ہے۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ امکانِ نظیر محمدی اور مسئلہ شش مثل کے پس منظر میں تحذیر الناس کی ساری بحث گردش کر رہی ہے اور یہ قاسمی نکتہ بظاہر تو اثباتِ فضیلتِ محمدی کے لئے ہے لیکن درحقیقت بتلانا یہ ہے کہ نظیر محمدی آپ کے دور میں یا زمانۂ مابعد میں بالفرض ممکن مان لیا جائے تو بھی خاتمیتِ محمدی میں کچھ فرق نہ آئے گا۔ اس نکتہ کے ذریعہ شاہ اسمٰعیل دہلوی کی تقویۃ الایمان سے پیدا شدہ مسئلہ میں شاہ اسمٰعیل دہلوی کی حمایت اس کا اصل مقصد ہے اور اسی کے لئے یہ باطل و مردود نکتہ آفرینی کی گئی ہے۔

مختلف طبقات ارض میں مخلوق اور ان کے درمیان نبی ہونے کا استدلال کچھ لوگوں نے اثر ابن عباس سے کیا جسے جمہور محدثین کرام شاذ یا موضوع قرار دیتے ہیں یا اس کے روحانی معانی و مطالب بتاتے ہیں جن کا محسوس شکل میں مخلوق و نبی کے وجود سے دور دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔ کیوں کہ اس طبقۂ ارض کے علاوہ کسی دوسرے طبقۂ ارض میں کسی مفروضہ مخلوق کا کوئی ممکنہ نبی ماننا

صراحتاً انکارِ ختم نبوت ہے۔مولانا محمد قاسم نانوتوی کے سارے پاپڑ بیلنے کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کا آخر میں مبعوث ہونا آیتِ ولکن رسول اللّٰہ وخاتم النبین کا مفہوم ومقصود نہیں جس سے وہ یہ ثابت کررہے ہیں کہ آپ بالذات نبی ہیں اس لئے آپ کے ساتھ یا آپ کے بعد بھی کوئی نبی پیدا ہونا مان لیا جائے تو خاتمیت محمدی میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔اول وآخر ہونا آپ کے لئے مدارِ ختم نبوت نہیں۔ظاہر ہے کہ یہ خیال عقیدۂ ختم نبوت اور اجماعِ امت کے خلاف ہے۔

کتاب تحذیر الناس جس سوال کے بعد معرض وجود میں آئی ہے اس کا یہ حصہ پڑھ لیجیے سارا مطلع صاف ہوجائے گا۔

''دربارۂ قول ابن عباس جو درمنثور وغیرہ میں ہے:ان اللّٰہ خلق سبع ارضین۔ فی کل ارض آدم کآدمکم و نوح کنوحکم و ابراھیم کابراھیکم و عیسیٰ کعیساکم و نبی کنبیکم کے یہ عبارت تحریر کی کہ میرا عقیدہ ہے کہ حدیث مذکور صحیح او رمعتبر ہے اور زمین کے طبقات جدا جدا ہیں اور ہر طبقے میں مخلوق الٰہی ہے اور حدیث مذکور سے ہر طبقے میں انبیاء کا ہونا معلوم ہوتا ہے۔الخ (ص:۲۔تحذیر الناس از مولانا محمد قاسم نانوتوی۔ کتب خانہ امدادیہ دیوبند)

تحذیر الناس منظر عام پر آتے ہی علمانے اس کا شدید تعاقب کیا۔

خاتم النبین بمعنی آخر النبین کے اجماعی عقیدۂ امت کو متزلزل کرنے والی تینوں عبارتیں یہ ہیں:

(۱)بعد حمد وصلوٰۃ کے قبلِ عرضِ جواب یہ گذارش ہے کہ اول معنی خاتم النبین معلوم کرنے چاہئیں تاکہ فہمِ جواب میں کچھ دقت نہ ہو۔

سوعوام کے خیال میں تو رسول اللہ صلعم کا خاتم ہونا بایں معنی ہے کہ آپ کا زمانہ انبیاء سابق کے زمانہ کے بعد اور آپ سب میں آخر نبی ہیں مگر اہلِ فہم پر روشن ہوگا کہ تقدم یا تأخر زمانی میں بالذات کچھ فضیلت نہیں۔پھر مقام مدح میں و لکن رسول اللّٰہ و خاتم النبین فرمانا اس صورت میں کیوں کر صحیح ہوسکتا ہے؟

ہاں اگر اس وصف کو اوصافِ مدح میں نہ کہیے اور اس مقام کو مقام مدح نہ قرار دیجیے تو البتہ خاتمیت باعتبار تأخر زمانی صحیح ہوسکتی ہے۔مگر میں

جانتا ہوں کہ اہلِ اسلام میں سے کسی کو یہ بات گوارہ نہ ہوگی۔الخ
(ص:۳۔تحذیر الناس از مولانا محمد قاسم نانوتوی۔ کتب خانہ امدادیہ، دیو بند)
(۲) غرض اختتام اگر بایں معنی تجویز کیا جاوے جو میں نے عرض کیا تو آپ کا خاتم ہونا انبیاء گذشتہ ہی کی نسبت خاص نہ ہوگا بلکہ بالفرض آپ کے زمانہ میں بھی کہیں اور کوئی نبی ہو جب بھی آپ کا خاتم ہونا بدستور باقی رہتا ہے۔الخ (ص:۱۳۔تحذیر الناس)
(۳) ہاں اگر خاتمیت بمعنی اتصافِ ذاتی بوصفِ نبوت لیجیے جیسا کہ اس ہیچ مداں نے عرض کیا ہے تو پھر سوائے رسول اللہ ﷺ اور کسی کو افرادِ مقصود بالخلق میں سے مماثلِ نبوی ﷺ نہیں کہہ سکتے بلکہ اس صورت میں فقط انبیاء کے افراد خارجی ہی پر آپ کی فضلیت ثابت نہ ہوگی۔ افراد مقدرہ پر بھی آپ کی فضلیت ثابت ہو جائے گی۔
بلکہ اگر بالفرض بعد زمانۂ نبوی صلعم بھی کوئی نبی پیدا ہو تو پھر بھی خاتمیتِ محمدی میں کچھ فرق نہ آئے گا۔ چہ جائے کہ آپ کے معاصر کسی اور زمین یا فرض کیجیے اسی زمین میں کوئی اور نبی تجویز کیا جائے۔الخ۔(ص:۲۴۔تحذیر الناس)

نبوت و رسالت میں ذاتی و عرضی کی تقسیم باطل ہے اس لئے وصف نبوت بالذات کو بنائے خاتمیت قرار دینا بھی بداھۃً وصراحۃً باطل ہے۔رسول اکرم ﷺ کے خاتم النبین بمعنی آخر النبین کا انکار کتاب وسنت و اجماعِ امت کا انکار ہے۔آیت کریمہ میں خاتم النبین بمعنی آخر النبین مدح کے لئے ہی ہے اور مقام مدح ہی میں ہے۔عہد رسالت سے آج تک ساری امت نے یہی سمجھا اور مانا ہے اور یہی ساری امت کا عقیدہ ہے۔مقام ومنزلت کے اعتبار سے مرتبہ نبوت میں آپ اس وقت بھی نبی تھے جب آدم علیہ السلام آب وگل کے درمیان تھے۔اور عہد وزمانہ کے اعتبار سے مرتبۂ ظہور میں عمر مبارک کے چالیس سال پورے ہونے پر آپ کی بعثت ہوئی۔مرتبۂ ثبوت وظہور ہر حال میں آپ خاتم الانبیاء بمعنی آخر الانبیاء ہیں۔خاتمیتِ محمدی سے متعلق تحذیر الناس میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ کا پہلا حادثہ ہے جس کا واضح احساس وادراک خود مؤلف تحذیر الناس کو تھا اور تحذیر الناس کے اندر ہی ان کا

اعتراف ان الفاظ میں مذکور ہے۔

''اگر بوجہ کم التفاتی بڑوں کا فہم کسی مضمون تک نہ پہنچا تو ان کی شان میں کیا فرق آ گیا اور کسی طفلِ نادان نے ٹھکانے کی بات کہہ دی تو کیا اتنی بات سے وہ عظیم الشان ہو گیا۔ (ص:۲٦۔تحذیر الناس)

مذکورہ پہلی عبارت (ص:۳) میں رسول اللہ ﷺ کے آخری نبی بہ لحاظِ زمانہ ہونے کو عوام کا خیال کہا گیا ہے۔اور یہ لفظ عوام بہ مقابلہ اہل فہم ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چودہ سو سال میں امت مسلمہ نے اس کے علاوہ کیا سمجھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا زمانہ گذشتہ انبیا و مرسلین کرام کے زمانہ کے بعد ہے اور آپ سب میں آخری نبی ہیں؟ اور اسی عبارت نے یہ سنگین سوال بھی کھڑا کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ وصحابہ و تابعین اور سارے مفسرین و محدثین و فقہا و علماے اسلام یہ سب کے سب معاذ اللہ رب العلمین عوام بمقابلۂ اہل فہم میں داخل ہیں؟

دوسری عبارت (ص:۱۳) میں یہ ایک نیا عقیدہ تراشا گیا ہے کہ اگر چہ آپ کے زمانہ میں کوئی دوسرا نبی پیدا نہیں ہوا لیکن بالفرض پیدا ہو جاتا جب بھی آپ کا خاتم ہونا بدستور باقی رہتا۔ کیا ایسی کوئی بات کسی بھی عہد و قرن کے کسی بھی محدث و فقیہ و عالمِ دین نے کہی اور لکھی ہے؟

تیسری عبارت (ص:۲۴) کے آخری جملہ کا مفہوم واضح ہے۔ جس کے پیشِ نظر یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ مؤلف تحذیر الناس کے بقول رسول اکرم ﷺ کی حیات ظاہری میں کسی نبی کی بعثت کا امکان مان لیا جائے یا آپ کے وصال کے دوسو چار سو سال بعد یا ہزار دو ہزار سال بعد مؤلف تحذیر الناس کے خیال کے مطابق بالفرض کوئی نبی پیدا ہو جائے تو خاتمیت محمدی میں کوئی فرق آئے گا یا نہیں؟ اگر فرق آئے گا تو یہ اختراعی عقیدہ بے سود بلکہ مضر و مہلک بلکہ منافیِ ایمان و اسلام ہوگا۔ اور اگر فرق نہیں آئے گا تو خاتم النبیین بمعنی آخر النبیین ماننے کا اسلامی عقیدہ کہاں محفوظ رہا؟

اگر لفظ بالفرض کا سہارا لے کر کوئی شخص یہ کہہ دے کہ بالفرض خدائے واحد اپنے جیسا کوئی خدا پیدا کر دے یا اس کے سوا کوئی خدا اور ہو جائے جب بھی خدائے واحد کی توحید میں کوئی فرق نہیں آئے گا تو ایسا کہنے لکھنے کے بعد کیا اس کا عقیدۂ توحید سلامت رہ پائے گا؟ یا کوئی شخص یہ کہہ دے کہ بالفرض اپنے قرآن اور اپنے رسولوں کی رسالت کو اللہ چاہے تو کالعدم قرار دے تو اسلام کا

کچھ نقصان نہ ہوگا تو کیا ایسا شخص مومن و مسلم کہے جانے کا مستحق باقی رہ جائے گا؟

ان تینوں عبارتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں یا آپ کے بعد کسی نئے نبی کا ہونا فرض کرلیا جائے تو اس سے خاتمیتِ محمدی میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ اور یہ خیال صرف عوام کا ہے کہ آپ خاتم النبیین بمعنی آخر النبیین ہیں۔ اہل فہم کے نزدیک اس میں بالذات کوئی فضیلت نہیں کہ آپ سب سے آخری نبی ہیں۔

یہی وہ عقیدۂ جدیدہ ہے جس کی اشاعت ہوتے ہی علماے اہل سنت نے شدید مواخذہ کیا اور کفر کا فتویٰ عاید کیا۔ اور مولانا اشرف تھانوی کے بیان کے مطابق۔

> ''جس وقت مولانا نانوتوی صاحب نے تحذیر الناس لکھی ہے، کسی نے ہندوستان بھر میں مولانا کے ساتھ موافقت نہیں کی بجز مولانا عبدالحی کے۔
> (ص: ۵۸۰۔ ملفوظ ۹۲۷۔ جلد چہارم۔ الافاضات الیومیہ۔ مطبوعہ دیوبند)

ہندوستان بھر میں کسی عالم نے بجز مولانا عبدالحی کے موافقت نہیں کی اس کی وجہ آخر کیا ہے؟ کیا اس زمانہ کے سبھی یا اکثر علماء کا نام ''احمد رضا خاں'' تھا؟ یا سبھی علماء ''احمد رضا خاں'' کے حامی و موافق ہو گئے تھے؟ یا جمہور علماے اہل سنت کے عقیدہ و مسلک کی نمائندگی و ترجمانی ''احمد رضا خاں'' نے کی تھی؟

تحذیر الناس نے جس ''امکان'' کی راہ نکالی تھی اسے مرزائے قادیان نے ''وقوع'' میں تبدیل کرنے کا اعلان کر دیا۔ اور سرزمینِ قادیان سے بھی یہی اعلان ہوا کہ خاتم النبیین کا معنی آخر النبیین سمجھنا عوام کا خیال ہے۔

> ''قرآن کریم میں صاف طور پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:
> ما كان محمد ابا احد من رجالكم و لكن رسول الله و خاتم النبيين۔ (احزاب ٤۔ ركوع ٥)
> محمد رسول اللہ ﷺ تم میں سے کسی جوان مرد کے باپ ہیں نہ آئندہ ہوں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔

قرآن کریم پر ایمان رکھنے والا آدمی اس آیت کا انکار کیسے کرسکتا ہے؟

پس احمدیوں کا یہ عقیدہ ہرگز نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نعوذ باللہ خاتم النبیین نہیں تھے۔ جو کچھ احمدی کہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ خاتم النبیین کے وہ معنی جو اس وقت مسلمانوں میں رائج ہے نہ تو قرآن کی متذکرہ بالا آیات پر چسپاں ہوتے ہیں اور نہ ہی اس سے رسول کریم کی عزت اور شان اس طرح ظاہر ہوتی ہے جس عزت اور شان کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا۔ (احمدیت کا پیغام۔ صفحہ ۱۰۔ طبع حیدر آباد دکن بار دوم ۱۳۷۰ھ/ ۱۹۵۰ء)

آخر میں یہ صدائے بازگشت بھی غور سے سن لیجیے:

معنی خاتم النبیین در نظرِ ظاہر پرستاں ہمیں باشد کہ زمانۂ نبوی آخرست از زمانۂ گذشتہ و باز نبی دیگر نخواہد آمد۔ مگر می دانی کہ ایں سخنے ست کہ مدحے ست دراں نہ ذمے۔ (ص:۵۵۔ قاسم العلوم مع اردو ترجمہ انوار النجوم۔ مطبوعہ لاہور۔ مکتوب مولانا محمد قاسم نانوتوی بنام مولانا محمد فاضل)

ترجمہ: خاتم النبین کا معنی سطحی نظر والوں کے نزدیک تو یہی ہے کہ زمانۂ نبوی گذشتہ انبیاء کے زمانہ سے آخر کا ہے اور اب کوئی نبی نہیں آئے گا۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ یہ ایک ایسی بات ہے جس میں خاتم النبین ﷺ کی نہ تو کوئی تعریف ہے اور نہ کوئی برائی۔ (ص:۵۵۔ انوار النجوم ترجمہ قاسم العلوم از مولانا محمد قاسم نانوتوی)

''اب سوال صرف یہ ہے کہ لفظ خاتم النبیین کے کیا معنی ہیں؟ یقیناً اس کے معنی ایسے ہی ہونے چاہئیں جس سے آں حضرت ﷺ کی فضیلت اور مدح ثابت ہو۔ اسی بنا پر حضرت مولوی محمد قاسم نانوتوی بانی مدرسہ دیو بند نے عوام کے معنوں کو نادرست قرار دیا ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:

عوام کے خیال میں تو رسول اللہ صلعم کا خاتم ہونا بایں معنی ہے...... الیٰ آخرہٖ (ص:۴ خاتم النبین کا بہترین معنی۔ شائع کردہ قادیان)

مرزا غلام احمد قادیانی کے خلیفۂ اول بشیر الدین محمود نے تحذیر الناس کی ایک عبارت نقل کر کے لکھا ہے:

اھلِ بصیرت کے نزدیک اس شہادت کو خاص وزن ہونا چاہیے۔ یہ شہادت مدرسۃ العلوم دیوبند کے نامور بانی حضرت محمد قاسم نانوتوی (ف ۱۸۸۹ء) کی ہے۔ (ص ۱۵۴۔ ختم نبوت کی حقیقت مطبوعہ کراچی)

آیتِ کریمہ و لکن رسول اللّٰہ و خاتم النبیین اور حدیث نبوی لانبی بعدی (صحیح بخاری) قطعاً عام اور اس میں استغراقِ تام ہے۔ یہ ضروریات دین میں سے ہے جس میں کسی تخصیص و تاویل اور قیل و قال کی کوئی گنجائش نہیں۔ خاتم النبیین بمعنی آخر الانبیاء پر اجماعِ امت ہے۔ سلف و خلف سے یہی منقول ہے اور یہی عقیدۂ اہل سنت و جماعت ہے۔

حضرت قاضی عیاض مالکی اندلسی (وصال ۵۴۴ھ) ارشاد فرماتے ہیں:

''امت مسلمہ کا اس پر اجماع ہے کہ یہ آیات و احادیث اپنے ظاہر پر ہیں۔ جو کچھ ان سے مفہوم ہوتا ہے وہی خدا اور رسول کی مراد ہے۔ ان کے اندر نہ کوئی تاویل ہے نہ کچھ تخصیص۔ تو جو لوگ بھی اس کا خلاف کریں۔ قرآن و حدیث اور اجماع امت کی رو سے ان کے کفر میں کوئی شبہ نہیں۔ (ترجمہ۔ الشفا بتعریف حقوقِ المصطفیٰ للقاضی عیاض المالکی)

حجۃ الاسلام حضرت امام محمد غزالی (وصال ۵۰۵ھ) فرماتے ہیں:

تمام امت نے یہی مانا ہے کہ اس میں اصلاً کوئی تخصیص یا تاویل نہیں جو شخص لفظ خاتم النبیین میں النبیین کو اپنے عموم و استغراق پر نہ مانے بلکہ اسے کسی تخصیص کی طرف پھیرے اس کی بات مجنوں کی بڑ یا سرسامی کی بکواس ہے اور اس کی تکفیر سے کوئی چیز مانع نہیں۔ کیوں کہ اس نے نص قرآنی کی تکذیب کی ہے جس میں نہ کوئی تاویل ہے نہ تخصیص۔ (ترجمہ۔ ص ۱۱۴۔ الاقتصاد فی الاعتقاد مطبوعہ مصر)

حضرت سیدی عبد الغنی نابلسی (وصال ۱۱۴۳ھ) فرماتے ہیں:

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یا بعد میں کسی کو نبوت ملنی جائز ماننے سے قرآن حکیم

کی تکذیب لازم آتی ہے۔قرآن حکیم صاف فرما چکا ہے کہ آپ خاتم النبیین ہیں۔آخر المرسلین ہیں۔حدیث نبوی میں وارد ہے کہ میں آخری نبی ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

ساری امت کا اس پر اجماع ہے کہ کلام اپنے ظاہر پر ہے۔(یعنی عموم و استغراق بلا تاویل و تخصیص) اور یہ ان مشہور مسائل میں سے ہے جن کے سبب علمائے اسلام نے فلاسفہ کو کافر کہا ہے۔ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔(ترجمہ المطالب الوفیۃ شرح الفرائد السنیۃ للنابلسی بحوالہ المعتقد المنتقد)

خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نئے نبی کے امکان و وقوع کی زور دار مذہبی و علمی اور تاریخی و قانونی بحث قومی اسمبلی پاکستان میں بھی اس وقت چلی جب ستمبر ۱۹۷۴ء میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیے جانے کا ہنگامہ خیز اور تاریخ ساز مسئلہ زیر بحث تھا۔

قادیانیوں کے سربراہ مرزا ناصر احمد یا مرزا طاہر احمد نے حکومتِ پاکستان کی اجازت سے قومی اسمبلی پاکستان میں اپنی صفائی دیتے ہوئے کہا کہ اگر ہم کسی نئے نبی کے قائل ہیں جو خاتم النبیین ﷺ کے طفیل میں آپ کے ہی فیضانِ نبوت کا عکس اور پرتو ہے جس سے خاتمیتِ محمدی میں کوئی فرق نہیں آتا تو ہم ہی مجرم کیوں ہیں؟ اس کے امکان کی بات تو خود جماعتِ دیوبند کے سب سے بڑے عالم مولانا محمد قاسم نانوتوی نے تحذیر الناس میں لکھ دی ہے کہ اگر بالفرض بعد زمانۂ نبوی بھی کوئی نبی پیدا ہو تو پھر بھی خاتمیتِ محمدی میں کچھ فرق نہ آئے گا چہ جائے کہ آپ کے معاصر کسی اور زمین یا فرض کیجیے کہ اسی زمین میں کوئی اور نبی تجویز کیا جائے۔

مرزا کی اس بات کا اطمینان بخش جواب قومی اسمبلی پاکستان کے اندر جمعیۃ العلمائے اسلام کے مشہور دیوبندی قائدین اور علما مفتی محمود اور مولانا غلام غوث ہزاروی وغیرہ میں سے کوئی نہ دے سکا اور مرزا اپنی بات دُہراتا رہا۔

اس نازک موقعہ پر ممبرانِ قومی اسمبلی حضرت مولانا شاہ احمد نورانی (متوفی شوال ۱۴۲۴ھ/ دسمبر ۲۰۰۳ء فرزند حضرت مولانا عبد العلیم صدیقی میرٹھی متوفی ۱۳۷۴ھ/ ۱۹۵۴ء مدفون جنت البقیع مدینہ منورہ خلیفۂ امام احمد رضا بریلوی) و حضرت مولانا عبد المصطفیٰ ازھری (متوفی ربیع الاول

۱۴۱۰ھ/ اکتوبر ۱۹۸۹ء فرزند حضرت مولانا امجد علی اعظمی متوفی ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء خلیفۂ امام احمد رضا بریلوی) نے ایمانی بصیرت اور جرأت وقوت و استقامت کے ساتھ مرزا کی باتوں کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:

ہم رسول اکرم پیغمبر اسلام ﷺ کو ایسا خاتم النبین اور ایسا آخر الانبیا سمجھتے ہیں کہ آپ کے بعد قیامت تک کسی بھی طرح کا کوئی نبی پیدا نہیں ہوسکتا اور اس کے خلاف جس کا عقیدہ ہو اسے ہم علمائے اہل سنت کافر قرار دیتے ہیں۔ جو شخص کسی طرح کے نئے نبی کی بعثت کا امکان مانے وہ بھی اور جو شخص اس کا وقوع مانے وہ بھی دونوں کے دونوں ہمارے نزدیک بالاتفاق والاجماع کافر ہیں۔ یہی کتاب وسنت کا فیصلہ ہے اور اسی پر صحابہ وتابعین اور ساری امت کا اجماع ہے۔ اس سلسلے میں حضرت مولانا احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا مرتبہ اور علمائے حرمین شریفین کا مصدقہ فتویٰ بنام ''حسام الحرمین'' قومی اسمبلی میں پیش کیا جاچکا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ بحث اور یہ تقریر قومی اسمبلی پاکستان کے ریکارڈ اور اس وقت کے اخبارات ورسائل کی فائل میں موجود ہے۔

(۴) کا جواب خود ہی مدیر موصوف نے علامہ شبیر احمد عثمانی از ڈاکٹر علی ارشد کا حوالہ دے کر دے دیا ہے۔

(۴) تحریک خلافت وترک موالات کے بیشتر علما اور تقریباً سبھی قائدین نے مسلمانانِ ہند کو جذباتی سیلاب میں بہایا اور شرعی حدود کو تجاوز کیا۔ اس وقت اس طرح کے فتاویٰ جاری ہورہے تھے کہ ان کے حامی وہم نوا مسلمان ہندو مسلم اتحاد کی رو میں بہتے گئے اور لیڈرانِ قوم ان کا استحصال کرتے گئے۔ اس پوری تحریک کی قیادت گاندھی نے کی اور دو تین سال کے اندر ہی ۱۹۲۲ء میں گاندھی کی حکمتِ عملی جب تبدیل ہوئی اور ۱۹۲۴ء میں انھوں نے نان کوآپریشن موومنٹ/تحریک عدم تعاون ختم کرنے کا باضابطہ اعلان کیا تو پھر یہ فتاویٰ بھی سرد خانے کی امانت بن گئے۔

اجتناب از نقضِ امن و اتباع شریعت کی شرط کے ساتھ (شیخ الھند) مولانا محمود حسن دیوبندی (متوفی نومبر ۱۹۲۰ء) نے ۳ر ذوالقعدہ ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۲۰ء میں یہ فتویٰ جاری کیا ——

''اعدائے اسلام کے ساتھ تعاون وموالات کو اعتقاداً اور عملاً ترک کردیں۔ اس مسئلہ کی شرعی حیثیت نا قابلِ انکار ہے اور ایک صادق مسلمان کی غیرت کا ایسے حالات میں یہ ہی اقتضاء ہونا چاہیے کہ وہ:

(۱) سرکاری اعزازوں اور خطابات کو واپس کردے (۲) ملک کی جدید کونسلوں میں شریک ہونے سے انکار کردے (۳) صرف اپنی ملکی اشیا اور مصنوعات کا استعمال کرے (۴) سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں اپنے بچوں کو داخل نہ کرے۔ (ص:۳۱۶۔ حصہ دوم نقش حیات از مولانا حسین احمد مدنی۔ مکتبہ دینیہ دیوبند ۱۹۹۹ء)

یہی فتویٰ جمعیۃ علمائے ہند کے متفقہ فتویٰ کی صورت میں تقریباً پانچ سو علماء کے دستخط سے شایع کیا گیا۔ (ص:۳۱۷۔ حصہ دوم نقش حیات)

مولانا حسین احمد مدنی لکھتے ہیں— ''ملک کے تمام اہل الرائے ہندو اور مسلمان برطانیہ سے نہایت برگشتہ ہورہے تھے۔ مہاتما گاندھی کی رائے قبولیتِ عامہ حاصل کرچکی تھی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ترک موالات کے متعلق طلبائے یونیورسٹی (علی گڑھ) نے فتویٰ حاصل کرلیا تھا جس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ترک موالات کی تمام دفعات میں کانگریس کی موافقت کی تھی اور تمام مسلمانوں اور طلبائے مسلم یونیورسٹی کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اس پر عمل کریں۔

گورنمنٹ سے قطع تعلق کرلیں اور تمام کالج اور اسکول کی گورنمنٹی امداد چھوڑ دیں اور اگر کالجوں اور اسکولوں کے زعماء ایڈ نہ چھوڑیں تو طلبہ ایسے کالجوں اور اسکولوں سے نکل جائیں۔ نیز ملازمان حکومت انگریزی ان ملازمتوں سے علیحدہ ہوجائیں جن میں حکومت کی امداد خالص طور پر ہوتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ (ص:۳۱۴۔ حصہ دوم۔ نقش حیات از مولانا حسین احمد مدنی)

۱۹۲۰ء میں جمعیۃ علمائے ہند کے تاسیسی اجلاس منعقدہ دہلی کا خطبۂ صدارت مولانا محمود حسن دیوبندی کی جانب سے انھیں کے حکم پر مفتی کفایت اللہ شاہجہاں پوری ثم دہلوی نے لکھا اور چھپوایا جسے مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندی نے اجلاس میں پڑھ کر سنایا۔ علمائے حق از مولانا سید محمد میاں ناظم جمعیۃ العلما کے حوالہ سے مولانا حسین احمد مدنی اسی خطبۂ صدارت از مولانا محمود حسن دیوبندی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''حضرت شیخ کا خطبۂ صدارت اگرچہ نہایت مختصر تھا مگر علمائے ملت اور ملی سیاست کے

تقاضہ کو پورا کرنے کے لئے مکمل اور کافی تھا۔ حضرت شیخ الھند کے اس خطبۂ صدارت نے علماے ملت کو مندرجہ ذیل اصول ونظریات کی ہدایت فرمائی۔

(۱) اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن انگریز ہے جس سے ترکِ موالات فرض ہے۔

(۲) تحفظ ملت اور تحفظ خلافت کے خالص اسلامی مطالبہ میں اگر برادران وطن ہم دردی اور اعانت کریں تو جائز اور مستحقِ شکریہ ہیں۔

(۳) استخلاصِ وطن کے لئے برادرانِ وطن سے اشتراکِ عمل جائز ہے مگر اس طرح کہ مذہبی حقوق میں رخنہ واقع نہ ہو۔

(۴) اگر موجودہ زمانہ میں توپ، بندوق، ہوائی جہاز کا استعمال مدافعتِ اعداء کے لئے جائز ہوسکتا ہے باوجودیکہ قرونِ اولیٰ میں یہ چیزیں نہ تھیں تو مظاہروں اور قومی اتحادوں اور متفقہ مطالبوں کے جواز میں بھی تأمل نہ ہوگا۔ کیوں کہ موجودہ زمانہ میں ایسے لوگوں کے لئے جن کے ہاتھ میں توپ، بندوق، ہوائی جہاز نہیں ہیں یہی چیزیں ہتھیار ہیں۔

(صفحہ ۱۶۔ خطبۂ صدارت مطبوعہ مطبع قاسمی دیوبند)

حضرت شیخ الھند کی اختتامی تحریر جو آخری اجلاس میں پڑھی گئی اس کے چند جملے بلفظہٖ درج ذیل ہیں:

کچھ شبہ نہیں کہ حق تعالیٰ جل شانہ نے آپ کے ہم وطن اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر التعداد قوم (ہنود) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے پاک مقصد کے حصول کے لئے مؤید بنادیا ہے اور میں ان دونوں قوموں کے اتحاد واتفاق کو بہت ہی مفید اور نتیجہ خیز سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اس کے لئے فریقین کے عمایدنے کی ہیں اور کر رہے ہیں اس کے لئے میرے دل میں بہت قدر ہے۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ صورت حال اگر اس کے مخالف ہوگی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو ہمیشہ کے لئے ناممکن بنادے گی۔ (ص:۳۲۲ حصہ دوم نقش حیات از مولانا حسین احمد مدنی۔ مکتبہ دینیہ دیوبند ۱۹۹۹ء)

تحریک خلافت وترک وموالات وہجرت کے اثرات ونتائج کے بارے میں پروفیسر محمد مجیب (جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی) اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

’’جنگ کے بعد جب ۱۹۱۹ء کے وسط میں خلافت کانفرنس کی تشکیل عمل میں آئی اور نومبر میں اس کا عام اجلاس دہلی میں منعقد ہوا تو ہندوستانی مسلم قیادت نے بڑی سمجھداری سے اس کا صدر مہاتما گاندھی کو بنا دیا۔ رولٹ ایکٹ کے خلاف جدو جہد میں مسلمانوں نے پورے خلوص سے اور موثر طور پر حصہ لیا تھا اور عدم تعاون کی تحریک میں دل و جان سے شامل ہو کر دونوں ملتوں نے اتحاد کے رشتے مضبوط کیے تھے۔ (ص ۶۲۳۔ ہندوستانی مسلمان از پروفیسر محمد مجیب، مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو۔ نئی دہلی ۱۹۹۸ء)

’’قوم پرور علماء نے جمعیۃ العلمائے ہند قائم کی اور اس تنظیم کا پہلا پبلک اجلاس دسمبر ۱۹۱۹ء میں امر تسر میں منعقد ہوا............ اس کے بعد کے سال میں ایک ایسی تباہ کن غلطی ہوئی جس نے بتا دیا کہ بے روک ٹوک مذہبی جوش و خروش کہاں لے جا سکتا ہے۔ یہ خیال پیش کیا گیا کہ اگر انگریزوں نے ترکی کے سلطان کے ساتھ جو خلیفہ بھی تھا انصاف نہ کیا تو مسلمانوں کو چاہیے کہ ہجرت کر کے قریب ترین دارالامن یعنی افغانستان چلے جائیں۔ اس ہوش رُبا تجویز کو تسلیم کر لیا گیا اور مولانا عبدالباری نے ہجرت کی حمایت میں فتویٰ جاری کر دیا۔ کوئی اٹھارہ ہزار مسلمانوں نے ہجرت کا فیصلہ کر کے اپنی ساری جمع پونجی فروخت کر ڈالی۔ ابھی اور لوگ بھی ہجرت کے لئے کمر باندھ رہے تھے کہ افغانستان حکومت نے مہاجرین کے داخلے پر پابندی عاید کر دی۔ اٹھارہ ہزار خاندان تو گویا بالکل تباہ ہو گئے۔ جو لوگ یہ مصائب جھیل کر اپنے گھروں کو واپس آنے میں کامیاب ہو گئے ان کی تکلیفیں کم کرنے کے لئے خلافتیوں نے حتی الوسع کوشش کی لیکن یہ واقعہ یہ سبق نہ دے پایا کہ مذہبی ولولے کو سنجیدہ سوچ کی بھٹی میں تپانا ضروری ہوتا ہے۔ (ص ۵۷۴۔ ہندوستانی مسلمان از پروفیسر محمد مجیب)

’’عدم تعاون کی تحریک ۱۹۲۲ء میں واپس لی گئی۔ اس سے کتنی بدظنی پھیلی اور انتشار پیدا ہوا اس کا اندازہ فسادات کی اس تعداد سے ہو سکتا ہے جو ملک کے مختلف حصوں میں پھوٹ پڑے۔ ۱۹۲۳ء میں گیارہ۔ ۱۹۲۴ء میں آٹھ۔ ۱۹۲۵ء میں سولہ۔ ۱۹۲۶ء میں ۳۵۔ (ص ۶۲۶۔ ہندوستانی مسلمان از پروفیسر محمد مجیب)

’’عدم تعاون کی تحریک ۱۹۲۲ء میں واپس لی گئی تو ان سب کو اس سے زبردست صدمہ پہنچا جو اس میں شریک تھے۔ مسلمانوں کے لئے خاص طور پر یہ بات بہت تباہ کن ثابت ہوئی۔ انھوں نے مذہبی بنیاد پر غیر مشروط فیصلے کیے تھے اور ان کی طرف سے رہنماؤں نے تحریک کی واپسی کے

جو اعلان کیے ان میں کوئی مذہبی وجوہ نہیں تھے۔ (ص:۶۲۴۔ ہندوستانی مسلمان)

''ایک دور ایسا تھا جب اسٹیج پر مولانا محمد علی چھائے ہوئے تھے۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء میں وہ مہاتما گاندھی کے اتنے قریب تھے جتنے اور کوئی سیاسی رہنما کسی وقت ہو سکتے تھے۔ لیکن جب ۱۹۲۳ء میں وہ جیل سے باہر آئے اور ملک کی صورتِ حال کا مطالعہ کیا تو انھیں مجبوراً مہاتما گاندھی کا ساتھ چھوڑنا پڑا۔ انھوں نے ہندوؤں کی جارحیت اور لڑاکا پن کے خلاف مسلمانوں کے غم وغصہ کی نمائندگی شروع کردی۔ (ص ۶۲۷۔ ہندوستانی مسلمان)

''۱۹۲۳ء کے بعد جب مولانا محمد علی مہاتما گاندھی سے دور ہونے لگے تو صرف ایک ملت کے ایسے لیڈر ہو کر رہ گئے جن کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کل کیا کریں گے۔ اور جو ہر قسم کے اختلافی معاملے میں شامل ہونے کے لئے تیار رہتے تھے۔ ان کی قوتِ عمل برقرار تھی لیکن اب بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ (ص ۵۷۷۔ ہندوستانی مسلمان)

''برطانوی حکومت پر براہ راست عمل کے ذریعہ دباؤ ڈالنے کی غرض سے مہاتما گاندھی نے مارچ ۱۹۳۰ء میں نمک ستیہ شروع کی۔ یہ اس بات کا فیصلہ تھا کہ سب سے پہلی شرط ہے آزادی کا حصول۔ دوسرے مسائل آزادی کے بعد ہی حل ہوسکیں گے۔ چنانچہ سوال یہ اٹھا کہ کیا مستقبل میں اپنے مقام اور حقوق کی ضمانت حاصل کیے بغیر مسلمان سول نافرمانی کی تحریک میں حصہ لیں؟ اس میں کتنوں نے حصہ نہیں لیا اس پر اختلاف ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ شرکت خاصی تعداد میں ہوئی۔

اپریل ۱۹۳۰ء میں بمبئی میں جو آل انڈیا مسلم کانفرنس ہوئی اس میں مولانا محمد علی نے اعلان کیا کہ مسلمان برطانوی غلبہ نہیں چاہتے لیکن وہ ہندو غلبہ بھی نہیں چاہتے۔ اور وہ مسٹر گاندھی کی تحریک میں حصہ نہیں لے سکتے کیوں کہ اس تحریک کا مقصد ہندوستان کے لئے آزادی حاصل کرنا نہیں بلکہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں کو ہندو مہاسبھا کا غلام بنانا ہے۔

مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد یہی محسوس کرتی تھی اس لئے انھوں نے مولانا محمد علی کی خوب خوب تعریف کی کہ انھوں نے ان جذبات کو پوری وضاحت اور شد و مد کے ساتھ پیش کردیا تھا۔ لیکن انصاف کا تقاضہ یہ کہنے پر مجبور بھی کرتا ہے کہ دوسری طرف ایسے رجعت پسند ہندو بھی تھے جو قومی اِحیا کا مطلب ہی یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو دبایا جائے۔ (ص ۶۲۸۔ ہندوستانی مسلمان از پروفیسر محمد مجیب۔ قومی کونسل، نئی دہلی)

مولانا نذیر احمد جخندی میرٹھی کے استفتاء محررہ محرم الحرام ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۰ء مرسلہ از ممبئی کے جواب میں امام احمد رضا بریلوی تحریر فرماتے ہیں:

ہر سلطنت اسلام نہ صرف سلطنت ہر جماعتِ اسلام نہ صرف جماعت ہر فرد اسلام کی خیر خواہی ہر مسلمان پر فرض ہے۔

قال رسول اللّٰہ ﷺ ۔ الدین النصح لکل مسلم۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا! دین اسلام ہر مسلمان کی خیر خواہی کا نام ہے۔

مگر ہر تکلیف بقدر استطاعت اور ہر فرض بقدرِ قدرت ہے۔ نامقدور بات پر مسلمان کو ابھارنا جو نہ ہو سکے اور ضرر دے اور اسے فرض ٹھہرانا شریعت پر افترا اور مسلمانوں کی بدخواہی ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: لا یکلف اللّٰہ نفسا اِلا وسعھا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اللہ کسی جان پر بوجھ نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت بھر۔

و قال اللہ تعالیٰ: فاتقوا اللّٰہ ما استطعتم۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تو اللہ سے ڈرو جہاں تک ہو سکے۔

پھر خیر خواہیٔ اسلام حدودِ اسلام میں رہ کر ہے۔ مشرکین سے اتحاد و موالات اور ان کے راضی کرنے کو شعائرِ اسلام کی بندش، مشرک لیڈروں کو اپنے دین کا ہادی و رہبر بنانا، مشرک لیکچرر کو مسلمانوں کا واعظ ٹھہرانا، اسے مسجد میں لے جا کر جماعتِ مسلمین سے اونچا کھڑا کر کے لیکچر دلوانا، اپنے ماتھے پر مشرکوں سے قشقے لگوانا، مشرکوں کے مجمع میں مشرک لیڈروں کی جے پکارنا، مشرک لیڈروں کی ٹکٹی اپنے کندھوں پر اٹھا کر مرگھٹ میں لے جانا، مساجد کو مشرک کا ماتم گاہ بنانا، اس کے ماتم کے لئے مساجد میں سر برہنہ ہونا، اس کے لئے نماز و دعائے مغفرت کا اشتہار دینا، قرآنِ مجید اور رامائن کو ایک ڈولے میں رکھ کر دونوں کی پوجا کراتے ہوئے مندر میں لے جانا، ...... صاف لکھ دینا کہ ہم نے قرآن و حدیث کی تمام عمر بت پرستی پر نثار کر دی، صاف لکھ دینا کہ اگر آج تم نے ہندو بھائیوں کو راضی کر لیا تو اپنے خدا کو راضی کر لیا۔ صاف لکھ دینا کہ ہماری جماعت ایک ایسا مذہب بنانے کی فکر میں ہے جو کفر و اسلام کا امتیاز اٹھا دے گا۔ صاف لکھ دینا کہ

ہم ایسا مذہب بنانا چاہتے ہیں جو سنگم و پریاگ کو مقدس مقام ٹھہرائے گا۔

یہ امور خیر خواہیِ اسلام نہیں کند چھری سے اسلام کو ذبح کرنا ہے۔ یہ سب افعال و اقوال ضلال بعید و کفرِ شدید ہیں اور ان کے فاعل و قائل و قابل اعدائے دین حمید و دشمنانِ رب مجید ہیں۔

اتخذوا دينهم لهوا و لعبا — بدلوا نعمة الله كفرا — و سيعلم الذين ظلموا اى منقلب ينقلبون۔

جنھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنالیا— اللہ کی نعمت ناشکری سے بدل دی— اور اب جاننا چاہتے ہیں ظالم کہ کس کروٹ پر پلٹا کھائیں گے۔

(ص:۱۳۳۔۱۳۴۔جلد۱۴۔فتاویٰ رضویہ مترجم۔رضا فاؤنڈیشن لاہور)

جو شخص حفاظت اسلام و سلطنت اسلام و اماکنِ مقدسہ کی استطاعت رکھتا ہے اور کاہلی سے نہ کرے مرتکب کبیرہ ہے یا کفار کی خوشامد و خوشنودی کے لئے تو مستوجبِ لعنت ہے یا دل سے ضررِ اسلام پسند کرنے کے سبب تو کافر ہے۔ اور جو استطاعت نہیں رکھتا معذور ہے۔ شریعت اس کام کا حکم فرماتی ہے جو شرعاً جائز اور عادۃً ممکن اور عقلاً مفید ہو۔ حرام یا ناممکن یا عبث افعال حکم شرع نہیں ہوسکتے۔ (ص:۴۱۶۔جلد۱۴۔فتاویٰ رضویہ مترجم مطبوعہ لاہور)

نمبر (۵) میں مدیر موصوف نے اپنے دل کا غبار شاہ اسماعیل شہیدؒ پر خوب نکالتے ہوئے ہندوستان میں انھیں مسلمانوں میں انتشار کا بانی قرار دیا ہے۔ جس کے جواب میں میں صرف اتنا کہنا یہاں مناسب سمجھتا ہوں کہ پیر مہر علی شاہؒ، حضرت مولانا عبد السمیعؒ، حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ، قاضی فضلِ احمد اور علمائے دیوبند کے متبحر علماء، اہلِ حدیث کی ذی علم شخصیات، جماعتِ اسلامی کے اسلاف ان کی رائے سے متفق نہیں ہیں۔ جو کہ موصوف کے باطل ہونے کے لیے کافی دلیل ہے۔ کیوں کہ عبد السمیع صاحب اور قاضی فضل احمد صاحب نے تو خاں صاحب کے عقیدت مندوں میں سے ہوتے ہوئے بھی اسمٰعیل دہلوی شہید کے حق میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

(۵) شاہ اسمٰعیل دہلوی اور ان کی کتاب تقویۃ الایمان سے متعلق جو حقائق و معلومات زیر

بحث اداریہ میں درج ہیں انھیں پڑھنے کے باوجود مضمون نگار نے عجیب وغریب باتیں لکھ ڈالی ہیں۔ یہ تاریخی حقیقت بھی ذہن نشیں رہنی چاہیے کہ تقویۃ الایمان کا پہلا انگریزی ترجمہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی (لندن) کے رسالہ جلد ۱۲ میں ۱۸۲۵ء میں چھپا تھا اور تقویۃ الایمان کی پہلی اشاعت ۱۲۵۴ھ/ ۱۸۳۸ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے ہوئی اور ہزاروں کی تعداد میں مفت تقسیم کی گئی۔ دیکھیے مقالاتِ سرسید جلد نہم۔ ص ۱۷۸۔

لگے ہاتھوں یہ شہادت بھی پڑھتے چلیں—— ''ہنگامۂ ۱۸۵۷ء میں پورے جوش کے ساتھ انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ لینے میں وہ سب کے سب علمائے کرام شامل تھے جو عقیدۃً حضرت سید احمد اور حضرت شاہ اسمٰعیل کے شدید ترین دشمن تھے اور جنھوں نے حضرت شاہ اسمٰعیل کے رد میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں اور اپنے شاگردوں کو لکھنے کی وصیت کی ہے۔ دیکھیے حاشیہ مقالاتِ سرسید۔ حصہ شانزدہم۔ ص ۳۵۲۔

وہابیت زدہ اسمٰعیلی فکر کے خلاف علامہ فضل حق خیرآبادی نے ''امتناع النظیر'' اور ''تحقیق الفتویٰ فی اِبطالِ الطغویٰ'' کے نام سے معرکتہ الآراء کتابیں لکھی ہیں۔ حضرت سید مہر علی شاہ گولڑوی کا وہابی مخالف مسلک ان کی کئی کتابوں کے علاوہ تقریباً چھ سو صفحات پر مشتمل سوانحی کتاب ''مہر منیر'' سے ظاہر ہے۔ مولانا عبدالسمیع بیدل رام پوری کی کتاب ''انوارِ ساطعہ در بیانِ مولود و فاتحہ'' اور قاضی فضل احمد لدھیانوی کی کتاب ''انوار آفتاب صداقت'' ردِ وہابیت و اسمٰعیلیت میں مشہور ہے۔ ان میں سے کوئی کتاب اگر مضمون نگار کبھی پڑھ نہ سکے تو کم از کم اب سے ہی سہی ان کا مطالعہ کر کے اپنی غلط فہمی دور کر لیں۔ یہاں بھی مضمون نگار نے مطالعۂ بریلویت از خالد محمود پر بھروسہ کر کے سخت ٹھوکر کھائی ہے۔

نمبر (٦) میں موصوف نے ترک تعاون کی تحریک کے سرکردہ سیاسی مسلمان اشخاص کے نماز روزہ کا رونا رویا ہے جو کہ بنا کسی حوالہ کے ہے۔ کسی الزام کا بنا حوالے کے ہونا ہی اس کا ابطال ہے۔ اُسے رد کرنے کے لیے الگ سے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔

(٦) مولانا ابوالکلام آزاد نے نے طلبہ یونین علی گڑھ کو خطاب کرتے ہوئے طلبہ کو کچھ ہدایت کی۔ اس کے بعد کیا ہوا اسے غور سے پڑھیں اور سمجھیں۔

''دوسرے دن پھر اجتماع ہوا تو لڑکوں نے کہا کہ ہم آپ ہی کو ہندوستان کا سب سے بڑا مجتہد اور عالم سمجھتے ہیں۔ تب مولانا نے کہا کہ جب مجھ کو تم لوگ مجاز سمجھتے ہو اور مجھ سے سوال کرتے ہو تو میں کہتا ہوں کہ:

حکومت سے عدم تعاون اسی طرح فرض ہے جس طرح نماز روزہ اور دوسرے ارکانِ اسلام فرض ہیں۔ اور میں تم کو پکارتا ہوں کہ کالج کی چہار دیواری سے باہر نکلو اور کالج کی تعلیم کا بائیکاٹ کرو۔ (ص:۱۷۰۔ تحریک خلافت۔ از قاضی محمد عدیل عباسی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔ طبعِ دوم ۱۹۹۷ء)

''حکومت سے ترک موالات اس طرح فرض ہے جس طرح نماز روزہ اور دوسرے ارکان اسلام فرض ہیں۔ (ص:۱۶۴۔ تبرکاتِ آزاد۔ از غلام رسول مہر۔ مطبوعہ دہلی ۱۹۶۳ء)

نمبر (۷) میں موصوف نے قبول کیا ہے کہ احمد رضا خاں صاحب کی ملاقات احمد زینی دحلان سے ہوئی تھی۔ مگر ساتھ ہی ساتھ موصوف شوشے چھوڑنے کی اپنی روش پہ بھی گامزن نظر آتے ہیں جب وہ رقم طراز ہوتے ہیں کہ:

> ''شیخ احمد زینی دحلان کے حکم پر مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے پادریوں کے جواب میں اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''اظہار الحق'' لکھی ہے۔'' اپنے دعویٰ کو مضبوطی عطا کرنے کے لیے انھوں نے نزہۃ الخواطر جلد ۸ کا حوالہ بھی دیا ہے۔ جو کہ تاریخ کو نہ سمجھ سکنے والے ذہن کا پتہ دیتا ہے۔
>
> دراصل ''اظہار الحق'' عیسائی دنیا کے سب سے بڑے حملہ ''میزان الحق'' کا جواب ہے۔ یہاں پر احمد زینی دحلان نے جو گل کھلائے ہیں اُس کے لیے الگ سے کسی مضمون میں مفصل ذکر کیا جائے گا۔ مگر یہاں پر سردست میں صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ نزہۃ الخواطر کا مطالعہ ہی اس کا تسلی بخش جواب ہے۔ میری قارئین سے گزارش ہے کہ وہ نزہۃ الخواطر پڑھیں۔ خود مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے اعترافات میں زینی دحلان کا نام نہیں آتا۔ تاریخ کے مستند ترین شواہد کی بنیاد پر جو چیز سامنے آتی ہے اُس کے مطابق مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے سلطان ترکی کے اشارہ اور وزیر اعظم کے اصرار پر

اس کتاب کو تصنیف کیا۔۱۸۶۳ء میں یہ کتاب قسطنطنیہ سے شائع کی گئی۔
اور اُس کے بعد ترکی کے صدر کے حکم سے اس کا ترکی زبان میں ترجمہ کیا
گیا جو ''ابرار الحق'' کے نام سے شائع کیا گیا۔
تعجب کی بات ہے کہ ایک طرف احمد زینی دحلان (اور ان کے روحانی ہم
زلف احمد رضا خاں) مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کو کتاب کی تصنیف کی
ترغیب دلا رہے ہیں اور دوسری طرف اسی کتاب کی بڑے پیمانے پر
اشاعت کرنے والی ترکی حکومت کے خلاف کمر بستہ بھی ہیں۔

(۷) اپنے سفر نامہ کی تفصیلات اور شیخ احمد بن زینی دحلان سے ملاقات کا ذکر امام رضا بریلوی نے خود کیا ہے جو الملفوظ اور حیات اعلیٰ حضرت وغیرہ میں موجود ہے۔ پھر اسے ''خفیہ ملاقات'' کہنا خواہ مخواہ کی شر پسندی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اور یہ ملاقات حرمین شریفین کے ایک جلیل القدر عالم اور مکہ مکرمہ کے مفتی شافعیہ و شیخ الاسلام سے ہے کسی ہمفرے اور کرنل لارنس سے نہیں ہے۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے اظہار الحق کی تالیف شیخ احمد زینی دحلان کی ترغیب پر کی یہ بات مؤلف نزھۃ الخواطر حکیم عبدالحی رائے بریلوی نے تحریر کی ہے اور اگر کسی دوسرے کی بھی ترغیب اس میں شامل ہو تو اس میں حرج کیا ہے؟ اور دونوں باتوں میں تضاد و منافات کہاں ہے؟

صفحہ آدھ صفحہ، دو دو صفحہ کے تذکرے میں اگر اختصار یا کسی مناسبت کے پیش نظر کسی کتاب یا استاذ یا شاگرد یا مرشد یا بیعت کا ذکر متفرق ہے تو کیا یہ اصولِ تحقیق و تصنیف کے خلاف ہے؟

مضمون نگار کو اگر کوئی شکایت بھی ہے تو مؤلف نزھۃ الخواطر سے ہونی چاہیے۔ رہ گئی بات ترکی حکومت کے خلاف کمر بستہ ہونے کی تو یہاں مختصر سہی مگر کچھ نہ کچھ حوالہ ضرور دیا جانا چاہیے تھا۔ ورنہ بقول مضمون نگار — ''کسی الزام کا بنا حوالہ کے ہونا ہی اس کا اِبطال ہے۔ اسے رد کرنے کے لئے الگ سے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔'' (مذکورہ نمبر ۶)

نمبر (۸) میں مدیر موصوف نے امام احمد رضا، نمبر (۹) میں فضل رسول بدایونی اور نمبر (۱۰) میں احمد زینی دحلان کو اس بناء پر برگزیدہ قرار دیا ہے کہ وہ ردِ وہابیت اور نجدیت میں سرگرداں تھے۔ جب کہ یہی باتیں ان تینوں مذکورہ شخصیات کو ہمفرے کی صف میں لا کھڑا کرتی ہیں۔

(۸)(۹)(۱۰):مذکورہ تینوں شخصیات کی دینی وعلمی فضیلت وعظمت کے اسباب کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ شیخ نجدی بانی وھابیت کے ہمراز و ہمدم ودم ساز مسٹر ہمفرے کو مضمون نگار جہاں چاہیں کھڑا کریں یہ ان کی مرضی اور ان کا معاملہ ہے جس میں ہم کیا دخل دے سکتے ہیں؟

نمبر (۱۱) میں موصوف رقم طراز ہیں:

''امام احمد رضا بریلوی کے خلاف آج تک ان کا کوئی قول وعمل کوئی تحریر و تقریر ایسی پیش نہیں کی جاسکی جس سے ان کے انگریز حامی ہونے کی کوئی کمزور بنیاد بھی کھڑی کی جاسکے۔''

اگر موصوف صرف شوکت علی فہمی جیسے پچیسویں درجہ کے لوگوں کو ہی مستند مؤرخ مانتے ہیں تو دوسری بات ہے۔ ورنہ ایسے ہزار ہا صفحات پر پھیلے ہوئے حوالہ پیش کیے جاسکتے ہیں جو خاں صاحب کو نہ صرف انگریز حامی (جبکہ انگریز حامی ہونا تو قابلِ معافی بھی ہے) ثابت کرتے ہیں بلکہ برطانوی سامراج کا ایک معتبر ترین ایجنٹ ثابت کرتے ہیں۔ ویسے مثال کے لیے تو ان کی زندگی بھر کی محنت کو بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔ ان کی کتابیں ''حسام الحرمین''، ''دوام العیش''، ''اعلام الاعلام بان ہندوستان دارالاسلام'' کے ساتھ ساتھ فتاویٰ رضویہ کے فتاویٰ کو بھی میں اپنے دعویٰ کے دلائل کے طور پر پیش کرسکتا ہوں مگر میں موصوف کی تسلی کے لیے انھیں صلاح دیتا ہوں کہ خاں صاحب کی ''غداریِ وطن'' کے ہزاروں صفحات میں سے وہ کم از کم P.Hardy کی کتاب "The Muslims in British India" اور فرانسس رابنسن کو "Separatisim among Indian Muslims" میں ضرور پڑھیں۔ پی ہارڈی تو یہاں تک لکھتا ہے کہ مولانا احمد رضا خان کے حکومت کے حق میں دیے گئے فتاویٰ حکومت کے لیے نہایت ہی مفید ثابت ہوئے اور انھوں نے مسلمانوں کے پچھڑے ہوئے طبقات میں اپنا کافی اثر دکھایا۔

(۱۱) امام احمد رضا بریلوی نے اپنے فتاویٰ مسلمانوں کے سوال پر مسلمانوں کی ھدایت و رہنمائی کے لئے جاری کیے ہیں جن میں حکم شریعت کو واضح وآشکارا کیا گیا ہے۔ انھوں نے یا ان کے تلامذہ وخلفا نے کسی انگریز گورنر کو مدعو کر کے شمس العلماء کا خطاب حاصل کرنے کا جرم نہیں کیا ہے جیسا کہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حافظ محمد احمد فرزند مولانا محمد قاسم نانوتوی کے دور میں ہوا اور

انھیں شمس العلماء کے خطاب سے نوازا گیا۔

آئندہ صفحات میں مولانا اشرف علی تھانوی اور ان کے انگریزی جاسوس بھائی مظہر علی تھانوی کے بارے میں خود علمائے دیوبند کے جو خیالات و تحقیقات ہیں انھیں پڑھ کر ذرا کچھ پرانے لوگوں سے اور پرانی تحریروں سے مضمون نگار یہ بھی تحقیق کرلیں کہ کیا مولانا تھانوی کی طرح حافظ محمد احمد جن کا ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم اجمل خاں اور دہلی کے دوسرے مسلم لیڈروں کے یہاں آنا جانا تھا ان کے ذریعہ بھی انگریزوں تک کچھ خفیہ خبریں تو نہیں پہنچتی تھیں؟

آپ کے ذکر کردہ دونوں مؤرخین کی تحقیق کا حال ہمیں پہلے سے معلوم ہے۔ روبنسن کی معلومات کا سرچشمہ وہ انٹرویو ہے جو مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی استاذ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (متوفی ۵؍فروری ۱۹۹۰ء) سے ۲۹؍مئی ۱۹۶۸ء میں لیا گیا ہے۔ دیکھیے روبنسن کی مذکورہ کتاب کا ص ۴۴۲۔ اور اپنی غلط فہمی دور کرلیجیے۔

۱۹۷۷ء کے لگ بھگ ایک سفر پروفیسر فرانسس رابنسن نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا کیا تھا۔ ان کی آمد کی اطلاع پاکر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے چند اساتذہ وطلبہ نے انھیں اپنے مرکز تعلیمات اسلامی، دودھ پور، علی گڑھ کے دفتر میں مدعو کیا۔ اساتذہ میں حضرت سید ظہیر احمد زیدی و حکیم خلیل احمد جائسی اور طلبہ میں قاضی نثار احمد کشمیری، ڈاکٹر محمد اسد پیلی بھیتی، ڈاکٹر محبّ الحق اعظمی، وغیرہ شریک محفل تھے۔

ان حضرات نے پروفیسر روبنس سے امام احمد رضا بریلوی کی دینی وعلمی خدمات کا تفصیلی تعارف کرایا۔ تحریک خلافت وتحریک ترکِ موالات کے بحرانی دور میں امام احمد رضا کے شرعی موقف سے آگاہ کیا کہ انھوں نے صرف شریعت کی نصرت وحمایت میں شرعی حکم واضح کیا ہے اور کسی حکومت و جماعت وقوم وفرد کی خوشی و ناخوشی سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ پروفیسر روبنسن نے کچھ سوالات کیے جن کے جوابات دیے گئے اور کچھ سوالات جو ان سے کیے گئے ان کے جوابات دیے۔ انھوں نے اختتامی اور فیصلہ کن بات یہ کہی کہ:

> ”میں نہیں جانتا تھا کہ مولانا احمد رضا اتنے بڑے عالم تھے اور وہ اتنے ہمہ گیر اثرات کے مالک تھے۔ مجھے جو بتایا گیا تھا اور میرا جو تأثر تھا وہ میں

نے قلمبند کر دیا تھا۔ میں اس سے پیدا شدہ غلط فہمی کے ازالہ اور اس کی تلافی کی کوشش کروں گا۔"

ان طلبہ و اساتذۂ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اس ملاقات و مذاکرہ کے آخر میں امام احمد رضا و علمائے اہل سنت کی دو تین درجن کتب و رسائل کا تحفہ پیش کیا جس سے پروفیسر روبنسن بہت مسرور ہوئے اور سب کا شکریہ ادا کیا۔

مولانا خالد محمود نے مطالعۂ بریلویت جلد سوم ص ۴۳۸ پر فرانس روبنس کی کتاب سپر ٹیزم امنگ انڈین مسلم ص ۴۲۲ کے حوالہ سے جو انگریزی عبارت مع ترجمہ نقل کی ہے اس میں کوئی حوالہ کوئی سند کوئی دستاویز نہیں صرف رابنسن کے اپنے ذاتی خیالات ہیں۔

۱۹۱۷ء میں مجلس موید الاسلام کے وفد برائے ملاقات وائسرے ہند کے اسماء مولانا خالد محمود نے مطالعۂ بریلویت جلد سوم ص ۴۳۷ میں بحوالہ دی مسلم آف برٹش انڈیا ص ۲۷۹ و ص ۲۸۵ از پی ہارڈی درج کیے ہیں اس میں بھی کوئی حوالہ کوئی سند اور کوئی دستاویز نہیں۔ اور ص ۲۶۸ پر تاج برطانیہ کی حمایت میں بقول پی ہارڈی مولانا احمد رضا بریلوی کے فتاویٰ انگریزوں کے ایما پر دیے گئے ہیں اس کے حوالہ و سند میں گورکھپور سے نکلنے والے اخبار مشرق اور ایک دوسرے اخبار البشر کے نام ہیں۔ جو ظاہر ہے کہ امام احمد رضا کے مخالفین کی بدگمانی و الزام تراشی کا نتیجہ ہے۔

اردو زبان کے دیوبندی محققین و مؤرخین کے لئے مقام حیرت و استعجاب ہے کہ جو حوالہ تقریباً ستر اسی سال میں وہ پیش نہ کر سکے انھیں پی ہارڈی نے اپنی انگریزی کتاب میں نقل کر کے گویا ان کے منہ پر طمانچہ رسید کر دیا ہے کہ آپ کیا اور آپ کی تحقیق کیا؟

امام احمد رضا بریلوی پر انگریز نوازی اور غدارئ وطن کا الزام لگانے سے پہلے مضمون نگار کو مندرجہ ذیل تاریخی حقائق کا علم ضرور ہونا چاہیے تھا۔

"سید صاحب کی برابر یہ روش رہی کہ ایک طرف لوگوں کو سکھوں کے مقابل آمادۂ جہاد کرتے اور دوسری جانب حکومت برطانیہ کی امن پسندی جتا کر لوگوں کو اس کے مقابلے سے روکتے۔ (ص:۲۵۲۔ الدر المنثور۔ از مولوی عبدالرحیم صادق پوری)

’’کلکتہ میں جب مولانا اسمٰعیل نے جہاد کا وعظ فرمانا شروع کیا اور سکھوں کے مظالم کی کیفیت پیش کی تو ایک شخص نے دریافت کیا۔ آپ انگریزوں پر جہاد کا فتویٰ کیوں نہیں دیتے؟ آپ نے جواب دیا۔

ان پر جہاد کسی طرح واجب نہیں ہے۔ ایک تو ان کی رعیت ہیں۔ دوسرے ہمارے مذہبی ارکان ادا کرنے میں وہ ذرا بھی دست اندازی نہیں کرتے۔ ہمیں ان کی حکومت میں ہر طرح آزادی ہے۔ بلکہ ان پر کوئی حملہ آور ہو تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس سے لڑیں اور اپنی گورنمنٹ پر آنچ نہ آنے دیں۔ (ص ۲۹۶۔ حیات طیبہ۔ مرتبہ مرزا حیرت دہلوی۔ مطبع فاروقی دہلی۔ وص:۳۷۰۔ تواریخ عجیبہ۔ مرتبہ محمد جعفر تھانیسری۔ مطبع فاروقی دہلی)

’’سید صاحب کے پاس مجاہدین جمع ہونے لگے تو سید صاحب نے مولانا اسمٰعیل کے مشورے سے شیخ غلام علی رئیس الہ آباد کی معرفت لفٹننٹ گورنر ممالک مغربی شمالی کی خدمت میں اطلاع دی کہ ہم لوگ سکھوں پر جہاد کرنے کی تیاری کرنے کو ہیں۔ سرکار کو تو اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے؟ لفٹننٹ گورنر صاحب نے صاف لکھ دیا کہ ہماری عمل داری میں اور امن میں خلل نہ پڑے تو ہمیں کچھ سروکار نہیں۔ (ص ۳۰۲۔ حیات طیبہ از مرزا حیرت دہلوی)

’’آپ کی سوانح عمری اور مکاتیب میں بیس سے زیادہ ایسے مقامات ہیں جہاں کھلے کھلے اور اعلانیہ طور پر سید صاحب نے بدلائل شرعی اپنے پیرو لوگوں کو سرکار انگریزی کی مخالفت سے منع کیا ہے۔ (ص:۲۲۶۔ سوانح احمدی۔ از محمد جعفر تھانیسری۔ مطبوعہ اسٹیم پریس۔ لاہور)

’’اس سوانح اور مکتوباتِ منسلکہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کا سرکار انگریزی سے جہاد کرنے کا ارادہ ہرگز نہ تھا۔ وہ اس عمل داری کو اپنی ہی عمل داری سمجھتے تھے۔ اور اس میں شک نہیں کہ اگر سرکار انگریزی اس وقت سید صاحب کے خلاف ہوتی تو ہندوستان سے سید صاحب کو کچھ مدد نہ پہنچتی۔ مگر سرکار انگریزی اس وقت دل سے چاہتی تھی کہ سکھوں کا زور کم ہو۔ (ص:۱۸۲۔ تواریخ عجیبہ۔ از محمد جعفر تھانیسری)

’’یہ تمام بیّن ثبوت صاف اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ جہاد صرف

سکھوں سے مخصوص تھا۔ سرکار انگریزی سے مسلمانوں کو ہرگز مخاصمت نہ تھی۔ (ص:۵۲۳۔ حیات طیبہ از مرزا حیرت دہلوی مطبع فاروقی دہلی)

''جب صاحب کمشنر اور صاحب مجسٹریٹ کو اس امر کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے گورنمنٹ کو اطلاع دی۔ گورنمنٹ نے ان کو صاف لکھا کہ تم کو اس معاملے میں دست اندازی نہیں کرنی چاہیے۔ کیوں کہ ان کا ارادہ کچھ انگریز گورنمنٹ کے مقاصد کے خلاف نہیں ہے۔ (ص:۱۴۲۔ ج۹۔ مقالات سرسید۔ مجلس ترقی ادب لاہور)

سرسید اپنے رسالہ اسباب بغاوت ہند مطبوعہ ۱۸۵۸ء میں لکھتے ہیں:

''بیس تیس برس پیشتر ایک بہت بڑے نامی مولوی محمد اسمٰعیل نے ہندوستان میں جہاد کا وعظ کیا۔ اور آدمیوں کو جہاد کی ترغیب دی۔ اس وقت انھوں نے صاف بیان کیا کہ ہندوستان کے رہنے والے جو سرکار انگریزی کی امن میں رہتے ہیں ہندوستان میں جہاد نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہزاروں آدمی جہادی ہر ضلع ہندوستان میں جمع ہوئے اور سرکاری عمل داری میں کسی طرح کا فساد نہیں کیا اور غربی سرحد پنجاب پر جا کر لڑائی کی۔ (ص:۸۱۰۔ حیات جاوید از خواجہ الطاف حسین حالی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی۔ طبع پنجم ۲۰۰۴ء)

سکھ مخالف مہم کو انگریز مخالف مہم کی شکل دینے کی کوشش کرتے ہوئے ''جہاد کا مقصد'' کے ذیلی عنوان کے تحت مولانا حسین احمد مدنی بحوالہ ماہنامہ برہان دہلی جلد ۲۱۔ اگست ۱۹۴۸ء لکھتے ہیں۔

''لیکن اس جہاد سے سید صاحب کا مقصد ملک گیری اور کوئی دنیوی منفعت بالکل نہیں تھا۔ چنانچہ اپنے خطوط اور خطبات و مواعظ میں آپ بار بار اس کا تذکرہ فرماتے تھے۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری جو حضرت سید صاحب کے نہایت مستند سوانح نگار ہیں، لکھتے ہیں:

ایک مرتبہ ایک سوال کے جواب میں سید صاحب نے صاف صاف فرمایا کہ کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت کرنا نہیں چاہتے بلکہ سکھوں سے جہاد کرنے کی صرف یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے برادرانِ اسلام پر ظلم کرتے اور اذان وغیرہ مذہبی فرائض ادا کرنے میں مزاحم ہوتے ہیں۔

اگر سکھ اب یا ہمارے غلبہ کے بعد ان حرکات مستوجبِ جہاد سے باز آجائیں تو ہم کو ان لڑنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ (سوانح احمدی۔ ص:۷۰)

ہندوستان کی یہ بہت بڑی بدقسمتی تھی کہ سید صاحب کو مسلمانانِ پنجاب کی حد درجہ پامالی و زبوں حالی کے باعث مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بالمقابل صف آرا ہونا اور آخر کار معرکۂ بالاکوٹ میں جام شہادت نوش کرنا پڑا۔ ورنہ اصل یہ ہے کہ سید صاحب کا اصل مقصد ہندوستان کے ہندو اور مسلمان کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط و اقتدار سے نجات دلانا تھا۔

انگریز خود اسے محسوس کرتے تھے اور اس تحریک سے بڑے خوف زدہ تھے۔ اسی بنا پر جب سید صاحب کا ارادہ سکھوں سے جنگ کرنے کا ہوا تو انگریزوں نے اطمینان کا سانس لیا اور جنگی ضرورتوں کے مہیا کرنے میں سید صاحب کی مدد کی۔

سید صاحب کا اصل مقصد چوں کہ ہندوستان سے انگریزی تسلط و اقتدار کا قلع قمع کرنا تھا جس کے باعث ہندو اور مسلمان دونوں ہی پریشان تھے اس بنا پر آپ نے اپنے ساتھ ہندوؤں کو بھی شرکت کی دعوت دی اور اس میں صاف صاف انھیں بتادیا کہ آپ کا واحد مقصد ملک سے پردیسی لوگوں کا اقتدار ختم کردینا ہے۔ اس کے بعد حکومت کس کی ہوگی اس سے آپ کو غرض نہیں۔ جو لوگ حکومت کے اہل ہوں گے ہندو ہوں یا مسلمان یا دونوں وہ حکومت کریں گے۔ (ص:۱۹۔ حصہ دوم نقش حیات از مولانا حسین احمد مدنی۔ مکتبہ دینیہ دیوبند ۱۹۹۹ء)

سکھوں کے خلاف سید احمد رائے بریلوی کی تحریک کو انگریز مخالف ثابت کرنے کے لئے دو خطوط عام طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ یہی دونوں خطوط مولانا حسین احمد مدنی نے بھی ص ۲۰۔ اور ص ۲۱ نقش حیات دوم میں پیش کیے ہیں۔

گوالیار کے ہندو راؤ کے نام خط میں ہے:

> بیگانگانِ بعید الوطن ملوکِ زمین و زماں گردیدہ و تاجرانِ متاع فروش بپایۂ سلطنت رسیدہ امارت امرائے کبار و ریاست رؤسائے عالی مقدار برباد نمودہ اند و عزت و اعتبار ایشاں بالکل ربودہ۔ الخ (از کتاب ''مسلمانوں کے زوال سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا؟ (ص ۲۷۴۔ مصنفہ مولانا سید ابوالحسن ندوی)

ریاست گوالیار کے ایک مسلم عہدہ دار غلام حیدر خاں کے نام ایک خط ہے (بحوالہ مجموعہ خطوطِ قلمی ص ۱۴)

اکثر بلادِ ہندوستان بدستِ بیگانگاں افتادہ وایشاں ہر جا بنیادِ ظلم و جور نہادہ۔ الخ

ان دونوں خطوط کو اگر بلا چون و چرا مکمل صحیح مان لیا جائے تو ان کا خلاصہ یہ ہے کہ بیگانگانِ بعید الوطن یعنی انگریز ہمارے ملک پر حاکم ہو گئے ہیں۔ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کے لئے کمر بستہ ہوئے ہیں۔ یہ انگریز جب یہاں سے واپس چلے جائیں گے تو ہمیں ریاست و امارت و حکومت سے کوئی مطلب اور سروکار نہ ہوگا۔ ہندو مسلمان میں سے جو حکومت کے اہل ہوں گے وہ حاکم بنیں گے۔ یہی نتائج خود مولانا حسین احمد مدنی نے بیان کیے ہیں۔

اب ایسی صورت میں اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسی اسلامی تحریک اور کیسا جہاد ہے؟ اور دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر سید احمد رائے بریلوی و شاہ اسمٰعیل دہلوی نے مذہبی فرض کہہ کر انگریزوں کے تعلق سے جو مؤیدانہ اور وفادارانہ بیان دیے ہیں ان کی مذہبی حیثیت کیا ہے؟ اور تیسرا سوال یہ ہے کہ اولین سوانح نگاروں کے بیانات انگریز حامی ہیں اور وفادارِ حکومت انگلینڈ کے ترجمان ہیں۔ ایسی صورت میں مذہب و سیاست کی کوئی بنیاد صحیح و سالم نہیں رہ جاتی اور مجموعۂ تضادات بن کر ہر چیز بے اعتبار ہو جاتی ہے۔

''بہر حال ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک'' اور اس کے ''جہاد'' کا یہ عجیب و غریب نصب العین قابل غور ہے۔

''ہندوؤں سے اختلافِ مذہب کی بنا پر آپ کو پرخاش تو کیا ہوتی آپ کمپنی کے ہاتھوں مظلومیت و پامالی میں ہندو اور مسلمان دونوں کو یکساں شریک جانتے تھے اور جہاد سے آپ کی غرض دونوں ہی کو اجنبی اقتدار کی مصیبت سے نجات دلانا تھا۔

کامیاب ہونے کے بعد ہندوستان میں ملکی حکومت کا نقشہ کیا ہوگا اس کا فیصلہ آپ طالبینِ مناصب ریاست و حکومت پر چھوڑتے ہیں۔ مگر ہندوؤں کو یہ اطمینان ضرور دلاتے ہیں کہ وہ سید صاحب کی کوششوں کو اپنی ریاست کی بنیاد کے مستحکم ہونے کا باعث سمجھیں اور پھر سید صاحب کا ہندو ریاستوں کو مدد اور شرکتِ جنگ کی دعوت دینا اور اپنے توپ خانہ کا افسر راجہ رام راجپوت کو مقرر کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ہندوؤں کو اپنا محکوم نہیں بلکہ شریک حکومت بنانا چاہتے

تھے۔ (ص:۲۲۔ حصہ دوم نقش حیات از مولانا حسین احمد مدنی)

مولانا حسین احمد مدنی لکھتے ہیں:

''شاندار ماضی جلد ۳ ص ۶۸ میں ہے۔

''براہِ دور اندیشی شیخ غلام علی صاحب رئیس اعظم الٰہ آباد کی معرفت گورنر اضلاع شمالی و مغربی کو اس تیاری جہاد کی اطلاع دے دی گئی تھی جس کے جواب میں گورنر نے کہا تھا۔ جب تک انگریزی عملداری میں کسی فتنہ وفساد کا اندیشہ نہ ہو ہم ایسی تیاری سے مانع نہیں۔''

ممکن ہے کہ مذکورہ بالا امور کے علاوہ دوسری سیاسی مصلحتیں بھی ہوں مگر......؟

''بہر حال! انگریزوں نے اس وقت سید صاحب کے اس علانیہ جہاد اور اس کی تیاری پر کوئی رکاوٹ نہیں کی۔ البتہ ۱۸۳۱ء کے بعد سب کچھ کیا گیا۔ (ص:۳۹۔ حصہ دوم نقش حیات)

سید احمد صاحب رائے بریلوی امیر خاں کی فوج میں ملازم تھے۔ اس سلسلے میں تضاد بیانی اور تاریخ گری ملاحظہ فرمائیں۔

چوں کہ اِخفائے حال اور سَترِ احوال منظور تھا، خیال میں یہ آیا کہ اگر اہل دنیا کے لباس سے ملبس ہو کر علم باطنی کی تحصیل اور تکمیل کی جاوے تو یہ ہجوم عوام کا جمعیت اوقات میں خلل انداز نہ ہوگا۔ اس خیال سے ٹونک کی طرف تشریف لے گئے اور نواب امیر خاں کی رفاقت میں بسر کی۔ الخ (ص ۴۹۲۔ آثار الصنادید از سر سید۔ مطبوعہ اردو اکاڈمی دہلی ۲۰۰۰ء)

''۱۸۱۰ء میں ضروریاتِ معاشیہ کی بنا پر نواب امیر خاں والی ٹونک کی فوج میں ملازم ہو گئے۔ (ص:۲۶۔ نقش حیات دوم از مولانا حسین احمد مدنی)

''سید صاحب باقاعدہ مولوی تو نہیں بن سکے لیکن آپ نے روحانی کمالات پوری طرح حاصل کیے۔ اور جب سیاسی حالات کا تقاضہ ہوا کہ ہر باشندۂ ملک انگریزوں کے خلاف جنگ جو سپاہی بن جائے تو آپ کی سپاہیانہ طبیعت کی مناسبت سے شاہ عبدالعزیز صاحب نے آپ کو نواب امیر علی خاں اور جسونت راؤ ہلکر کی فوج میں کام کرنے کے لئے بھیج دیا۔ (ص ۸۶، ۸۷۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی حصہ دوم از مولانا سید محمد میاں)

۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء میں لکھی گئی اپنی کتاب میں سید احمد صاحب رائے بریلوی کے نسبی وارث

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

''اس کا کوئی تحریری ثبوت ابھی تک نہیں ملا ہے کہ حضرت سید صاحب، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی صریح ھدایت اور حکم سے نواب امیر خاں کے لشکر میں تشریف لے گئے۔ لیکن اس کا قرینہ ضرور پایا جاتا ہے کہ یہ اقدام حضرت شاہ صاحب کے ایما یا کم از کم تائید و پسندیدگی پر ہوا۔ (ص ۱۷۳۔ تاریخ دعوت و عزیمت حصہ پنجم از مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی۔ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ۔ طبع پنجم ۱۴۲۵ھ/۲۰۰۴ء)

ایک حیرت انگیز کارگذاری کا انکشاف کرتے ہوئے مرزا حیرت دہلوی لکھتے ہیں:

''۱۲۳۱ھ تک سید احمد صاحب امیر خاں کی ملازمت میں رہے مگر ایک ناموری کا کام آپ نے یہ کیا کہ انگریزوں اور امیر خاں کی صلح کرادی.........

''لارڈ ہیسٹنگ، سید احمد صاحب کی بے نظیر کارگذاری سے بہت خوش تھا۔ دونوں لشکروں کے بیچ ایک خیمہ کھڑا کیا گیا اور اس میں تین آدمیوں کا باہم معاہدہ ہوا۔ امیر خاں، لارڈ ہسٹنگ اور سید احمد صاحب۔

سید احمد صاحب نے امیر خاں کو بڑی مشکل سے شیشے میں اتارا تھا۔ آپ نے اسے یقین دلایا تھا کہ انگریزوں سے مقابلہ کرنا اور لڑنا بھڑنا اگر تمہارے لئے برا نہیں تو تمہاری اولاد کے لئے سمّ قاتل کا اثر رکھتا ہے۔

اس طرح متفرق پرگنے ریاستوں سے بڑی قیل و قال کے بعد انگریزوں سے دلوا کر بپھرے ہوئے اس شیر کو حکمت سے پنجرے میں بند کر دیا۔ (حیات طیبہ از مرزا حیرت دہلوی)

اسی بات کو ایک ہندو مؤرخ پی سی جوشی نے اس طرح لکھا ہے:

''۱۸۲۰ء میں جب سید احمد بریلوی سکھوں کے ساتھ جنگ کے واضح مقصد کی تکمیل کے لئے کلکتہ گئے (کیوں کہ رنجیت سنگھ کی قلمرو میں اسلام پر پابندی عاید کی گئی تھیں) تو انگریز ان کی حوصلہ افزائی اور مدد کرنے کو بے

تاب تھے۔ الخ...... (ص: ۹۵۔ انقلاب ۱۸۵۷ء از پی سی جوشی۔ قومی کونسل نئی دہلی۔ طبع سوم ۱۹۹۸ء)

مولانا سید محمد میاں نے بھی نے اسی طرح کی کوشش کی ہے مگر یہ لکھنے پر بھی وہ مجبور ہیں کہ:

''(۱) شمال مغربی سرحد میں ایک آزاد حکومت قائم کرنے کے بعد جو اعلامیہ شایع کیا گیا اس کا ایک فقرہ یہ ہے۔

نہ با کسے از امراء مسلمین تنازعت داریم و نہ با یکے از رؤساء مومنین مخالفت۔ با کفار مقابلہ داریم نہ با مدعیانِ اسلام۔ صرف با دراز مویاں مقاتلہ۔ نہ با کلمہ گویاں و اسلام جویاں۔ و نہ با سرکار انگریزی مخاصمت داریم۔ و نہ راہِ تنازعت کہ از رعایاے او ہستیم بہ حمایتش از مظالم برایا۔ (سوانخ احمدی۔ ص: ۲۳۶)

ترجمہ: نہ کسی مسلمان حاکم سے ہمارا جھگڑا ہے نہ کسی مسلمان رئیس سے مخالفت۔ نہ غیر مسلموں سے مقابلہ ہے اور نہ مدعیانِ اسلام سے۔ ہماری جنگ صرف لابنے بال والوں سے ہے۔ نہ کلمہ گو اور طالبانِ اسلام سے۔ اور سرکار انگریزی سے بھی ہماری مخالفت نہیں کیوں کہ ہم اس کی رعایا ہیں اور اس کی پناہ و حفاظت میں مظالم سے محفوظ ہیں۔

(۲) منشی محمد جعفر تھانیسری سوانخ احمدی (ص: ۹۱) میں تحریر فرماتے ہیں:

یہ بھی ایک صحیح روایت ہے کہ جب آپ سکھوں سے جہاد کرنے کو تشریف لے جاتے تھے، کسی شخص نے آپ سے پوچھا کہ آپ اتنی دور سکھوں سے جہاد کرنے کو جاتے ہیں، انگریز جو اس ملک کے حاکم ہیں وہ دین اسلام سے کیا منکر نہیں؟ گھر کے گھر میں ان سے جہاد کر کے ملک ہندوستان لے لو۔ یہاں لاکھوں آدمی آپ کا شریک اور مددگار ہو جائے گا۔

سید صاحب نے جواب دیا کہ کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت کرنا نہیں چاہتے۔ سکھوں سے جہاد صرف اس وجہ سے ہے کہ وہ برادرانِ اسلام پر ظلم کرتے ہیں۔ اور اذان وغیرہ فرائض مذہبی ادا کرنے سے مزاحم ہوتے ہیں............ اور سرکار انگریزی گو منکر اسلام ہے مگر مسلمان پر کچھ ظلم و تعدی نہیں کرتی نہ ان کو اداء عبادت سے روکتی ہے۔ (ص: ۲۳۶ و ۲۳۷ حصہ دوم۔

علماے ہند کا شاندار ماضی۔ از مولانا سید محمد میاں۔ کتابستان دہلی)

تواریخ عجیبہ از محمد جعفر تھانیسری کے مطابق ۶ ربیع الاول ۱۲۴۵ھ/ ۵ ستمبر ۱۸۲۹ء بہ اتفاق رائے جملہ علما و رؤساے مذکورہ "اعلام نامۂ شرعی" (نہ با کسے از امرائے مسلمین منازعت داریم۔ الی آخرہ) بہ نام سلطان محمد خاں حاکم پشاور اور اس کی نقول بہ نام ساکنانِ شہر پشاور و اطرافِ پشاور روانہ کی گئیں۔ سردار محمد خاں نے اس کے جواب میں لکھا کہ:

"ہم نے آپ کے مضمون نامہ پر اطلاع پائی۔ آپ نے جو یہ لکھا ہے کہ ہم خدا کے واسطے اس ملک میں کفار سے جہاد کرنے آئے ہیں اور کلمہ گویان سے لڑنے نہیں آئے ہیں یہ سب آپ کی ابلہ فریبی ہے۔ آپ کا عقیدہ فاسد اور نیت کاسد ہے۔ آپ فقیر ہو کر ارادہ امامت اور حکومت کا رکھتے ہیں۔ پس ہم نے بھی خدا کے واسطے کمر باندھ رکھی ہے کہ تم کو قتل کر کے اس سرزمین کو تم سے پاک کریں گے۔"

انگریزوں کو معرکۂ بالاکوٹ کا جو نقد فائدہ حاصل ہوا وہ یہ ہے۔ منشی محمد جعفر تھانیسری لکھتے ہیں:

"اور آخر ۱۸۴۵ء میں معرکۂ بالاکوٹ کے پندرہ سال بعد کل سلطنتِ پنجاب سکھوں کے ہاتھ سے نکل کر ہماری عادل سرکار کے قبضے میں آ گئی۔ (ص: ۳۸۔ سوانح احمدی)

اختتام معرکۂ بالاکوٹ ۱۸۳۱ء کے بارے میں سرسید لکھتے ہیں:

"چوں کہ یہ قوم مذہبی مخالفت میں نہایت سخت ہے اس سبب سے اس قوم نے اخیر میں وہابیوں سے دغا کر کے سکھوں سے تعاون کر لیا اور مولوی محمد اسمٰعیل صاحب اور سید احمد صاحب کو شہید کر دیا۔ (ص: ۴۔ ج ۹۔ مقالات سرسید)

مسعود عالم ندوی لکھتے ہیں:

"کہنا یہ ہے اور صاف صاف کہ جب تک مجاہدین سکھوں سے الجھے رہے۔ کمپنی کی حکومت خاموش اور غیر جانب دار رہی۔ "سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے" پر ترکوں نے نجد میں عمل کیا تھا۔ ان کے استادوں نے اس فارمولے پر یہاں عمل کیا۔ مقصود یہ تھا کہ مجاہدین اور سکھوں کی آویزش میں سرکار عالی کا کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہو رہے گا۔ لیکن جوں ہی پنجاب کا الحاق عمل میں آیا کمپنی اور

سرکار کی نظر میں مجاہدین سے برا کوئی نہ تھا۔ (ص:۱۱۳۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک۔ از مسعود عالم ندوی۔ ادارہ مطبوعات سلیمانی لاہور)

۱۹۵۷ء میں تحریر کردہ اپنی کتاب میں میاں محمد شفیع (کالم نگار روزنامہ نوائے وقت لاہور) ایک جگہ انگریز کے مخبروں اور وطن کے غداروں کے تعارف میں لکھتے ہیں:

”سرفراز خاں کھرل نے انگریزوں پر بری طرح جان چھڑکی۔ پنجاب میں قدم رکھتے ہی ان پر قربان ہوگیا۔ ۱۸۳۱ء میں لفٹننٹ برنس کو لاہور کے سفر میں پرخلوص امداد دی۔ سکھوں کی دوسری لڑائی جو ۹۔۱۸۴۸ء میں ہوئی انگریزوں کی طرف سے لڑا اور ریذیڈینٹ کے اشارے پر سکھوں سے قلعہ چھین لیا۔ (ص ۳۰۴۔ ۱۸۵۷ء پہلی جنگ آزادی۔ از میاں محمد شفیع۔ مطبوعہ پاک وہند)

عبدالرحیم صادق پوری عظیم آبادی لکھتے ہیں کہ گلاب سنگھ سے سرکار انگریزی کے معاہدے کے بعد:

”گورنمنٹ انگریزی نے ایک خط بنام مولوی ولایت علی وعنایت علی علیھما الرحمۃ لکھا کہ گلاب سنگھ نے سرکار انگریزی سے معاہدہ کیا ہے اور بموجب اس معاہدہ کے اب وہ گورنمنٹ کی حمایت میں ہے۔ اب اس سے لڑنا عین گورنمنٹ سے لڑنا ہے۔ لہذا تم کو چاہیے کہ اب اس سے نہ لڑو۔ (ص ۱۰۰۔ تذکرۂ صادقہ از عبدالرحیم عظیم آبادی۔ باراول ھادی المطابع کلکتہ)

”یہ دونوں حضرات مع فوج وتوپ خانہ سامانِ جنگ زیر نگرانی افواج انگریزی لاہور پہنچے۔ ان ایام میں جان لارنس صاحب بہادر چیف کمشنر پنجاب کے تھے۔ صاحب بہادر استقبال کر کے مولوی صاحب کو لاہور لائے۔ اور بہت گفتگو کے بعد یہ بات قرار پائی کہ یہ دونوں حضرات مع ہندوستانی مجاہدین کے اپنے وطن واپس جائیں اور کل اسلحہ مع توپ خانہ گورنمنٹ کے ہاتھ فروخت کر کے اس کی قیمت سے فوج کی بقایا تنخواہ دے کر برخاست کردیں۔ اس وقت صرف پانچ سو مجاہدین آپ کے ساتھ رہ گئے تھے۔ (ص:۱۰۱۔ تذکرۂ صادقہ از عبدالرحیم عظیم آبادی)

لاہور سے پٹنہ آکر مولوی ولایت علی ومولوی عنایت علی چند سال مقیم رہے۔ پھر ستھانہ (سرحد) جاکر درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ انگریزوں نے ان کی نگرانی رکھی کہ یہ منظم ہوکر کچھ کرنے نہ پائیں۔ جب انگریزوں نے سرحد کی طرف پیش قدمی کی تو انھوں نے ہندوستان

سے ان کا سلسلہ بالکل منقطع کرنے کا حکم دیا۔ مگر تعلق باقی رکھنے کے جرم میں ان کی گرفتاری و مقدمہ کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور ۱۸۶۴ء سے ۱۸۷۰ء تک ان کے اور متعلقین کے خلاف بغاوت کے مقدمات چلائے گئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ دیکھیے ص: ۱۲۳۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل از طفیل احمد منگلوری مطبوعہ دہلی ۱۹۴۵ء)

علمائے صادق پور (پٹنہ) کی جمعیت کے بارے میں مولانا سید محمد میاں لکھتے ہیں:

''یہ تنظیم بحیثیت تنظیم تحریک سے الگ رہی بلکہ اگر مولانا عبدالرحیم صاحب مصنف ''الدر المنثور'' کا قول صحیح تسلیم کرلیا جائے تو یہ تنظیم ۱۸۵۷ء کی تحریک کی مخالف رہی۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اس کے کچھ افراد نے انفرادی طور پر اس تحریک میں حصہ لیا۔ (ص: ۱۹۱۔ جلد چہارم، علمائے ہند کا شاندار ماضی از مولانا سید محمد میاں)

''ایقاظ'' کے عنوان سے ''الدر المنثور'' از عبدالرحیم صادق پوری میں مطبوعہ تاریخی ریکارڈ کچھ اور ہے۔ جسے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

''میں اس جگہ ایک فہرست ان حضرات کی لکھتا ہوں کہ جن کے نام نامی اس تذکرہ میں درج ہوئے ہیں اور ان کو ہماری گورنمنٹ عالیہ عادلہ کی طرف سے خطاب عطا ہوا ہے اور وہ کل سات ہیں۔ پانچ ان میں سے وہ ہیں کہ جن کو شمس العلما کا خطاب مرحمت ہوا اور دو وہ ہیں جن کو خان بہادر کا خطاب بخشا گیا۔ وھو ھذہٖ

(۱) شمس العلما جناب حضرت مولانا محمد سعید قدس سرہ ساکن محلّہ مغل پورہ شہر پٹنہ۔

(۲) شمس العلما جناب مولانا محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ ساکن محلّہ صادق پور شہر پٹنہ

(۳) شمس العلما برادر عزیز مولوی عبدالرؤف مرحوم و مغفور ساکن محلّہ صادق پور شہر پٹنہ

(۴) شمس العلما مولوی امجد علی صاحب سلمہ ایم۔ اے۔ پروفیسر میور سینٹرل کالج الہٰ آباد ساکن صادق پور پٹنہ۔

(۵) شمس العلما جناب حضرت مولانا نذیر حسین مدظلہ محدث دہلوی ساکن سورج گڈھ ضلع مونگیر۔

(۶) خان بہادر قاضی سید محمد اجمل مرحوم ساکن قصبہ باڑہ ضلع پٹنہ

(۷) خان بہادر جناب قاضی مولوی فرزند احمد صاحب سلمہ ساکن گیا

چوں کہ یہ خطابات بلاعوض کسی خدمت کے محض براہ شفقت ومہربانی خسروانہ وعنایت شاہانہ ہم مسلمان لوگوں کی عزت افزائی وقدر شناسی کے لئے گورنمنٹ عالیہ نے مرحمت فرمائے ہیں۔ پس ہم سب مسلمانوں کو عموماً اور فرقۂ اہل حدیث کو خصوصاً اور علی الخصوص خاندان صادق پور کو اس کا شکر یہ قولاً وفعلاً ادا کرنا چاہیے۔ کیوں کہ الشکر یزید النعمة ہم مسلمانوں کا فطری اور مذہبی شیوہ ہے کہ محسن کے احسان کا قولاً وفعلاً اعتراف کریں۔ جیسا کہ جناب سرورکائنات فخر موجودات رحمۃ للعالمین کا ارشاد ہے: لایشکر اللّٰہ من لایشکر الناس۔ پھر کون مسلمان ہوگا جو اس پر عمل نہیں کرے گا۔

خاص کر فرقۂ اہل حدیث کے لئے تو کسی اسلامی سلطنت میں بھی یہ آزادی مذہبی (کہ وہ بلامزاحمت اپنے تمام ارکان دینی ادا کریں) نصیب نہیں۔ برٹش حکومت میں انھیں حاصل ہے۔ پس ان کا فرض مذہبی ومنصبی دونوں ہے کہ وہ ایسی عادل اور مہربان گورنمنٹ کی مطیع وفرماں بردار رعایا ہوں اور ہمیشہ دعا گوئے سلطنت رہیں۔ فتدبر و تفکر و لاتکن من الغافلین۔
(ص:۲۔ الدر المنثور از عبدالرحیم عظیم آبادی۔ طبع اول ھادی المطابع کلکتہ)

مذکورہ سارے تاریخی حقائق کے باوجود قارئین کو حیرت ہوگی کہ آخر ماجرا کیا ہے؟ اور یہ تاریخ تھی کچھ اور ہوگئی کچھ اور اس کی آخر وجہ کیا ہے؟ اس کا صرف ایک جواب ہے کہ گروہِ اسمٰعیلیہ کے محققین و مؤرخین نے جان بوجھ کر فرضی تاریخ لکھنے کا مذموم کردار ادا کیا ہے۔ جیسا کہ اس سلسلے کے ایک مشہور مؤرخ غلام رسول مہر بانگِ دہل اعلان کرتے ہوئے اس کا اعتراف واقرار خود ہی اس طرح کر رہے ہیں۔

''میں مجاہدین کی شان وآبرو قائم رکھنے کا قائل ہوں۔ اگرچہ وہ بعض سابقہ بیانات یا توجیہات کے عین مطابق نہ ہو۔'' (ص:۳۳۳۔ افاداتِ مہر۔ از شیر محمد پنی مطبوعہ شیخ غلام علی لاہور)

تاریخ گری کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔ غیر مقلد محدث مولانا نذیر حسین دہلوی نے انقلاب ۱۸۵۷ء کے دوران ایک انگریز میم کو اپنے گھر میں ساڑھے تین ماہ تک پناہ دی تھی اور پھر آگے کیا ہوا یہ غیر مقلد عالم فضل حسین بہاری کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

> ''تین مہینوں کے بعد جب پوری طرح امن قائم ہو چکا تب اس نیم جان میم کو جواب بالکل تندرست وتوانا تھی، انگریزی کیمپ میں پہنچا دیا۔ جس

کے صلے میں مبلغ ایک ہزار تین سو اور مندرجہ ذیل سارٹیفکٹیس ملیں۔الخ
(ص:۱۲۷۔الحیاۃ بعد المماۃ از فضل حسین بہاری۔مکتبہ شعیب کراچی)

اسی واقعہ کے بارے میں غلام رسول مہر اس طرح لکھتے ہیں:

''یہ بھی صحیح ہے کہ میاں نذیر حسین مرحوم نے ایک زخمی انگریز عورت کو جو بے بس پڑی تھی اٹھا کر اپنے یہاں علاج کرایا تھا۔وہ تندرست ہوگئی اور اسے اس کی خواہش کے مطابق دہلی کا محاصرہ کرنے والی انگریز فوج کے کیمپ میں پہنچادیا تھا مگر اس کا صلہ کچھ نہیں لیا تھا اور کہا تھا کہ یہ میرا اسلامی فرض تھا۔(ص:۲۳۶۔افادات مہر مطبوعہ لاہور)

واقعات و حقائق کے اندر تحریف اور آمیزش کا یہ عمل اتنا قوی اور مسلسل تھا کہ دوسرے حضرات بھی اس ''کارخیر'' میں شریک اور اس کی تائید و اتباع میں غلام رسول مہر صاحب سے پیچھے رہنا گوارہ نہ کرسکے۔اور صاف لکھ دیا کہ نصاریٰ کے خلاف جو الفاظ تھے وہاں ان کے اگلوں نے سکھ یا درازمو لکھ دیا ہے۔چنانچہ مولانا سید محمد میاں رقم طراز ہیں:

''اس کتاب کی تسوید کے بعد جناب مہر صاحب کی کتاب ''سید احمد شہید'' سامنے آئی۔اس میں موصوف نے بڑی وضاحت کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ ان عبارتوں میں تحریف کی گئی ہے۔نہ صرف عبارت بلکہ متعدد عبارتیں بھی پیش کی ہیں جن میں تحریف کی گئی ہے۔(حاشیہ ص:۲۴۹۔علماے ہند کا شاندار ماضی۔جلد دوم مطبوعہ دہلی)

حاجی سید عابد حسین بانی مدرسہ دیوبند بے اثر و بے دخل کیے جانے کے اسباب و عوامل کی نشان دہی کرتے ہوئے حاجی صاحب کے خانوادہ کے ایک فرد سید افتخار حسین لکھتے ہیں کہ:

''وہ نفسانیت اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ اس مدرسہ کے ذریعہ اسلام کی حقانیت و صداقت کی نشر و اشاعت کا جو اہم فریضہ انجام دینا چاہتے تھے اس ادارہ کے دوسرے اراکین اس سے متفق نہیں تھے۔

ان حضرات کا نقطۂ نظر بالکل جداگانہ تھا۔وہ اس مدرسہ کو انگریزی حکومت کی رضا و منشا کے مطابق چلانا چاہتے تھے۔کیوں کہ مدرسہ کے صدر مدرس مولوی یعقوب حکومتِ وقت کے

زبردست بہی خواہ تھے۔ مدرسہ کی صدر مدرسی قبول کرنے سے قبل وہ کئی شہروں میں انگریز گورنمنٹ میں ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول کے فرائض انجام دے کر اپنے حسنِ کارکردگی سے انگریزوں کی نظر میں محبوب بن چکے تھے۔ اپنے اس کامیاب تجربہ کی روشنی میں اس مدرسہ کو اسی روش پر لے جانا چاہتے تھے جو انگریز حکومت کے عین منشا کے مطابق تھا اس لئے ان کے خیالات کا حاجی محمد عابد کے خیالات سے متصادم ہونا ناگزیر تھا۔ (ص ۱۶۔ دارالعلوم دیوبند کا بانی کون؟ از سید افتخار حسین دیوبند)

لفٹننٹ گورنر ممالک متحدہ آگرہ واودھ کے معتمد مسٹر پامر نے ۳۱/جنوری ۱۸۷۵ء میں مدرسہ دیوبند کا دورہ کر کے معاینہ رپورٹ میں کہا— ''جو کام بڑے بڑے کالجوں میں ہزاروں روپے کے صرف سے ہوتا ہے وہ یہاں کوڑیوں میں ہو رہا ہے۔ جو کام پرنسپل ہزاروں روپے ماہانہ تنخواہ لے کر کرتا ہے وہ یہاں ایک مولوی چالیس روپے ماہانہ پر کر رہا ہے۔ یہ مدرسہ خلافِ سرکار نہیں بلکہ ممد و معاونِ سرکار ہے۔ (ص: ۲۱۷۔ سوانح محمد احسن نانوتوی مطبوعہ کراچی)

> ''تمام اندرونی وبیرونی صدمات اور حوادث کے بعد جو نہایت ہی اعلیٰ درجہ کی کامیابی وشہرت مدرسہ کو حاصل ہوئی وہ سر جان ڈگس لاٹوش لفٹننٹ گورنر ممالکِ متحدہ آگرہ و اودھ کا بغرضِ خاص معاینہ مدرسہ دیوبند آنا تھا''۔ (ص: ۷۔ روئداد مدرسہ دیوبند ۱۳۲۲ھ)

> ''مدرسہ دیوبند کے کارکنوں اور مدرسوں کی اکثریت— ''ایسے بزرگوں کی تھی جو گورنمنٹ کے قدیم ملازم اور حال پینشنر تھے جن کے بارے میں گورنمنٹ کو شک وشبہ کرنے کی گنجائش ہی نہ تھی۔ (حاشیہ ص: ۲۴۷۔ سوانح قاسمی جلد دوم)

مولانا اشرف علی تھانوی اپنے ایک فتویٰ محررہ ۱۰/صفر ۱۳۴۹ھ/ ۱۹۳۱ء میں لکھتے ہیں:

> ''چوں کہ قدیم سے مذہب اور قانون جملہ مسیحی لوگوں کا یہ ہے کہ کسی کی ملت و مذہب سے پرخاش اور مخالفت نہیں کرتے اور نہ کسی کی مذہبی آزادی میں دست اندازی کرتے ہیں اور اپنی رعایا کو ہر طرح سے امن وامان میں رکھتے ہیں۔ لہذا مسلمانوں کو یہاں ہندوستان میں جو مملوکہ و مقبوضۂ اہلِ

مسیح ہے۔ رہنا اوران کا رعیت بننا درست ہے۔ (ص:۳۲۴۔ اوراق گم گشتہ از رئیس احمد جعفری ندوی مطبوعہ لاہور ۱۹۶۸ء)

مولانا اشرف علی تھانوی کے ایک بھائی مظہر علی تھانوی محکمۂ جاسوسی کے ایک افسر اعلیٰ تھے۔ مولانا محمود حسن دیوبندی کی سیاسی سرگرمیوں کے ذکر میں تین جاسوسوں کے نام اس طرح ہیں:

"یعنی (۱) مسٹر سین (۲) مسٹر تصدق حسین ہاپوڑی (۳) مظہر علی تھانوی۔ یہ تینوں افسر یوپی میں کام کرتے تھے۔ حضرت شیخ الھند اوران کے مشن آزادی کے متعلق ان تینوں نے بہت سرگرمی سے کام کیا تھا۔ مسٹر سین انگریز تھا۔ یوپی سی آئی ڈی کا افسر اعلیٰ تھا مگر مہذب، قانون کا پابند تھا۔ اس میں کسی قدر انسانیت بھی تھی لیکن تصدق حسین اور مظہر علی نہایت ظالم و جابر تھے۔ ان میں انسانیت اور تہذیب نام کو نہیں تھی۔ (حاشیہ/ص ۲۸۸۔ حصہ دوم۔ نقش حیات از مولانا حسین احمد مدنی۔ مکتبہ دینیہ دیوبند ۱۹۹۹ء)

مولانا تھانوی کے بھائی مظہر علی تھانوی سی آئی ڈی کے ایک بڑے عہدہ پر فائز تھے۔ دیکھیے ص ۲۹۷ تا ۲۹۹ مکتوبات شیخ الاسلام جلد دوم۔ اور مولانا حسین احمد مدنی یہ بھی لکھتے ہیں کہ "مولانا مرحوم کے بھائی محکمۂ سی آئی ڈی میں بڑے عہدہ دار تھے۔ ان کا نام مظہر علی ہے۔ انھوں نے جو کچھ کیا ہو مستبعد نہیں۔ (مکتوبات شیخ الاسلام جلد دوم)۔

پروفیسر محمد سرور جامعی لکھتے ہیں: "مولانا (عبیداللہ) سندھی، مولانا اشرف علی تھانوی کے علم وفضل اور ارشاد وسلوک میں انھیں جو بلند مقام حاصل ہے اس کے تو قائل تھے لیکن تحریکِ آزادی ہند کے بارے میں ان کی جو معاندانہ اور انگریزی حکومت کے حق میں جو مؤیدانہ مستقل رَوِش رہی اس سے وہ سخت خفا تھے۔ (ص ۳۸۲۔ افادات وملفوظات مولانا سندھی از پروفیسر محمد سرور جامعی، سندھ ساگر اکیڈمی لاہور)

مزید تفصیل کے لئے دیکھیے قسط وار مضمون بعنوان "مولانا عبیداللہ سندھی کا دارالعلوم دیوبند سے اخراج" از ابوسلمان شاہجہاں پوری۔ ماہنامہ الولی۔ حیدرآباد، سندھ۔ شمارہ نومبر دسمبر ۱۹۹۱ء)

مشہور دیوبندی عالم وسربراہِ جمعیۃ العلماے اسلام صوبہ سندھ مولانا محمد شاہ امروٹی فرزند

مولانا تاج محمود امروٹی اپنی زندگی کے آخری ایام میں جب کہ ستمبر ۱۹۸۷ء میں کامران کلینک میں زیر علاج تھے۔ ان سے کئی صحافی انٹرویو لے رہے تھے جن میں انجم لاشاری بھی تھے۔ انٹرویو کے وقت جمعیۃ العلماے اسلام سندھ کے سکریٹری جنرل قاری شیر افضل، مرکزی آرگنائزیشن سکریٹری مولانا عبدالرزاق عزیز، مولانا جاوید نعمانی وغیرہ اور کئی صحافی موجود تھے۔ اس اہم انٹرویو میں مولانا محمد شاہ امروٹی نے جو انکشاف کیا وہ انجم لاشاری کی زبانی ملاحظہ فرمائیں۔

''ابتدا میں مولانا محمد شاہ امروٹی نے ریشمی رومال کا راز افشا کرنے والے لوگوں کے نام بتانے سے گریز کیا اور صرف اتنا کہا کہ ''وہ ہمارے بزرگ ہی تھے'' مگر صحافیوں کے اصرار پر آخر انھوں نے یہ راز افشا کر ہی دیا اور ان بزرگوں کے نام بھی بتا دیے۔'' ....

''اپنے انٹرویو میں مولانا محمد شاہ امروٹی نے دل گرفتہ ہو کر بتایا کہ انگریزوں کو ریشمی رومال کے اس سفر کی اطلاعات لحظہ بہ لحظہ مل رہی تھیں اور یہ لنکا گھر کے ایک بھیدی نے ڈھائی تھی اور یہ تھے مولانا اشرف علی تھانوی۔

مولانا امروٹی کے بقول مولانا تھانوی کہتے تھے کہ انگریزوں کے خلاف کچھ نہ کیا جائے بلکہ ان کی سرپرستی میں رہ کر مسلمانوں کے لئے فوائد حاصل کیے جائیں۔ وہ چوں کہ دارالعلوم دیوبند کے اکابرین میں سے تھے اس لئے انھیں تحریک خلافت اور جنود ربانیہ کے تمام پروگراموں سے آگاہی رہتی تھی۔ انھوں نے ریشمی رومال کی حقیقت اور انقلابی کارروائیوں کے لئے طے کردہ تاریخ سے اپنے گھر والوں کو آگاہ کر دیا اور ان کے بھائی نے جو انٹلی جنس کے ایک اعلیٰ افسر تھے پورے قصے سے انتظامیہ کو خبردار کر دیا۔

مولانا محمد شاہ امروٹی کو پیری اور ضعف کے سبب مولانا اشرف علی تھانوی کے اس بھائی کا نام یاد نہیں رہا تھا اس لئے ہم نے مولانا ارشاد الحق تھانوی سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا اور مولانا اشرف علی تھانوی کے برادران کے بارے میں معلومات چاہیں۔ جس پر انھوں نے بتایا کہ مولانا کے صرف ایک بھائی تھے جن کا نام مظہر علی تھا اور وہ ہند میں برطانوی سرکار کے ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ یعنی سی آئی ڈی کے افسر اعلیٰ تھے۔ انھوں نے تقسیم ہند سے پہلے ہی ریٹائرڈمنٹ لے لی تھی اور حج پر چلے گئے تھے جہاں سے واپس آنے کے بعد ۱۹۵۰ء میں انتقال کر گئے۔ مولانا

اشرف علی تھانوی اور مظہر علی کی مائیں الگ الگ تھیں۔ مظہر علی کی والدہ کے بطن سے ایک بیٹی تھی جن کی شادی مولانا ظہور الحق تھانوی سے ہوئی اور ان کے بطن سے مولانا ارشاد الحق تھانوی اور مولانا احتشام الحق تھانوی پیدا ہوئے۔ (ماہنامہ شوٹائم کراچی۔ جلد ا۔ شمارہ ۸۔ اپریل ۱۹۸۸ء)

مضمون نگار اگر اپنے الزام کے ثبوت میں کچھ نہ پیش کر سکے اور نہ ان شاء اللہ آیندہ پیش کر سکیں گے تو ان کی یہ بے بسی ہمارے لئے قابلِ رحم یا باعثِ حیرت نہیں ہے اور اس کا علاج سوائے اس کے کچھ اور نہیں ہے کہ وہ جرأت و دیانت داری کے ساتھ اپنا الزام واپس لینے کا تحریری اعلان کریں۔ اور اگر اب بھی وہ اپنے بے بنیاد موقف پر قائم اور مصر ہیں تو انھیں چاہیے کہ:

(۱) امام احمد رضا کی کتب و رسائل سے ایسی عبارتیں پیش کریں جن سے وہ اپنا مدعا ثابت کر سکیں۔

(۲) امام احمد رضا کے مستند اقوال نہیں تو ان کے اعمال اور انگریزوں سے تعلقات و مفاداتِ حاصلہ کا کوئی ایک بھی دستاویزی ثبوت فراہم کریں۔

(۳) امام احمد رضا کے وصال سے پہلے یا ان کے وصال کے بعد ان کے صاحبزادگان حضرت مولانا حامد رضا بریلوی و حضرت مولانا مصطفیٰ رضا بریلوی سے متعلق ایسا کوئی مستند تاریخی حوالہ پیش کریں جس سے وہ اپنے الزام کا کوئی جواز پیدا کر سکیں۔

(۴) پچیس پچاس سال پیشتر کی ایسی کوئی تاریخ جو محض قیاس آرائی پر مبنی ہو اسے پیش کر کے اپنا اور دوسرے کا وقت ضائع نہ کریں۔ خواہ یہ قیاس آرائی خود ان کی ہو یا کسی ہندو کی یا کسی انگریز کی ہو۔

(۵) تقویۃ الایمان و تحذیر الناس و حفظ الایمان و براھین قاطعہ وغیرہ کی عبارتوں پر شرعی گرفت کرنے کی خدمت انجام دے کر امام احمد رضا نے مسلمانانِ ہند کے ایمان و اسلام کا جس طرح تحفظ کیا ہے اور انھیں بہت سی گمراہیوں سے بچایا ہے اسے مضمون نگار اور ان کے ہمنوا اگر انگریز نوازی سے تعبیر کرتے ہیں تو پھر انہیں بزبانِ خود یہ تسلیم ہے کہ مذکورہ متنازعہ کتب و رسائل کے وھابی و دیوبندی مؤلفین انگریز نواز ہیں۔ کیوں

کہ انھوں نے ایسی باتیں اپنی کتابوں میں لکھیں جن سے انگریزوں کا مقصد
پورا ہوا اور مسلمانانِ ہند رفتہ رفتہ مختلف خانوں میں تقسیم ہوتے چلے گئے۔
اس لئے مخالف و معاند حضرات کی جانب سے آئندہ ایسی باتیں ہی زیر بحث
لائی جائیں جنھیں پڑھ کر قارئین کو اپنے عاید کردہ الزام سے کسی حد تک وہ
مطمئن کرسکیں۔

(۶) ہزار دو ہزار، سو دو سو، درجن دو درجن نہیں بلکہ صرف صفحہ دو صفحہ کا مستند مواد کافی ہے۔
جس طرح ہم نے خود انھیں کے علما اور انھیں کی کتب و رسائل کے حوالے پیش کیے ہیں۔ اسی طرح
کتب و رسائلِ امام احمد رضا اور بیانات و مضامین علماے اہل سنت کے حوالے دینے کی زحمت
فرمائی جائے۔ الزام تراشی و قیاس آرائی سے گریز کیا جائے۔

(۷) جب سو سالہ تاریخ میں کبھی ایسا نہ ہو سکا اور سارے مخالفین و معاندینِ امام احمد رضا
اپنے اس مذموم مقصد میں ناکام رہے تو ہمیں یقین ہے کہ مضمون نگار اور ان کے موجودہ ہمنوا
بھی ایسا کچھ نہیں کرسکیں گے اس لئے انھیں صاف صاف یہ اقرار کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں
کہ ہمارے دعویٰ کی کوئی دلیل اور الزام کا کوئی ثبوت نہیں۔ ہم نے بے بنیاد تحریروں اور سنی سنائی
باتوں پر بھروسہ کر کے سخت غلطی کی اور ہم واضح لفظوں میں اپنی اس غلطی پر نادم ہو کر اپنا الزام
واپس لیتے ہیں۔

مخالفین و معاندین کی سہولت کے لئے ایک مثال دے کر انھیں سمجھانے کی میں ضرورت
محسوس کر رہا ہوں کہ اگر کوئی محقق و مؤرخ یہ دعویٰ کرے کہ مدرسہ اسلامی عربی دیوبند (قائم شدہ
۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۶ء) جو بعد میں دارالعلوم دیوبند کے نام سے مشہور ہوا اس کے بانی مولانا محمد قاسم
نانوتوی (متوفی ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء) نہیں بلکہ دیوبند ہی کے ایک بزرگ باشندے حاجی
سید عابد حسین (وصال ۱۳۳۱ھ/ ۱۹۱۳ء) ہیں جو چشتی و قادری سلسلہ کے ایک شیخِ طریقت اور
دیوبند کی مقبول و محبوب شخصیت تھے۔ اس دعویٰ کے لئے اسے ایسی دلیل دینی ہوگی جس کو پڑھتے
ہی ہر قاری یہ سوچنے لگے کہ ہاں یہ باوزن بات ہے اور یہ دعویٰ ایک مضبوط بنیاد پر قائم ہے۔ مثلاً

''مولانا محمد قاسم مدرسہ دیوبند کے اصل بانی نہ تھے۔ لیکن مدرسہ کو ایک شاندار دارالعلوم

بنانے کا خیال آپ کا تھا۔ جن قابلِ عزت بزرگوں نے اس مدرسے کو شروع کیا شاید ان کا منتہائے مقصود ایک مکتب سے زیادہ نہ تھا جو جامع مسجد کی سہ دریوں میں جاری رہ سکتا تھا لیکن مولانا محمد قاسم نے شروع ہی سے اپنا تخیل بلند رکھا اور مدرسہ کی بنیادیں اس قدر وسیع اور بلند رکھیں کہ ان پر دارالعلوم کی عالی شان عمارت تعمیر ہو سکی۔ (ص: ۲۰۰۔ موج کوثر۔ از شیخ محمد اکرام مطبوعہ دہلی)

حاجی سید عابد حسین قادری چشتی دیوبندی کے خانوادہ کے ایک رکن سید افتخار حسین محلّہ ضیاء الحق دیوبند کی ایک تحریر کے اقتباسات یہ ہیں:

> ''وہ فخر اماثل و اماجد سید محمد عابد رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو سحاب کے برسنے تک اور کتاب کے پڑھے جانے تک باقی رکھے۔ اس مدرسہ مقدسہ کی بنیاد قائم کرنے کا (اللہ نے ان پر) الہام کیا۔

پس حضرت ممدوح نے تائید رائے کے لئے ۱۲۸۲ھ میں پکارا۔ خلقت نے اسے نہایت غور سے سنا اور قبول کیا۔ اور جناب والا کی التماس کا اتباع کیا۔ پس یہ مدرسہ آں جناب کی سعیِ مشکور سے علم اور علماء کا ٹھکانہ اور مرجع فضل و فضلاء و پناہِ دین و دین داراں بن گیا۔

(الھدیۃ السنیۃ فی ذکر المدرسۃ الاسلامیہ الدیوبندیۃ۔ مطبوعہ ۱۳۰۷ھ۔ از مولانا ذوالفقار علی دیوبندی والدِ گرامی مولانا محمود حسن دیوبندی)

چندہ کے لئے رومال پھیلانے والے اور سب سے پہلے چندہ دینے والے حاجی سید محمد عابد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ جس زمانے میں مدرسہ قائم ہوا اس زمانے میں مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی میرٹھ کے مطبع مجتبائی میں تصحیح کا کام انجام دیتے تھے جس کا ذکر مولانا یعقوب صاحب نے سوانح عمری مولانا محمد قاسم (مطبوعہ ۱۳۰۷ھ) میں کیا ہے۔ دیوبند میں مولانا محمد قاسم کا قیام ۱۲۹۰ھ سے پہلے ثابت نہیں۔ اس سے پہلے تک مولانا محمد قاسم کا مستقل قیام میرٹھ اور دہلی میں رہا۔ کبھی نانوتہ اور دیوبند بھی آجایا کرتے تھے۔

۱۳۰۶ھ میں شاہ رفیع الدین صاحب کے دیوبند سے ہجرت کر جانے کے بعد مدرسے سے ایک اشتہار شائع ہوا تھا (جو الحمد للہ ہمارے پاس ابھی تک محفوظ ہے) جس پر مندرجہ ذیل بزرگوں کے دستخط موجود ہیں۔ مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا ذوالفقار علی صاحب، مولانا فضل

الرحمٰن صاحب، منشی فضل حق صاحب مہتمم سوم دارالعلوم دیو بند، حکیم مشتاق احمد دیو بندی، حکیم ضیاء الدین صاحب رام پوری۔ اس اشتہار کا ایک ٹکڑا یہ ہے:

''جملہ خیر خواہانِ مدرسہ کو بسبب روانگی مولوی صاحب موصوف کے نہایت تشویش پیش آئی۔ ناچار بجز اس تدبیر کے کوئی چارہ نہ بن پڑا کہ سب مجتمع ہو کر بخدمتِ بابرکت حضرت حاجی عابد صاحب جو بانی مدرسہ و مجوز اول مدرسہ ہذا و حامی و سرپرست و سرآمد اربابِ شوریٰ ہیں، حاضر ہو کر ملتجی ہوئے کہ اب جناب اس کارِ اہتمام کو انجام دیں کہ آخر یہ مدرسہ آپ ہی کا ہے۔''

ابتدائی تیس سالوں کی رودادوں میں بارہا حاجی محمد عابد صاحب کو اصل اصول مدرسہ لکھا گیا۔ ملاحظہ ہو روداد ۱۲۸۶ھ۔ حضرت نانوتوی کو مدیر لکھا گیا اور بعض جگہ مربی اعظم کے الفاظ ہیں لیکن اصل اصول حاجی صاحب کو ہی لکھا گیا۔ ملاحظہ ہو روداد ۹۶۔۱۲۹۵ھ۔ (روزنامہ قومی آواز نئی دہلی۔ شمارہ ۲۲/دسمبر ۱۹۹۷ء)

مولانا محمد یونس فاضل دارالعلوم دیو بند لکھتے ہیں:

''مجھے یاد ہے۔ میں اس وقت دارالعلوم دیو بند میں تعلیم حاصل کرتا تھا۔ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد اور شیخ الادب و الفقہ مولانا اعزاز علی حیات تھے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی کو بانی دارالعلوم کون؟ تحقیق سپرد کی گئی۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنے قلم سے حضرت حاجی عابد کو بانی دارالعلوم تحریر کیا۔ قاری طیب صاحب نے اعتراض کیا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے فرمایا۔ میری تحقیق یہی ہے کہ حضرت حاجی عابد بانی دارالعلوم ہیں۔ اور میں اپنے قلم سے اس کو قلم زد نہیں کروں گا۔ آپ کی مرضی۔ آپ اپنے قلم سے اس کو قلم زد کر دیجیے۔ قاری صاحب نے برہمی کا اظہار فرمایا اور اپنے قلم سے اس کو قلم زد کر دیا۔

حقیقت اپنی جگہ ہے کہ دارالعلوم کے بانی حضرت حاجی عابد ہیں۔ حافظ محمد احمد مہتمم رہے۔ پھر ان کے بیٹے مولانا طیب مہتمم رہے۔ اس وجہ سے ان کے دادا دارالعلوم کے بانی بن گئے۔ (روزنامہ قومی آواز، نئی دہلی، شمارہ ۱۶/دسمبر ۱۹۹۷ء)

''حاجی محمد عابد کی مساعی سے ۱۵رمحرم الحرام ۱۲۸۳ھ/ ۳۰رمئی ۱۸۶۶ء بروز پنج شنبہ اس مدرسہ کی بنیاد پڑی اور اس کا نام ''مدرسہ عربی و فارسی و ریاضی'' رکھا گیا۔ (ص:۱۵۵۔ تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد اول از سید محبوب علی رضوی۔ مطبوعہ دہلی ۱۹۷۷ء)

مولانا عبدالحمید نعمانی قاسمی ناظم نشر و اشاعت جمعیۃ العلمائے ہند لکھتے ہیں:

''دیوبند میں حضرت حاجی صاحب کے سگے پوتے سید شاداب ہمارے ہم درس تھے۔ ان کے پاس بہت سے پرانے کاغذات ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قیام دارالعلوم کے اول محرک و مجوز حضرت حاجی صاحب ہی تھے۔ البتہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی سمیت دوسرے اکابر سے صلاح و مشورہ کیا جاتا رہا۔ (روزنامہ قومی آواز، نئی دہلی۔ ۲رجنوری ۱۹۹۸ء)

مولانا محمود حسن دیوبندی کی تعلیم کے بارے میں مولانا عاشق الٰہی میرٹھی (متوفی ۱۳۶۰ھ/ ۱۹۴۱ء) لکھتے ہیں:

''پھر ۱۲۸۶ھ میں کتب صحاحِ ستہ اور بعض دیگر کتب اپنے فخر زمانہ استاد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سے پڑھیں جو اس وقت میرٹھ میں منشی ممتاز علی کے مطبع کی خدمتِ تصحیح قبول فرمائے ہوئے تھے۔ (ص۱۰،۱۱۔ تذکرۃ الخلیل مطبوعہ میرٹھ)

گذشتہ حوالوں سے دو دو چار کی طرح واضح اور ثابت ہو جاتا ہے کہ:

(۱) مدرسہ اسلامی عربی دیوبند (درچھتہ والی مسجد سنِ قیام ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۶ء) جو بعد میں دارالعلوم دیوبند کے نام سے مشہور ہوا۔ اس مدرسہ کے بانی سلسلۂ قادریہ و چشتیہ کے ایک بزرگ حاجی سید عابد حسین (وصال ۱۳۳۱ھ/ ۱۹۱۳ء) متوطن دیوبند تھے اور ۱۳۲۰ھ تک اس مدرسہ کی روداد و اشتہارات وغیرہ میں انھیں کا نام بانی کی حیثیت سے درج کیا جاتا رہا۔

(۲) مدرسہ صرف دینی تعلیم کے لئے قائم ہوا تھا اور حاجی سید عابد حسین اور ان کے رفقا و معاونین کی کسی تحریر و بیان میں اس کا کوئی ہلکا سا بھی اشارہ نہیں ملتا کہ انگریزوں کے خلاف نظریاتی و عملی مرکز کے طور پر اس کی بنیاد رکھی جا رہی ہے اور اس کے اغراض و مقاصد میں بھی ایسی

کوئی چیز شامل نہیں ہے۔

(۳) ۱۲۹۰ھ میں مولانا محمد قاسم نانوتوی اس مدرسہ میں آئے اور انھوں نے اسے ترقی اور شہرت دی۔ اس طرح قیام مدرسہ کے آٹھ سال کے بعد مولانا نانوتوی اس سے باضابطہ منسلک ہوئے۔ ۱۲۹۷ھ میں مولانا نانوتوی کا انتقال ہوگیا۔

دلیل، ثبوت، سند، حقیقت اس کا نام ہے جن کے آہنی پنجوں میں آتے ہی اختراع وافسانہ، ظن وتخمین، الزام وبہتان اور افواہ وپروپیگنڈہ ایک ایک کر کے دم توڑ دیتے ہیں۔ حقیقی تاریخ نویسی اور فرضی تاریخ نگاری میں زمین آسمان کا فرق دو دو چار کی طرح واضح ہوجاتا ہے۔ تاریخ نویسی اور چیز ہوتی ہے تاریخ گری اور چیز ہوتی ہے۔ جسے باشعور قارئین خوب اچھی طرح سمجھ رہے ہیں۔

مولانا وحیدالدین خاں صدر مرکز اسلامی نئی دہلی یوں تو مسلمانوں کے درمیان ایک آزاد خیال اور انتہا پسند مفکر سمجھے جاتے ہیں لیکن کبھی کبھی بڑے پتے کی اور کام کی باتیں بھی کہتے اور لکھتے رہتے ہیں جس کا ایک نمونہ حسب ذیل تحریر ہے جو بعنوان ''ایک علمی برائی۔ دعویٰ بلا دلیل''—ماہنامہ الرسالہ دہلی۔ شمارہ ماہ جنوری ۲۰۰۷ء میں منظر عام پر آئی ہے۔

''بینک کی اصطلاح میں ڈڈ چیک (DUD Cheque) ایسے چیک کو کہا جاتا ہے جس کے پیچھے بینک کے کھاتے میں ضروری سرمایہ موجود نہ ہو۔ مثلاً آپ کے بینک کے کھاتے میں صرف ایک ہزار روپے موجود ہوں اور آپ پچاس ہزار کا چیک لکھ کر کسی کو دے دیں تو یہ ڈڈ چیک ہوگا۔ کیوں کہ یہ چیک جب بینک میں جائے گا تو بینک یہ کہہ کر ایسے چیک کو رد کر دے گا کہ لکھنے والے کے کھاتے میں بقدر ضرورت سرمایہ موجود نہیں۔

بہت سے لوگ اپنے نقطۂ نظر کی حمایت میں جو دلیل پیش کرتے ہیں وہ ڈڈ چیک کی مانند ہوتی ہے۔ وہ بڑی بڑی باتیں لکھتے اور بولتے ہیں لیکن جب ان سے ان کے قول کی دلیل مانگی گئی تو وہ یا تو چپ ہوگئے یا ایک اور بے دلیل بات اپنی تائید میں پیش کر دی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ لوگوں کے اندر نہ تو علمی ذوق ہے نہ علمی جرأت، وہ بظاہر ڈگری یافتہ یا سند یافتہ ہونے کے باوجود مدلل بات کہنے سے قاصر ہیں اور مزید یہ کہ ان کے اندر اس اعتراف کی جرأت بھی نہیں کہ

وہ کھلے طور پر یہ کہہ سکیں کہ — ہم غلطی پر تھے۔

(ص ۲۔ ماہنامہ الرسالہ نئی دہلی۔ شمارہ جنوری ۲۰۰۷ء)

مضمون نگار اور ان کے ہمنوا حضرات کی تسلی و تشفی اگر اب بھی نہیں ہو سکی ہے تو وہ لکھیں اور شوق سے لکھیں مگر جو کچھ لکھیں وہ مختصر جامع اور مستند ہونا چاہیے۔ نمبر وار ہونا چاہیے تاکہ نمبر وار ان کا جواب دیا جاسکے اور مزید حقائق سامنے آسکیں۔

مشاطہ را بگو کہ بر اسبابِ حسنِ یار
چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسید

ویسے ہمیں یقین اور صد فی صد یقین ہے کہ اس سلسلے میں ان کی زنبیل میں الزام و بہتان اور ان کے اِعادہ و تکرار کے علاوہ نہ پہلے کچھ تھا نہ اس وقت کچھ ہے اور نہ آیندہ کچھ ہوگا۔ ان کی اس عادتِ سخن پروری و جذبۂ عناد و مخاصمت کا ہمارے پاس بھی کوئی علاج و مداوا نہیں سوائے اس دعا کے کہ اللہ تعالیٰ انھیں ھدایت و عقل سلیم عطا فرمائے اور رجوعِ الی الحق کی توفیق سے انھیں نوازے۔ آمین۔ یارب العٰلمین۔ بجاہ حبیبک سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم۔

قصبہ شاملی کی جھڑپ کا اصل واقعہ

شاملی اور تھانہ بھون (سہارن پور) کا اصل واقعہ جسے بہت بڑا معرکہ اور جنگ آزادی کا سنگِ میل وغیرہ وغیرہ کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے اور اسی بنیاد پر علما و قائدین انقلاب ۱۸۵۷ء کی صف اول میں مولانا محمد قاسم نانوتوی و مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرہ کا نام درج کیا جاتا ہے۔ چنانچہ مولانا حسین احمد مدنی لکھتے:

''بہر حال! مسلمان علماء میں سے مولانا احمد اللہ شاہ دلاور جنگ مدراسی اور مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی اور مولوی امام بخش صاحب صہبائی، مفتی صدرالدین صاحب آزردہ صدر الصدور، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد صاحب بدایونی، مولوی عبدالقادر صاحب، مولوی وزیر خاں اکبرآبادی، سید مبارک شاہ رام پوری، مفتی عنایت احمد صاحب کاکوروی، سید اسمٰعیل صاحب منیر شکوہ آبادی، مفتی مظہر کریم صاحب دریابادی، مولانا لیاقت علی صاحب الہ آبادی، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی، حضرت حافظ ضامن صاحب تھانوی، اور ان حضرت کے تلامیذ وغیرہ نے جہادِ حریت ۱۸۵۷ء میں بڑے پیمانے پر حصہ لیا تھا۔

جنرل بخت خاں صاحب، ڈاکٹر وزیر خاں صاحب، مولوی فیض احمد صاحب (بدایونی) مع اپنے ماتحتوں اور فوجیوں کے حالت خطرناک دیکھ کر دہلی سے نکل کر لکھنؤ چلے گئے تھے اور مولوی احمد اللہ شاہ دلاور جنگ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے اور وہاں انگریزی فوج سے خوب مقابلے کیے مگر اپنوں ہی کی غداری سے شکست کھانی پڑی اس لئے جب حالت خطرناک دیکھی تو شاہجہاں پور کو روانہ ہو گئے اور محمدی پور میں اسلامی حکومت قائم کر لی۔ الخ (ص ۶۶، ۶۷۔ حصہ دوم نقشِ حیات)

سوانحِ مولانا رشید احمد گنگوہی (متوفی جمادی الآخرہ ۱۳۲۳ھ/ اگست ۱۹۰۵ء) بنام تذکرۃ الرشید میں معروف دیوبندی عالم مولانا عاشق الٰہی میرٹھی (متولد ۱۲۹۸ھ/ ۱۸۸۱ء۔متوفی ۱۳۶۰ھ/ ۱۹۴۱ء) نے ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء ہی میں قصبہ شاملی کی جھڑپ کا اصل واقعہ لکھ کر شایع کردیا تھا۔مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے اپنے ممدوح امام ربانی کا نام حمد وصلوٰۃ کے بعد بڑی عقیدت کے ساتھ اس طرح لکھا ہے:

''قطب العالم، قدوۃ العلماء، غوث الاعظم، اسوۃ الفقہا، جامع الفضایل و الفواضل العلیہ، مستجمع الصفات والخصایل البھیۃ السنیہ، حامی دین مبین، مجدد زمان، وسیلتنا الی اللہ الصمد الذی لم یلد ولم یولد، شیخ المشائخ، مولانا الحافظ الحاج المولوی رشید احمد صاحب محدث گنگوہی قدس سرہ العزیز''۔
(ص:۲۔ تذکرۃ الرشید حصہ اول از مولانا عاشق الٰہی میرٹھی، مکتبہ خلیلیہ متصل مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور، یوپی)

آگے چل کر مولانا میرٹھی نے جہاں جہاں سرکار لکھا ہے اس سے مراد انگریزی حکومت اور مفسدوں و بندوقچیوں و باغیوں سے مراد انگریز مخالف عوام ہیں۔اور جہاں جہاں حضرت مولانا و امام ربانی لکھا ہے اس سے ان کی مراد مولانا رشید احمد گنگوہی اور اعلیٰ حضرت سے حاجی امداد اللہ مہاجر مکی مراد ہیں۔تذکرۃ الرشید کے دونوں حصوں میں حاجی صاحب کو جابہ جا اعلیٰ حضرت لکھا گیا ہے۔مولانا خلیل احمد انبیٹھوی سہارنپوری نے بھی اس کتاب کے جملہ اوراق قبل طبع پڑھ لیے تھے جیسا کہ حصہ دوم تذکرۃ الرشید کے آخری صفحہ پر اس کی صراحت ہے۔آگے ہم بلاتبصرہ ساری عبارتیں تذکرۃ الرشید سے نقل کررہے ہیں جنھیں پڑھ کر قارئین کو خود ہی سمجھ میں آجائے گا کہ قصبہ شاملی کی جھڑپ کا اصل واقعہ اور اس کی اصل حقیقت کیا ہے؟

قاضی سعادت علی خاں پسر نجابت علی رئیس اعظم زمیندار تھانہ بھون کے دو بیٹے تھے قاضی عنایت علی اور قاضی عبدالرحیم۔ایک بار قاضی عبدالرحیم مع چند احباب ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے دوران سہارن پور کی ایک سرائے میں کسی دوست کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ایک مخالف بنیا نے پنکھی صاحب انگریز سے جو باغیوں کی سرکوبی کے لئے ضلع سہارن پور میں متعین تھا اس سے

جھوٹی شکایت کردی کہ تھانہ بھون کا رئیس کمپنی کا باغی ہوگیا ہے اور اس کا بھائی دہلی کمک بھیجنے کے لئے یہاں ہاتھی خریدنے آیا ہے۔ رئیس کے کچھ دوسرے دشمنوں نے بھی یہ افواہ پھیلا دی جس کی بنیاد پر فوج کی ایک ٹکڑی نے قاضی عبدالرحیم خاں کو مع ہمراہیان گرفتار کر کے جیل بھیج دیا اور بغاوت کے الزام میں انھیں پھانسی دے دی گئی۔ قاضی عنایت علی اپنے بھائی کی پھانسی کی خبر سن کر جوش انتقام میں کچھ فوجیوں کو جو سہارن پور سے کیرانہ کی طرف جارہے تھے ان کا تعاقب کیا اور مال واسباب لوٹ لیا۔ ایک فوجی زخمی ہوکر بھاگا اور گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ اس فساد کی خبر مظفر نگر پہنچی تو حاکم ضلع نے تھانہ بھون پر فوج کشی کا حکم دے دیا جس پر قاضی عنایت علی نے کھلم کھلا علم فساد بلند کیا۔ چنانچہ شاملی کی طرف انگریزی فوج جانے کی جھوٹی خبر کا نقارہ بجا اور جتھہ کا جتھہ تحصیل شاملی پر چڑھ دوڑا۔

گورنمنٹ کے اہل کارانِ تحصیل کے مارے جانے اور خزانہ لوٹے جانے کی خبر پاکر حاکم شاملی پہنچا اور نعشوں اور قصبہ کی بربادی دیکھ کر غم وغصہ میں اس نے کہا کہ تھانہ بھون بھی اسی طرح مسمار کر کے چھوڑوں گا۔ چند ماہ بعد جب دہلی کو انگریزوں نے فتح کیا اور ان کے شاملی آنے کی خبر گرم ہوئی تو لوگ ڈر کے مارے ادھر ادھر فرار ہونے لگے اور قاضی عنایت علی بھی ہمراہیوں کے ساتھ نجیب آباد کی طرف نکل بھاگے اور وہاں سے خدا جانے کہاں گئے اور کیا ہوا کچھ پتہ نہیں چلا۔ جب فوج تھانہ بھون پہنچی تو اس نے قتل وقتال کیا اور مکانات کو آگ لگادی۔ (تلخیص حاشیہ۔ ص ۷۴۔ تذکرۃ الرشید اول)

اسی سلسلے میں مولانا عاشق الٰہی میرٹھی بعنوان ''الزام بغاوت اور اس کی کیفیت'' لکھتے ہیں:

کیا ظلم وستم ہے کہ مسیحائے جہاں کو ۔۔۔ افساد وستم پیشہ و سفّاک کہا جائے
جو گوشہ نشیں خود ہی گرفتار محن ہو ۔۔۔ کس منہ سے اُسے مفسد و چالاک کہا جائے

شروع ۱۲۷۶ھ ہجری نبوی ۱۸۵۹ء وہ سال تھا جس میں حضرت امام ربّانی قدس سرہٗ پر اپنی سرکار سے باغی ہونے کا الزام لگایا گیا اور مفسدوں میں شریک رہنے کی تہمت باندھی گئی۔ اِس وحشتناک قصہ کا بقدرِ ضرورت تذکرہ بھی چوں کہ سوانح کا جزو لازم ہے اس لئے مناسب ہے کہ ابتداء واقعہ سے لے کر انتہا تک اجمالی بیان کردیا جائے۔

رمضان ۱۲۷۳ھ یعنی مئی ۱۸۵۷ء کا وہ طوفان جس کے تصور سے رونگٹا کھڑا ہوتا ہے ہندوستان کیا بلکہ دنیا بھر میں ایسا مشہور و معروف ہے کہ شاید دوسرا نہ ہو۔ سلطنت مغلیہ کا آخری دَور اور لبریز ہو جانے والے پیمانہ شاہی کا پہلا منظر یعنی بدنصیب خانماں برباد بہادر شاہ ظفر پادشاہ دہلی کا وہ بلاخیز سماں تھا جس میں کارتوسوں پر چربی لپیٹے جانے کی جھوٹی افواہ اُڑی اور غدر برپا کرنے کے چُھپے کُھلے مجمعوں میں چرچے شروع ہوئے تھے۔

تباہ ہونے والی رعایا کی نحوستِ تقدیر نے اُن کو جو کچھ بھی سجھایا اُس کا انھوں نے نتیجہ دیکھا اور ان کی نسل دیکھ رہی ہے۔

جن کے سروں پر موت کھیل رہی تھی انھوں نے کمپنی کے امن و عافیت کا زمانہ قدر کی نظر سے نہ دیکھا اور اپنی رحم دل گورنمنٹ کے سامنے بغاوت کا علم قائم کیا۔ فوجیں باغی ہوئیں۔ حاکم کی نافرمان بنیں۔ قتل و قتال کا بند بازار کھولا اور جواں مردی کے غرّہ میں اپنے پیروں پر خود کلہاڑیاں ماریں۔

اس بھیانک منظر میں ہزارہا بندگان خدا ناکردہ گناہ بھی پھانسی چڑھائے گئے جن کے بچے یتیم اور بیبیاں بیوہ ہوئیں۔ اطراف کے شہر شہر اور قصبہ قصبہ میں بدنامی پھیل گئی۔ حاکم کے انتظام کا اُٹھنا تھا کہ باہم رعایا میں برسوں کی دبی ہوئی عداوت نکلنے اور خدا جانے کس کس زمانہ کے انتقام لینے کا وقت آ گیا کہ جدھر دیکھو مار پیٹ اور جس محل پر نظر کرو معرکہ آرائی و جنگ۔

اسی بلاخیز قصہ میں تھانہ بھون کا وہ فساد واقع ہوا جس میں قاضی محبوب علی خاں کی مخبری سے حضرت مولانا پر مقدمہ قائم ہوا جس کی ابتدا یہ تھی کہ تھانہ بھون کے رئیس قاضی عنایت علی خان کا چھوٹا بھائی عبد الرحیم خاں چند ہاتھی خریدنے سہارن پور گیا۔ وہاں اس آفت رسیدہ کا کوئی بنیا قدیمی دشمن کئی دن سے ٹھہرا ہوا تھا جس کو زمین دارانہ تخمصات میں عبد الرحیم کے ساتھ خاص عداوت تھی۔ دشمن نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور فوراً حاکم ضلع سے جا رپورٹ کی۔ فلاں رئیس بھی باغی و مفسد ہے۔ چنانچہ دہلی میں کمک بھیجنے کے لئے ہاتھی خریدنے سہارن پور آیا ہوا ہے۔ زمانہ تھا اندیشناک اور احتیاط کا اُسی وقت دوڑ گئی اور رئیس گرفتار ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پھانسی ہوئی اور تھانہ بھون کے نیک دل سرکاری خیر خواہ زمین دار کو مظلوم بھائی سے دنیا میں ہمیشہ کے لئے جُدا ہو جانے کی خبر ملی۔

اس بدنامی کی حالت میں جس کو قصہ کی اصلیت ظاہر کرنے کے لئے مختصراً الفاظ میں حاشیہ پر درج کر دیا گیا ہے۔ عام باشندگان قصبہ کی یہ حالت ہوئی گویا ان کا مربی پادشاہ سر سے اٹھ گیا اور شرعی و طبعی ضروریات و تخصصات میں بھی کوئی خبر گیراں نہ رہا جس کی رائے پر عمل کریں۔

پس یہ لوگ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ بلا کسی حاکم کی سرپرستی کے گذران دشوار ہے۔ گورنمنٹ نے باغیوں کی بغاوت کے باعث اپنا امن اٹھا لیا اور بذریعۂ اشتہار عام اطلاع دی ہے کہ اپنی اپنی حفاظت ہر شخص کو خود کرنی چاہیے۔ اس لئے آپ چوں کہ ہمارے دینی سردار ہیں اس لئے دنیاوی نظم حکومت کا بھی بار اپنے سر رکھیں اور امیر المومنین بن کر ہمارے باہمی قضیے چکا دیا کریں۔

اس میں شک نہیں کہ اعلیٰ حضرت کو ان کی درخواست کے موافق اِن کے سروں پر ہاتھ رکھنا پڑا اور آپ نے دیوانی و فوجداری کے جملہ مقدمات شرعی فیصلہ کے موافق چند روز تک قاضی شرع بن کر فیصل بھی فرمائے۔ اِسی قصہ نے مفسدوں میں شریک ہونے کی راہ چلائی اور مخبروں کو جھوٹی سچی مخبری کا موقع دیا۔

حضرت امام ربانی قدس سرہ دس برس ہوئے اعلیٰحضرت کو اپنے دین و دنیا کا سردار بنا ہی چکے تھے۔ ہمیشہ آمد و رفت رہتی ہی تھی۔ اب جب کہ ہر چہار طرف بدامنی تھی آپ کے لئے یہاں حاضر رہنے سے زیادہ بہتر کوئی جگہ دنیا میں نہ تھی۔ ادھر اعلیٰحضرت کو حکومت کے فیصلے اور شرعی قضا میں مولوی کی ضرورت تھی کہ حق بات میں اعانت کرتا رہے اس لئے آپ اور مولانا محمد قاسم صاحب معہ دیگر خدام کے یہیں رہ پڑے۔

اِتنی بات یقینی ہے کہ اُس گھبراہٹ کے زمانہ میں جب کہ عام لوگ بند کواڑوں میں گھر میں بیٹھے ہوئے کانپتے تھے حضرت امام ربانی اور نیز دیگر حضرات اپنے کاروبار نہایت ہی اطمینان کے ساتھ انجام دیتے اور جس شغل میں اس سے قبل مصروف تھے بدستور ان کاموں میں مشغول رہتے تھے۔ کبھی ذرہ بھر اضطراب نہیں پیدا ہوا اور کسی وقت حبّہ برابر تشویش لاحق نہیں ہوئی۔ آپ کو اور آپ کے مختصر مجمع کو جب کسی ضرورت کے لئے شاملی، کیرانہ یا مظفر نگر جانے کی ضرورت ہوئی غایت درجہ سکون و وقار کے ساتھ گئے اور طمانیت قلبی کے ساتھ واپس ہوئے۔

ان ایام میں آپ کو ان مفسدوں سے مقابلہ بھی کرنا پڑا جو غول کے غول پھرتے تھے۔ حفاظت جان کے لئے تلوار البتہ پاس رکھتے تھے اور گولیوں کی بوچھار میں بہادر شیر کی طرح نکلے چلے آتے تھے۔

ایک مرتبہ ایسا بھی اتفاق ہوا کہ حضرت امام ربّانی اپنے رفیق جانی مولانا قاسم العلوم اور طبیب روحانی اعلیٰحضرت حاجی صاحب و نیز حافظ ضامن صاحب کے ہمراہ تھے کہ بندوقچیوں سے مقابلہ ہوگیا۔ یہ نبرد آزما دلیر جتھہ اپنی سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے یا ہٹ جانے والا نہ تھا۔ اِس لئے اٹل پہاڑ کی طرح پرا جما کر ڈٹ گیا اور سرکار پر جاں نثاری کے لئے طیار ہوگیا۔ اللہ رے شجاعت و جواں مردی کہ جس ہولناک منظر سے شیر کا پتہ پانی اور بہادر سے بہادر کا زہرہ آب ہوجائے وہاں چند فقیر ہاتھوں میں تلواریں لیے جم غفیر بندوقچیوں کے سامنے ایسے جمے رہے گویا زمین نے پاؤں پکڑ لئے ہیں۔ چنانچہ آپ پر فیریں ہوئیں اور حضرت حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ زیر ناف گولی کھا کر شہید بھی ہوئے۔

حضرت مولانا قاسم العلوم ایک مرتبہ یکا یک سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ جس نے دیکھا جانا کہ کنپٹی میں گولی لگی اور دماغ پار کر کے نکل گئی۔ اعلیٰحضرت نے لپک کر زخم پر ہاتھ رکھا اور فرمایا ''کیا ہوا؟ میاں'' عمامہ اتار کر سر کو جو دیکھا کہیں گولی کا نشان تک نہ ملا اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام کپڑے تر۔

حضرت امام ربانی قدس سرہ کو خادمانہ و مریدانہ تعلق پر اعلیٰحضرت کے ساتھ جو کچھ وابستگی تھی وہ تھی ہی مگر چچا پیر حافظ ضامن صاحب کے ساتھ بھی نہایت ہی درجہ مخلصانہ اُنس تھا اور حافظ صاحب بھی مولانا کے گویا جاں دادہ عاشق تھے۔ اُسی گھمسان میدان میں مولانا کو پاس بُلایا اور فرمایا ''میاں رشید! میرا دم نکلے تو تم میرے پاس ضرور رہنا'' تھوڑی دیر گذری تھی کہ حافظ صاحب دھم سے زمین پر گرے۔ معلوم ہوا کہ گولی کاری لگی اور خون کا فوارہ بہنا شروع ہوا۔ حافظ صاحب کا زخم سے چور ہوکر گرنا تھا اور حضرت امام ربّانی کا لپک کر تڑپتی نعش کا کاندھے پر اٹھانا۔ قریب کی مسجد میں لائے اور حضرت کا سر اپنے زانو پر رکھ کر تلاوت قرآن میں مشغول ہوگئے۔

دیکھنے والوں سے سُنا ہے کہ حضرت مولانا کی اِس مردانگی پر تعجب تھا کہ کس اطمینان کے ساتھ سنسان مسجد میں تنہا بیٹھے ہوئے اپنے نور دیدہ چچا کے سفر آخرت کا سماں دیکھ رہے اور اپنے

عاشق محبوب کی نزع کا آخری وقت نظارہ کررہے تھے۔ آنکھوں میں آنسو تھے اور زبان پر کلام اللہ یہاں تک کہ حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا آپ کے زانو پر سر رکھے رکھے وصال ہوگیا اور حضرت مولانا چچا کی وصیت کو پورا کرنے کے باعث مسرور ہوکر باطمینان اٹھ کھڑے ہوئے۔ بزرگوں سے سُنا ہے کہ حضرت حافظ صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تمامی نسبت حضرت قدس سرہ کی طرف منتقل ہوئی۔ ذلک فضل اللّٰہ یو تیہ من یشاء۔

اللہ اللہ! جس بزرگ نے دس برس ہوئے اعلیٰحضرت سے سفارش کر کے حضرت مولانا کو بیعت کرایا اور اعانت کے ایک کلمۃ الخیر سے ہمدردی ظاہر فرمائی تھی وہ قدسی نفس مرید آخری وقت میں اُس آخری خدمت کو انجام دینے کے لئے قدرت کی طرف سے تجویز ہوا تھا جس میں نہ کوئی پاس تھا نہ قریب، یگانہ تھا نہ بیگانہ۔ آخر جب مفسدوں کی معرکہ آرائی سے پیچھا چھٹا تو حضرت اپنے شہید وفا روحانی مربی کی نعش کو کاندھے پر لے کر اٹھے اور چارپائی پر لٹا کر یکے بعد دیگرے تھانہ بھون میں بسمت مغرب زمین کی گود کے حوالہ کیا۔

جب بغاوت وفساد کا قصہ فرو ہوا اور رحم دل گورنمنٹ کی حکومت نے دوبارہ غلبہ پاکر باغیوں کی سرکوبی شروع کی تو جن بُزدل مفسدوں کو سوائے اس کے اپنی رہائی کا کوئی چارہ نہ تھا کہ جھوٹی سچی تہمتوں اور مخبری کے پیشہ سے سرکاری خیر خواہ اپنے کو ظاہر کریں انھوں نے اپنا رنگ جمایا اور ان گوشہ نشین حضرات پر بھی بغاوت کا الزام لگایا اور یہ مخبری کی کہ تھانہ بھون کے فساد میں اصل الاصول یہی لوگ تھے اور شاملی کی تحصیل پر حملہ کرنے والا یہی گروہ تھا۔ بستی کی دوکانوں کے چھپر انھوں نے تحصیل کے دروازہ پر جمع کیے اور اُس میں آگ لگادی یہاں تک کہ جس وقت آدھے کواڑ جل گئے ابھی آگ بجھنے بھی نہ پائی تھی کہ اِن نڈر ملانوں نے جلتی آگ میں قدم بڑھائے اور بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گھس کر خزانہ سرکار کو لوٹا تھا۔

حالاں کہ یہ کمل پوش، فاقہ کش، نفس کُش حضرات فسادوں سے کوسوں دور تھے۔ ملک و مال کے جھگڑے اگر سر رکھتے تو یہ صورت ہی کیوں ہوتی؟ کوئی کہیں کا ڈپٹی ہوتا اور کوئی کسی جگہ کا صدر الصدور۔ کچہری کے عالی شان کمرے اور عدالت کے وسیع اور اونچی چھتوں والے مکانات کو چھوڑ کر قبر کی تنگی یاد دلانے والے حجروں اور کھرّے بوریہ کے فرش والے تاریک

گوشوں میں کیوں پڑتے؟ مگر:

کون سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

بڑی مصیبت یہ تھی کہ حکّام کے سامنے جانے کا بھی ان کو اتفاق نہیں ہوا۔ ملزم ومجرم بننے کا موقع ہی نہیں ملا کہ برأت اور صفائی کا طریقہ معلوم ہو۔ نہ اتنی دنیاوی عزت کہ جس کا کوئی لحاظ کرے۔ نہ وہ چھل بل اور بے تکان لسّانی کہ جس کا پاس ہو۔ نہ پاس روپیہ کہ بذریعۂ وکالت اس الزام کو اٹھائیں اور خرچ کریں۔ نہ ایسی اندھی جنگ بغاوت کبھی دیکھی یا سنی کہ جس کے نتیجہ سے کچھ بھی واقفیت ہو۔ آخر بادل دردمند اپنے مالک جل وعلیٰ شانہ کی طرف متوجہ ہوئے اور جو حکم غیب سے صادر ہو اُس پر کاربند ہونے کے منتظر و آمادہ۔

حق تعالیٰ کا شکر ہے کہ سچ سچ ہو کر رہا اور جھوٹ جھوٹ۔ اِن حضرات پر اتہام کا بحمد اللہ کوئی ثمرہ مرتب نہ ہوا گو خدائی آزمایش میں جھڑجھڑائے گئے۔ پریشانیاں اٹھائیں، کوفت سہی، روپوش رہے مگر انجام کار حق کو غلبہ ہوا اور ''دودھ کا دودھ پانی کا پانی'' ان پاک نفوس اور ملکوتی صفات بدنوں پر آنچ نہ آئی۔

اعلیٰحضرت قدس سرہ نے اسی قصہ میں اپنے شیدائی بچوں یعنی مولانا قاسم العلوم اور خلف الرشید امام ربانی کو الوداع کہا کہ اب ارض ہند میں یک جائی فلک کو ناگوار ہے۔ اور یہ دونوں لاڈلے بچے اپنے غم خوار روحانی باپ سے بادل ناخواستہ تن بہ تقدیر رخصت ہوئے۔ اعلیٰحضرت نے چند ماہ انبالہ تگری پنجلاسہ وغیرہا مواضع وقصبات میں اپنے آپ کو چھپایا اور آخر براہ سندھ وکراچی عرب کا راستہ لیا۔ ہندوستان کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہا اور جہاز پر سوار ہو کر مکہ معظّمہ پہنچے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دیوبند اور امام ربانی قدس سرہ نے گنگوہ مراجعت فرمائی۔

انہیں ایام روپوشی میں مولانا قاسم العلوم کو املیا گمتھلہ، لاڈوہ، پنجلاسہ اور جمنا پار کئی دفعہ آنے جانے کا اتفاق ہوا اور امام ربانی قدس سرہ نے قیام زیادہ تر گنگوہ یا رامپور میں کیا مگر اپنے

ہادی برحق کی ہندوستان میں آخری زیارت کے شوق سے بے تاب ہوکر انبالہ، تگری اور پنجلاسہ کے سفر کو اٹھے اور مستورالحال مخفی طور پر اس حق کو ادا فرما کر واپس وطن ہوئے۔ اِس زمانہ کی کیفیات ایسی عجیب وغریب گذری ہیں کہ اگر کھلی کرامتوں کے ذکر پر اکتفا کیا جائے تو کئی ورق چاہئیں۔ اس لئے ان کو تفصیلاً چھوڑتا ہوں اور ضروری مضمون پر اکتفا کرتا ہوں۔

تینوں حضرات کے نام چوں کہ وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے اور گرفتار کنندہ کے لئے صلہ تجویز ہو چکا تھا اس لئے لوگ تلاش میں ساعی اور حراست کی تگ ودو میں پھرتے تھے۔

اعلیٰحضرت نے وطن کو خیر باد کہا اور بہ نیتِ حرمین گھر سے باہر نکلے۔ چوں کہ مولانا گنگوہی سے زیادہ تعلق تھا اس لئے آخری ملاقات ہند کے لئے گنگوہ تشریف لائے۔ اس وقت حضرت مولانا قدس سرہ کی عفت مآب صاحبزادی یعنی حافظ محمد یعقوب صاحب کی والدہ ماجدہ کی عمر دو سال کی تھی۔

جس وقت پنجلاسہ ضلع انبالہ میں پہنچے ہیں تو راؤ عبداللہ خان رئیس کے اصطبلِ اسپان کی ویران وتاریک کوٹھری میں مقیم تھے۔ ایک روز اُسی کوٹھری میں وضو فرما کر چاشت کی نماز کے ارادہ سے مصلی بچھایا اور جاں نثار حضار جلسہ سے فرمایا کہ آپ لوگ جائیں میں نفلیں پڑھ لوں۔ راؤ عبداللہ خاں اعلیٰحضرت کے بڑے جاں نثار خادم اور مشہور مرید ہیں۔ گھر کے خوشحال زمین دار اور سرکار کے نزدیک باوجاہت شخص سمجھے جاتے تھے۔ سمجھتے تھے کہ اعلیٰحضرت پر جو الزام لگایا گیا ہے اس کے قائم ہوتے اپنا مکان کھول دینا دنیاوی حیثیت سے کس درجہ خطرناک ہے؟ کیوں کہ باغی کی اعانت بھی سرکاری بغاوت میں شمار ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی غلبۂ حب دین اور فرطِ عشق میں اس درجہ مغلوب تھے کہ نہ مال کی پرواتھی نہ جان کی۔ خدا کی شان کہ جس وقت راؤ عبداللہ خاں اعلیٰحضرت کو تحریمہ باندھے نوافل میں مشغول چھوڑ کر کوٹھری سے باہر نکلے اور پٹ بند کر کے اصطبل کے دروازہ کے قریب پہنچے ہیں تو سامنے سے دَوِش کو آتے دیکھا اور ہکا بکا ششدر کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

خدا جانے مخبر کون اور کس بلا کا پتلہ تھا جس نے عین وقت پر روپوشی کی کوٹھری تک معین کردی تھی۔ چنانچہ دَوِش اصطبل کے پاس پہنچی اور افسر نے مسکرا کر راؤ صاحب سے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کردیں۔ گویا اپنے ناوقت آنے کی وجہ کو چھپایا۔ جہاں دیدہ وتجربہ کار راؤ صاحب دور ہی

سے تاڑ گئے تھے کہ ''ایں گل دیگر شگفت'' مگر نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن۔ اپنی جان یا عزت کے جانے ریاست وزمین داری کے ملیا میٹ ہونے اور ہتکڑیاں پڑ کر جیل خانہ پہنچنے یا پھانسی پر چڑھا کر عالم آخرت کا سفر کرنے کی تو مطلق پروانہ تھی اگر فکر ورنج یا حزن وافسوس تھا تو یہ کہ ہائے غلام کے گھر سے اور آقا گرفتار ہو۔ اور عبداللہ خان کی نظر کے سامنے اُس کا جان سے زیادہ عزیز شیخ پا بہ زنجیر کیا جائے؟ مگر اس کے ساتھ ہی راؤ صاحب ایک جواں مرد و مستقل مزاج نہایت دلیر اور قوی القلب راجپوت تھے۔ تشویش کو دل میں دبایا اور چہرہ یا اعضا پر کوئی اثر اضطراب کا محسوس نہ ہونے دیا۔ مسکرا کر جواب دیا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

دُوِش کا افسر گھوڑے سے اترا اور یہ کہہ کر ''میں نے آپ کے یہاں ایک گھوڑے کی تعریف سنی ہے اس لئے بلا اطلاع یکا یک آنے کا اتفاق ہوا'' اصطبل کی جانب قدم اٹھائے۔ راؤ صاحب ''بہت اچھا'' کہہ کر ساتھ ساتھ ہو لیے اور نہایت ہی اطمینان کے ساتھ گھوڑوں کی سیر کرانی شروع کی۔

افسر بار بار راؤ صاحب کے چہرہ پر نگاہ جماتا اور اس درجہ مطمئن پا کر کبھی مخبر کی دروغ گوئی کا غصہ اور گاہے اپنی ناکامی و تکلیف سفر کا افسوس لاتا تھا یہاں تک کہ گھوڑوں کی دیکھ بھال کرتا ہوا حاکم اُس حجرہ کی طرف بڑھا جس میں اعلٰحضرت کی سکونت کا مخبر نے پورا پتہ دیا تھا اور یہ کہہ کر کہ ''اس کوٹھری میں کیا گھاس بھری جاتی ہے'' اُس کے پٹ کھول دیئے۔

راؤ عبداللہ خاں کی اس وقت جو حالت ہوئی ہوگی وہ انھیں کے دل سے پوچھنا چاہیے۔ سمجھتے تھے کہ تقدیر کے آخری فیصلہ کا وقت آ گیا اور اپنا پیمانہ حیات لبریز ہو کر اُچھلا چاہتا ہے اس لئے راضی برضا ہو کر ''جی ہاں'' کہا اور حکم گرفتاری کے منتظر کھڑے ہو گئے۔

خداوندی حفاظت کا کرشمہ دیکھئے کہ جس وقت کوٹھری کا دروازہ کھلا ہے تخت پر مصلّی ضرور بچھا ہوا تھا۔ لوٹا رکھا ہوا اور نیچے وضو کا پانی البتہ بکھرا ہوا پڑا تھا مگر اعلٰحضرت حاجی صاحب کا پتہ بھی نہ تھا۔ افسر متحیر و حیران اور راؤ عبداللہ خاں دل ہی دل میں شیخ کی عجیب کرامت پر فرحاں و شاداں۔ کچھ عجیب سماں تھا کہ حاکم نہ کچھ دریافت کرتا ہے نہ استفسار۔ کبھی اِدھر دیکھتا ہے کبھی اُدھر۔ آخر مخبر کی دھوکہ دہی سمجھ کر بات کوٹالا اور کہا کہ خانصاحب ''یہ لوٹا کیسا اور پانی کیوں پڑا ہے؟ راؤ صاحب بولے ''جناب اس جگہ ہم مسلمان نماز پڑھتے ہیں

اور وضو میں منہ ہاتھ دھویا کرتے ہیں۔ چنانچہ ابھی آپ کے آنے سے دس منٹ قبل اُسی کی تیاری تھی۔ افسر نے ہنس کر کہا کہ ''آپ لوگوں کی نماز کے لئے تو مسجد ہے یا اصطبل کی کوٹھری؟'' راؤ صاحب نے فوراً جواب دیا کہ ''جناب مسجد فرض نماز کے لئے ہے اور نفل نماز ایسی ہی چھپی جگہ پڑھی جاتی ہے جہاں کسی کو پتہ بھی نہ چلے۔''

لاجواب جواب سُن کر افسر نے پٹ بند کردیئے اور اصطبل کے چاروں طرف غایر نظر دوڑانے کے بعد باہر نکلا اور گھوڑے پر سوار ہوکر یہ کلمات کہہ کر رخصت ہوا ''راؤ صاحب معاف کیجیے آپ کو اس وقت ہماری وجہ سے بہت تکلیف اٹھانی پڑی اور پھر بھی ہمیں کوئی گھوڑا پسند نہ آیا۔''

راؤ عبداللہ خاں صاحب کی نظر سے دَوِش کے سوار جب اوجھل ہولیے تو واپس ہوئے اور کوٹھری کھولی۔ دیکھا کہ اعلیٰحضرت نماز سے سلام پھیر چکے اور مصلّے پر مطمئن بیٹھے ہوئے ہیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ دیوبند میں روپوش تھے۔ ایک روز زنانہ مکان کے کوٹھے پر مردوں میں سے کوئی تھا نہیں۔ زینہ میں آکر فرمایا ''پردہ کرلو میں باہر جاتا ہوں'' عورتوں سے رُک نہ سکے باہر چلے گئے۔

جارہے تھے کہ دَوِش راستہ میں ملی۔ آپ ہی کی گرفتاری میں تھی۔ خدا کی شان ہے کہ ایک شخص نے آپ ہی سے پوچھا کہ ''مولوی محمد قاسم کہاں ہیں؟'' آپ نے ایک قدم آگے بڑھا کر پچھلے پاؤں کی جانب نظر ڈالی اور فرمایا ''ابھی تو یہاں تھا'' یہ فرما کر آپ آگے چلے گئے اور دَوِش نے مکان پر جا کر تلاشی لی۔ آخر ناکام واپس ہوئے۔

ہرچند کہ یہ حضرات حقیقتاً بے گناہ تھے مگر دشمنوں کی یاوہ گوئی نے ان کو باغی ومفسد اور مجرم و سرکاری خطاوار ٹھہرا رکھا تھا۔ اس لئے گرفتاری کی تلاش تھی مگر حق تعالیٰ کی حفاظت برسر تھی اس لئے کوئی آنچ نہ آئی۔

اور جیسا کہ آپ حضرات اپنی مہربان سرکار کے دلی خیرخواہ تھے تازیست خیرخواہ ہی ثابت رہے۔ ہاں چند روز کی تفریق بین الاحباب مقدر تھی وہ اٹھانی تھی سو اٹھائی۔

اور اس ضمن میں کرامات وخوارق عادات، غیبی حفاظت کے سامان اور سچائی ثابت ہونے

کے اسباب ظاہر ہوئے۔ اس قصہ کے بعد مولانا مسجد میں رہتے اور کوئی کسی قسم کا تعرض نہ کرتا تھا۔

حضرت امام ربانی، قطب الارشاد مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہ کو اس سلسلہ میں امتحان کا بُرا مرحلہ طے کرنا تھا اس لئے گرفتار ہوئے اور چھ مہینے حوالات میں بھی رہے۔ آخر جب تحقیقات اور پوری تفتیش و چھان بین سے کالشّمس فی نصف النھار ثابت ہو گیا کہ:

آپ پر جماعت مفسدین کی شرکت کا محض الزام ہی الزام اور بہتان ہی بہتان ہے اس وقت رہا کیے گئے اور آپ بخیر و عافیت وطن مالوف کو واپس آئے۔

گرفتاری و حوالات اور رہائی و براءت

دردِ دل کا ہائے درماں لے چلے	باغِ دیں کا ابرِ نیساں لے چلے
ڈال کر عالم کو چاہِ حزن میں	یوسفِ ثانی کو زنداں لے چلے

اعلیٰحضرت سے رخصت ہو کر امام ربانی گنگوہ واپس ہوئے تو نہایت درجہ محزون و مغموم۔ اس وقت سیکڑوں افواہیں رات دن میں مشہور ہوتیں اور ہزاروں جھوٹی سچی گپ شپ اڑا کرتی تھیں۔ جدھر جایئے یہی تذکرہ کہ آج فلاں رئیس پھانسی دیا گیا اور فلاں شخص قتل کیا گیا اور جہاں دیکھئے یہی ذکر مذکور کہ وہ باغی سمجھا گیا اور اس کو بجرم فساد سولی چڑھایا گیا۔ وہ روپوش ہے اور اس کی تلاش ہے۔ غرض ایسی گھبراہٹ کا گھمسان تھا کہ ہر عورت کو بیوہ ہو جانے کا ہر وقت خطرہ تھا اور ہر بچہ کو قدم قدم پر یتیم بن جانے کا اندیشہ و غم۔

حضرت مولانا کو یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ آپ کا نام بھی مشتبہ اور قابل اخذ مجرموں کی فہرست میں درج ہو چکا ہے اور آپ کی گرفتاری و تلاش میں دِوش آیا چاہتی ہے مگر آپ کوہِ استقلال بنے ہوئے خدا کے حکم پر راضی تھے اور سمجھے ہوئے تھے کہ:

میں جب حقیقت میں سرکار کا فرماں بردار رہا ہوں تو جھوٹے الزام سے میرا بال بھی بیکا نہ ہوگا اور اگر مارا بھی گیا تو سرکار مالک ہے اُسے اختیار ہے جو چاہے کرے۔ (ص:۷۳ تا ص ۸۰۔ حصہ اول تذکرۃ الرشید از مولانا

عاشق الٰہی میرٹھی۔ مکتبہ خلیلیہ متصل مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور)

گرفتاری کے بعد مولانا گنگوہی چھ ماہ تک مظفر نگر جیل میں رکھے گئے پھر رہائی ہوئی۔ یہاں کے حالات کے بارے میں مولانا عاشق الٰہی میرٹھی لکھتے ہیں:

''آپ نے کبھی کوئی کلمہ دبا کر یا زبان کو موڑ کر نہیں کہا۔ کسی وقت جان بچانے کے لئے تقیہ نہیں کیا۔ جو بات کہی سچ کہی۔ جس بات کا جواب دیا خدا کو حاضر و ناظر سمجھ کر بالکل واقع کے مطابق اور حقیقت حال کے موافق۔

کبھی آپ سے سوال ہوا کہ رشید احمد! تم نے مفسدوں کا ساتھ دیا اور فساد کیا؟ آپ جواب دیتے۔ ہمارا کام فساد کا نہیں نہ ہم مفسدوں کے ساتھی۔

کبھی دریافت ہوتا کہ تم نے سرکار کے مقابلے میں ہتھیار اٹھائے؟ آپ اپنی تسبیح کی طرف اشارہ کر کے فرماتے کہ۔ ہمارا ہتھیار تو یہ ہے۔

کبھی حاکم دھمکاتا کہ ہم تم کو پوری سزا دیں گے۔ آپ فرماتے! کیا مضایقہ ہے مگر تحقیق کر کے۔

ایک مرتبہ حاکم نے پوچھا کہ تمہارا پیشہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا! کچھ بھی نہیں مگر زمین داری۔

غرض حاکم نے ہر چند تحقیق کیا اور تجسس و تفتیش میں پوری کوشش صرف کر دی مگر کچھ ثابت نہ ہوا۔ اور ہر بات کا معقول جواب پایا۔ آخر بری کیے گئے اور فیصلہ سنا دیا گیا کہ۔ رشید احمد رہا کیے گئے۔ (ص:۸۵۔ حصہ اول تذکرۃ الرشید۔ از مولانا عاشق الٰہی میرٹھی)

پہلی بار تحریری طور پر اس واقعۂ شاملی اور گرفتاری و رہائی کا رنگ سوانحِ قاسمی از مولانا مناظر احسن گیلانی کے ذریعہ کچھ کا کچھ ہوا جس کا خلاصہ بحوالۂ سوانحِ قاسمی جلد دوم یہ ہے:

''سہارن پور میں ایسا افسوسناک واقعہ پیش آیا جس نے عام مسلمانوں کو مشتعل کر دیا۔ مسٹر سپنکی جو سہارن پور میں کلکٹر تھا، تھانہ بھون کے رئیس

قاضی عنایت علی کے بھائی قاضی عبدالرحیم کسی ضرورت سے ہاتھی خرید نے گئے تو کسی دشمن نے مخبری کی کہ قاضی عبدالرحیم تھانوی دہلی کمک بھیجنے کے لئے ہاتھی خرید نے سہارن پور آیا ہوا ہے۔ اس وقت انگریز بوکھلائے ہوئے تھے۔ اسپنکی نے لوگوں کو خوف زدہ کرنے کے لئے واقعہ کی تحقیق و تفتیش کیے بغیر قاضی عبدالرحیم کو گرفتار کرکے مع ان کے ساتھیوں کے برسرِ عام پھانسی دے دی۔ اسی وحشت ناک خبر سے سہارن پور کے اطراف و جوانب میں ہیجان پھیل گیا۔

تھانہ بھون میں حضرت حاجی صاحب و حضرت حافظ محمد ضامن صاحب و حضرت مولانا فتح محمد صاحب تھانوی و حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی و حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی جامع مجاہدین تھے کہ وعظ و پند و ترغیب سے مجاہدین کو مواضع و دیہات و قصبات سے جمع کرکے میدان میں لائیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ امیر عسکر تھے۔

تھانہ بھون کے قریب ترین مقام قصبہ شاملی کی تحصیل پر جس میں انگریزی فوج متعین تھی، حملہ کردیا گیا۔ حضرت حافظ ضامن صاحب، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی اور حضرت مولانا منیر حسن صاحب نانوتوی نے شاملی کے میدان جنگ میں خوب دادِ شجاعت دی۔ حافظ محمد ضامن صاحب نے عین معرکہ کے دوران جام شہادت نوش کیا۔ اگرچہ تحصیل پر مجاہدین کا قبضہ ہوگیا مگر حضرت حافظ ضامن صاحب کی شہادت کے بعد مجاہدین تھانہ بھون واپس چلے گئے۔ یہ واقعہ ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کا ہے۔ (ص: ۱۰۴ و ۱۰۵۔ سوانح حضرت میانجیو نور محمد جھنجھانوی۔ ناشر مدرسہ اسلامیہ نور محمدیہ، قصبہ جھنجھانہ ضلع مظفر نگر۔ یوپی۔ مرتبہ نسیم احمد علوی جھنجھانوی۔ طبع چہارم ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء۔

اس کتاب کی ۱۹۵۵ء میں ترتیب ہوئی اور طبع اول کے بعد کے ایڈیشن
میں حذف و اضافہ ہوتا رہا)

اس واقعہ شاملی کو ۱۹۵۳ء میں مولانا حسین احمد مدنی صدر جمعیۃ العلماے ہند نے لکھا تو وہ اس طرح منظّم و منصوبہ بند ہو گیا۔

''پھر جہاد کی تیاری شروع ہوگئی اور اعلان کر دیا گیا۔ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو امام مقرر کیا گیا۔ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو سپہ سالارِ افواج قرار دیا گیا۔ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کو قاضی بنایا گیا۔ اور مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی اور حضرت حافظ ضامن صاحب تھانوی کو میمنہ میسرہ (دائیں اور بائیں) کا افسر قرار دیا گیا۔'' (ص:۵۷۔ حصہ دوم۔ نقش حیات۔ مکتبہ دینیہ دیوبند)

مولانا مناظر احسن گیلانی نے یقینی بات جو لکھی وہ یہ ہے:

''اتنی بات بہر حال یقینی ہے اور ان ناقابلِ انکار چشم دید گواہیوں کا کھلا اقتضاء ہے کہ مالیخولیا سے زیادہ اس قسم کی افواہوں کی کوئی قیمت نہیں ہے کہ ہنگامہ کے برپا کرانے میں دوسروں کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر (مولانا نانوتوی) اور آپ کے دینی و علمی رفقاء کے بھی ہاتھ تھے۔ بلکہ واقعہ وہی ہے جو مصنفِ امام (مولانا گنگوہی) نے لکھا ہے کہ —— مولانا فساد سے کوسوں دور تھے۔'' (ص:۱۰۹۔ سوانح قاسمی جلد دوم از مولانا مناظر احسن گیلانی)

۱۹۵۷ء میں جب کہ ہندوستان کے اندر سو سالہ جنگ آزادی (از ۱۸۵۷ء) کا جشن منایا جانے والا تھا اس وقت مولانا سید محمد میاں نے چار جلدوں پر مشتمل ''علماے ہند کا شاندار ماضی'' لکھا تو اس کی چوتھی جلد میں قصبہ شاملی و تھانہ بھون کے واقعہ کو اتنا زبردست تاریخی معرکہ بنا دیا گیا اور پھر بعد کی کتب و رسائل اور مقالات و مضامین میں اس کے اندر اتنی رنگ آمیزی و مبالغہ آرائی ہوئی کہ سب نے مل جل کر اسے ''پانی پت'' کی فیصلہ کن جنگ بنا دی۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ بر تقدیر صحتِ واقعہ بھی مذکورہ علماء کا جنگی کردار اور ان کی جھڑپ محض ایک محدود اور مقامی نوعیت کی ہے۔ اس کی وہ حیثیت ہر گز نہیں جو بڑے فخر و مباہات کے ساتھ بیان کی جاتی ہے۔ ایسے ہی موقع

کے لئے کسی شاعر نے کہا ہے کہ:

ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے اسے
بڑھا دیا ہے فقط زیب داستاں کے لئے

مولانا سید محمد میاں لکھتے ہیں کہ — ''شاملی کی طرف اقدام کا ایک دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ مہار سنگھ رئیس شاملی نے جو علم آزادی بلند کیا تھا اس کو کمک کی شدید ضرورت تھی۔''

اور پھر حاشیہ میں یہ ایک تاریخی حوالہ نقل کرتے ہیں جس سے سارا واقعہ اور اصل حقیقت سمجھ کر نتیجہ نکالنا اور فیصلہ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

''انگریز مصنف ''میلی سن'' اپنی تاریخ کی جلد ششم ص: ۱۲۴ پر تحریر کرتا ہے:

شاملی میں ایک ہندو زمین دار مہار سنگھ نے ہنگامہ برپا کیا تھا اور خط و کتابت کر کے دربارِ دہلی سے تعلقات قایم کر لیے تھے۔ انگریز اس کو دبا نہ سکتے تھے۔ البتہ شاملی کو کھلم کھلا بغاوت سے محفوظ رکھا۔ شاملی جو آج کل ضلع مظفر نگر کی ایک سب ڈویژن (تحصیل) کا ہیڈ کوارٹر ہے اس زمانہ میں سہارن پور سے متعلق تھا۔ حاکم سہارن پور اسپنکی (Spankee) صاحب نے اس کی پوزیشن مضبوط رکھنے کے لئے گورکھا فوج کا ایک دستہ بھیج دیا۔ ایڈورڈز (اس مقام کے فوجی کمانڈر) نے گورکھوں کی مدد سے شاملی میں مکمل قبضہ کر لیا۔ ایک مسلمان وفادار ابراھیم خاں کے ماتحت تھوڑی سی فوج شاملی چھوڑی اور ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو خود آگے روانہ ہو گیا۔

قاضی عنایت علی اور ان کے ساتھیوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر شاملی پر حملہ بول دیا۔ تقریباً ایک سو تیرہ فوجیوں کے نقصان کے بعد ابراہیم خاں ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔

ایڈورڈز واپس ہوا تو شاملی کی حالت دیکھ کر جہاں ایک سو تیرہ فوجی کام آ چکے تھے بہت غصہ میں آیا مگر اس وقت مظفر نگر کی حالت بہت خراب تھی۔ وہاں چلا گیا۔ پھر کپتان اسمتھ اور لفٹننٹ کیول روس کی زیرِ کمان سکھوں اور گورکھوں کی فوج تھانہ بھون بھیجی۔ مجاہدین نے اسے بھگایا۔ دوبارہ کرنل ڈنلاپ کی سرکردگی میں فوج بھیجی گئی جس نے پہلے تھانہ بھون پھر شاملی پر قبضہ کر کے ان کو تباہ و برباد کیا۔ (۱۸۵۷ء کے مجاہد ۱۶۷)۔ (ص: ۲۷۵۔ جلد چہارم۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی از مولانا سید محمد میاں۔ مطبوعہ کتابستان دہلی ۶)

ردِ بدعات ومنکرات

اللہ رب العزت قرآن حکیم میں ارشاد فرماتا ہے:

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا۔ (سورۂ مائدہ)

آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کردی اور تمہارے لئے اسلام دین کو پسند کیا۔

حجۃ الوداع کے مبارک موقعہ پر پیغمبر اسلام حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو رب کائنات نے اس اِتمام نعمت اور تکمیل دین اسلام کی بشارت عظمیٰ سے سرفراز فرمایا اور صحابہؓ کرام نے بشارتِ نعمت کے یادگار تاریخی موقعہ ومقام کو اپنے نہاں خانۂ قلب میں محفوظ کرلیا۔

امیر المؤمنین فاروق اعظم عمر بن خطاب کی خدمت میں ایک بار ایک یہودی حاضر ہو کر کہنے لگا کہ اے امیر المومنین! آپ کے قرآن میں ایک آیت ایسی ہے کہ اگر وہ ہم یہودیوں پر نازل ہوتی تو اس کے یومِ نزول کو ہم اپنا یوم عید بنا لیتے۔ آپ نے پوچھا وہ کون سی آیت ہے؟ اس نے کہا وہ آیت الیوم اکملت لکم دینکم ہے۔ عمر فاروق نے کہا۔ مجھے وہ دن اور مقام اچھی طرح یاد ہے جہاں اس آیت کا نزول ہوا تھا۔ وہ مقام عرفات اور دن جمعہ ہے۔ (بخاری ومسلم)

سید المفسرین عبداللہ بن عباس سے بھی ایک یہودی نے ایسا ہی کہا تو آپ نے فرمایا۔ جس دن یہ آیت نازل ہوئی اس دن ہمارے لئے دو عیدیں تھیں۔ ایک جمعہ اور دوسرے عرفہ۔ (ترمذی وخازن)

یہ دین اسلام کامل ومکمل شکل میں آج تک موجود ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گا۔ اس کا بدل ڈھونڈھنے یا اس کے اندر کسی ترمیم و اصلاح، کسی حذف و اضافہ اور کسی پیوند کاری و جدید کاری کی نہ پہلے کوئی گنجائش تھی نہ ہی آج کسی قسم کی گنجائش ہے۔ صاف وصریح الفاظ میں ایسے کسی

خیال وفکر اور کسی ضرورت و کوشش کو قرآن حکیم کے اندر اس طرح مسترد کیا جا چکا ہے۔

و من یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منه۔ (سورہ آل عمران)

جس نے اسلام کے سوا کوئی دین چاہا اس کا کچھ قبول نہ ہوگا۔

یہ چاہنے والا اسلام چھوڑ کر کوئی دوسرا دین چاہے یا اسلام ہی کے اندر کسی طرح کی ترمیم و الحاق و قطع و برید کرے ہر حال میں اس کی یہ خواہش و عمل معیوب و مذموم و مبغوض و مردود ہے۔ اسلامی معتقدات و مبادی کے اندر کسی طرح کی آمیزش کے خلاف احادیث کریمہ میں سخت وشدید وعیدیں آئی ہیں۔ ایسے لوگ عنایت و رحمتِ الٰہی سے محروم ہوکر بد دین و بد مذہب و گمراہ ہو جاتے ہیں۔ سنت نبوی کا نور ان کے سینہ سے نکل جاتا ہے۔ ان سے کسی طرح کا قلبی تعلق دیگر مسلمانوں کے لئے زہر قاتل ہے۔ اور ان کی تعظیم و تکریم اسلام کی بے حرمتی کا سبب ہے۔

شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات و ہدایات اور اس کے اصول وضوابط مقرر و متعین ہیں۔ اس شریعت اور اس کے جملہ احکام و مسائل پر عمل اور ان کی پیروی واتباع و تقلید ہر مسلمان کے اوپر لازم ہے۔ اور اس سے ذرا بھی انحراف و کج روی باعثِ ضلالت و ہلاکت ہے۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں صحابہ و تابعین و مفسرین و محدثین و ائمہ مجتہدین و علمائے متقدمین کے ارشادات و فرمودات کا ذخیرہ، ان کا مذہب و مسلک اور ان کا طرز فکر و عمل ہر دور میں رہبری و رہنمائی کا روشن مینار ثابت ہوا ہے اور آج بھی مسلمانانِ عالم اسی صراط مستقیم پہ گامزن ہیں۔ جس شخص اور جس گروہ نے بھی التزام شریعت کا قلادہ اپنی گردن سے اتار کر راہِ سواد اعظم سے علیحدگی اختیار کی وہ یقیناً اپنا سرمایۂ شریعت لٹا بیٹھا اور خسرانِ مبین کا شکار ہوا۔

عبادات و معاملات کی بے شمار تفصیلات قرآن و حدیث کی روشنی میں مدون و مرتب ہو چکی ہیں۔ انسانی زندگی کے نوع بہ نوع تغیرات میں صحیح رہنمائی کے لئے فقہ اسلامی کے قواعد وضوابط ہر دور کے لئے کافی ہیں۔ اخلاقی، معاشرتی، تجارتی، سیاسی سبھی مسائل کو ان کے دائرہ میں حل کیا جاتا ہے اور حل کیا جاتا رہے گا۔

اس تغیر پذیر زندگی کا ہر گوشہ دائرۂ شریعت ہی کے اندر رہ کر فلاح و سعادت سے ہم کنار ہوسکتا ہے۔ احوال و وقائع، حوادث و ظروف، ایجادات و اختراعات اور ہر نئی بات کو شریعت اسلامی کے معیار و مقیاس کے سامنے رکھ کر پرکھا جاتا ہے۔ اگر وہ صحیح ہے تو صحیح ہے اور غلط ہے تو

غلط ہے۔ جائز ہے تو جائز ہے اور نا جائز ہے تو نا جائز ہے۔ اس کے اندر ثواب ہے تو ثواب ہے اور عذاب ہے تو عذاب ہے۔ اصول شریعت، مزاج شریعت اور مفاد شریعت کے مطابق ہے تو وہ مقبول ورنہ مردود ہے۔ کوئی بھی نئی بات اسی وقت قابل قبول ہے جب وہ شریعت، روحِ شریعت اور علوم شریعت سے ہم آہنگ اور اجتماعی مسلم مفادات کے لئے مفید ہے ورنہ مخذول و مطرود ہے۔ ردو قبول کا معیار جاننے کے لئے یہ دو احادیث کریمہ ہمارے لئے بہترین ہادی و رہنما ہیں۔

فعليكم بسنتي و سنةِ الخلفاء الراشدين المهديين۔(ترمذی)

میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ اصحاب کی سنت کی پیروی تمہارے لئے لازم وضروری ہے۔

فان خير الحديث كتاب الله و خير الهدى هدى محمد و شرالامور محدثاتها و كل بدعة ضلالة۔ (صحیح مسلم)

سب سے بہتر کلام کتاب اللہ اور سب سے بہتر راہ جادۂ محمدی ہے۔ اور بدتر چیز وہ ہے جو نئی ہو اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

امام بدرالدین محمود بن احمد العینی (وصال ۸۵۵ھ) محدثات کی تشریح کرتے ہوئے عمدۃ القاری شرح بخاری میں فرماتے ہیں:

محدثاتها جمع محدثة و المراد ما احدث و ليس له اصل في الشرع۔ و سمّي في عرفِ الشرع بدعة۔ و ماكان له اصل يدل عليه الشرع فليس بدعة۔

محدثات محدثۃ کی جمع ہے۔ جس سے مراد ہر وہ چیز ہے جو نئی ہو اور شریعت میں اس کی اصل نہ ہو۔ اسے عرفِ شریعت میں بدعت کہا جاتا ہے۔ اور جس نئی چیز کے لئے شریعت میں کوئی اصل موجود ہو وہ بدعت نہیں ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی (وصال ۹۱۱ھ) كل بدعة ضلالة کے تحت سنن نسائی جلد دوم کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

هذا عام مخصوص، المراد به المحدثات التي ليس في الشريعة ما يشهدلها بالصحة فهي المراد بالبدعة۔

كل بدعة ضلالة یہ عام مخصوص ہے۔ اس سے مراد ہر وہ نئی چیز ہے جس کی صحت شریعت سے ثابت نہ ہو۔ یہاں بدعت سے یہی مراد ہے۔

اور صاحب نیل الاوطار محمد بن علی شوکانی اپنے رسالہ القول المفید فی ادلۃ الاجتھاد والتقلید میں ذکر کرتے ہیں۔

و قال الشافعی فی تفسیر البدعة المذكورة فی الحديث الثابت فی الصحيح من قوله صلی الله عليه وسلم خير الحديث كتاب اللّٰه الىٰ آخره۔ ان المحدثات من الامور ضربان۔

احدهما: ما احدث يخالف كتاباً او سنةً او اثراً او اجماعاً فهذه البدعة الضلالة۔

والثانية: ما احدث من الخير لاخلاف فيه لواحد من هذه الامة۔ و هذه محدثة غير مذمومة۔

امام محمد بن ادریس شافعی حدیث مذکور کی شرح میں فرماتے ہیں۔ نئی چیزوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو کتاب یا سنت یا اثر یا اجماع کے خلاف ہو تو اسے بدعتِ ضلالت کہا جاتا ہے۔ اور دوسری قسم وہ ہے جو خیر کے لئے ایجاد کی گئی ہو۔ ایسی بدعت مذموم نہیں ہے اور اس بارے میں امت کے درمیان کسی طرح کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

حضرت عمر فاروق کے قول نعمت البدعة هذه کی شرح کرتے ہوئے علامہ ابن حجر عسقلانی (وصال ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں:

اصل بدعت یہ ہے کہ مثال سابق کے بغیر کوئی چیز ایجاد کی جائے اور شریعت میں سنت کے بالمقابل بدعت کا اطلاق ہوتا ہے جو مذموم و ناپسندیدہ ہوتی ہے۔ اور تحقیق یہ ہے کہ اگر بدعت شریعت کے کسی امر مستحسن کے تحت داخل ہے تو حسنہ ہے اور اگر شریعت کے خلاف کسی امر مذموم کے تحت ہے تو قبیحہ ہے۔ ورنہ مباح کے قبیل سے ہے۔ (فتح الباری شرح صحیح بخاری جلد چہارم)

ابن رجب حنبلی دمشقی (وصال ۷۹۵ھ) فرماتے ہیں:

بدعت سے مراد ایسی بدعت ہے جس کی شریعت میں کوئی اصل و دلیل نہ ہو اور جس کی دلیل شریعت سے ہو اسے شریعت میں بدعت نہیں کہا جاتا اگر چہ لغت میں بدعت ہو۔ (جامع العلوم والحکم لابن رجب الحنبلی)

امام عز الدین بن عبد السلام دمشقی (وصال ۶۶۰ھ) فرماتے ہیں:

طریقہ یہ ہے کہ بدعت شریعت کے قوانین پر پیش کی جائے۔ اب اگر وہ قواعدِ ایجاب میں داخل ہو تو واجب ہے یا قواعد تحریم میں داخل ہو تو حرام یا استحباب میں ہو تو مستحب ہے یا مکروہ میں ہو تو مکروہ ہے یا مباح میں ہو تو مباح ہے۔

نیز فرماتے ہیں:— ایسی ایجاد جس کی شریعت میں کوئی اصل نہ ہو تو اسے شریعت کے عرف میں بدعت سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور جس کی کوئی اصل ہو جس پر شریعت دلالت کر رہی ہو تو وہ بدعت نہیں ہے۔ (قواعد الاحکام فی مصالح الانام جلد دوم از عز الدین بن عبد السلام)

مذکورہ حضرات اور دیگر اسلاف نے اس امتیاز کو بدعتِ حسنہ و بدعت سیئہ سے تعبیر کیا ہے۔ جن میں ان کے علاوہ امام نووی شافعی، امام محمد غزالی، شیخ عبد الحق محدث دہلوی، محمد بن عبد الباقی زرقانی، علامہ ابن عابدین شامی جیسے اکابر امت شامل ہیں۔

رفض و اعتزال، خروج و تشیع، تفلسف و تو ھب وغیرہ کے ذریعہ اعتقادی و عملی دونوں طرح کی بدعتوں کا رواج ہوا جن کی علمائے عصر نے اپنے اپنے انداز سے بیخ کنی کی۔ مثلاً ہندوستان کے اندر عہد اکبری و جہاں گیری میں کئی سنگین اعتقادی و عملی بدعتوں نے جنم لیا اور مسلم معاشرہ ان کے فتنہ میں مبتلا ہوا تو شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے درسِ حب نبوی و نشر علم حدیث اور مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی نے اپنے مکتوبات کے ذریعہ ان کی سرکوبی کی۔ اور امت مسلمہ کی صحیح و بروقت رہنمائی کر کے انہیں منجدھار سے باہر نکالا۔

قرآن حکیم پر عہد رسالت و عہد صحابہ میں اعراب (زیر، زبر، پیش) اور نقطہ نہیں تھا۔ جو بعد میں لگایا گیا۔ اصول تفسیر، اصول حدیث، اصول فقہ کی بعد کے ادوار میں تدوین ہوئی۔ عربی قواعد یعنی نحو و صرف کا عہد رسالت میں کوئی وجود نہیں تھا۔ یہ سب چیزیں نئی ہونے کے باوجود جائز اور مسلمانوں میں مقبول اور رائج ہوئیں۔ کیوں کہ ان کی وضع و تشکیل سنت و شریعت سے کسی طرح

متصادم نہیں۔ ہاں خلاف سنت وشریعت کوئی چیز ان میں شامل ہو تو وہ یقیناً قبیح وشنیع ہے۔ اور اس سے دور رہنا مسلمانوں کے لئے لازم ہے۔

امام اہل سنت مولانا احمد رضا حنفی قادری برکاتی بریلوی نے بھی اپنے اسلافِ کرام کی طرح ردِ بدعات ومنکرات میں سعیِ بلیغ فرمائی کیوں کہ آپ ایک عاشق رسول وفقیہ اسلام اور عالم متبحر تھے۔ سنت وشریعت کے متبع تھے۔ اسرار و رموزِ دین سے واقف تھے۔ بدعات و منکرات کے خلاف شمشیر برہنہ تھے۔ قلم کی سطوت وصولت سے ان کے تار و پود بکھیرنے میں آپ نے نمایاں کردار ادا کیا۔

ہاں! آپ کے یہاں افراط وتفریط نہیں بلکہ اعتدال وتوازن ہے۔ یہ افراط نہیں کہ بدعت کو شرک، گناہ کو کفر اور مکروہ تنزیہی کو حرام لکھ دیں۔ نہ یہ تفریط ہے کہ مکروہ کو مستحب، منکر کو معروف اور بدعت کو سنت لکھ دیں۔ تحقیق وتفحص کے بعد جو چیز جیسی تھی اسے وہی بتایا۔ حق و باطل کے امتیاز کے ساتھ ان کی صحیح تشخیص وتعیین کی۔ اپنے کسی فتویٰ اور کسی مسئلہ کے اظہار میں عجلت اور افراط و تفریط کے کبھی شکار نہیں ہوئے۔

فتاویٰ رضویہ اور آپ کی دیگر تحریروں کو سامنے رکھ کر آج (۲۰۰۷ء) سے تقریباً چھبیس سال پہلے میں نے ''امام احمد رضا اور ردِ بدعات ومنکرات'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی تھی جس کے متعدد اڈیشن ہند و پاک سے نکل چکے ہیں۔ اس کتاب نے بے شمار لوگوں کی بدگمانیاں وغلط فہمیاں دور کی ہیں۔ ان کی آنکھیں کھول کر انہیں حقائق کے اجالے میں لا کھڑا کر دیا ہے۔ جنھیں تفصیل درکار ہو وہ اس کا مطالعہ کریں۔ اس مختصر مضمون میں صرف چند اشارے درج کر کے انہیں قارئین کرام تک پہنچا رہا ہوں۔

اعتقادی بدعات کے خلاف امام احمد رضا کے بہت سے فتاویٰ مطبوع وموجود ہیں۔ یہاں صرف دو اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں۔

ایک شخص کہتا ہے کہ شریعت صرف چند احکام کا نام ہے۔ ایک دوسرا شخص کہتا ہے کہ نماز میں قرآن دل سے پڑھنا کافی ہے زبان سے پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ ان دونوں اعتقادی بدعات کا جواب بالترتیب ملاحظہ فرمائیں۔ آنے والے سبھی حوالے امام احمد رضا کی کتابوں کے ہیں۔

(۱) عمرو کا قول کہ شریعت صرف چند احکام فرض و واجب وحلال وحرام کا نام ہے محض

اندھاپن ہے۔شریعت تمام احکام جسم و جان و روح وقلب و جملہ علوم الٰہیہ ومعارف نامتناہیہ کو جامع ہے۔جن میں سے ایک ٹکڑا کا نام طریقت و معرفت ہے۔ ولہذا باجماع قطعی جملہ اولیاے کرام تمام حقائق کوشریعت پر عرض (پیش) کرنا فرض ہے۔اگر شریعت کے مطابق ہوں حق ومقبول ہیں۔ ورنہ مردود ومخذول۔تو یقیناً قطعاً شریعت ہی اصل کار ہے۔شریعت ہی مناط و مدار ہے۔شریعت ہی محک و معیار ہے۔شریعت راہ کو کہتے ہیں۔اور شریعت محمد یہ علی صاحبھا افضل الصلوٰۃ التحیۃ کا ترجمہ محمد رسول اللہ ﷺ کی راہ۔ یہ قطعاً عام و مطلق ہے نہ کہ صرف چند احکام جسمانی سے خاص۔ یہی وہ راہ ہے کہ پانچوں وقت بلکہ ہر نماز بلکہ ہر رکعت میں اس کا مانگنا اس پر ثبات واستقامت کی دعا کرنا ہر مسلمان پر واجب فرمایا ہے کہ اھدنا الصراط المسقیم ہم کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ چلا۔ان کی شریعت پر ثابت قدم رکھ۔الخ۔(ص۲، مقال عرفا،مطبوعہ میرٹھ)

(۲) زید نے شریعت پر افترا کیا۔صوفیہ کرام پر افترا کیا۔اپنی نمازیں سب برباد کیں۔اس کی ایک نماز بھی نہیں ہوئی نہ اس کے پیچھے دوسروں کی ہوئی۔اس پر فرض ہے کہ جتنی نمازیں ایسی پڑھی ہوں سب کی قضا کرے اور جتنی نمازیں اوروں نے پڑھی ہیں ان پر فرض ہے کہ ان کی قضا کریں۔قرآن کریم حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر ضرور نازل ہوا مگر پڑھنے کے لئے۔الخ (ص ۶۸،فتاویٰ رضویہ جلد سوم،مطبوعہ مبارک پور ضلع اعظم گڑھ۔یوپی)

عملی بدعات کے رد وانکار اور ان کے استیصال کے لئے امام احمد رضا نے جو فتاویٰ تحریر کیے ان کے نمونے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) غیر خدا کے لئے سجدۂ عبادت کے شرک اور سجدۂ تحیۃ وتعظیم کی حرمت کے بارے میں لکھتے ہیں۔

مسلمان! اے مسلمان! اے شریعت مصطفوی کے تابع فرمان! جان اور یقین جان کہ سجدہ حضرت عزت عز جلالہ کے سوا کسی کے لئے نہیں۔اس کے غیر کے لئے سجدۂ عبادت یقیناً اجماعاً شرک مہین وکفر مبین۔اور سجدۂ تحیت حرام وگناہ کبیرہ بالیقین،الخ (ص۵،الزبدۃ الزکیۃ۔مطبوعہ میرٹھ)

(۲) مزارات پر عورتوں کی حاضری کے بارے میں لکھتے ہیں:

غنیۃ میں ہے۔ یہ نہ پوچھو کہ مزارات پر عورتوں کا جانا جائز ہے یا نہیں۔ بلکہ یہ پوچھو کہ اس

عورت پر کس قدر لعنت ہوتی ہے اللہ کی طرف سے اور کس قدر صاحب قبر کی طرف سے۔ جس وقت وہ گھر سے ارادہ کرتی ہے لعنت شروع ہو جاتی ہے اور جب تک واپس آتی ہے ملائکہ لعنت کرتے رہتے ہیں۔ سوائے روضۂ انور کے کسی مزار پر جانے کی اجازت نہیں۔ الخ (ص ۱۰۷، الملفوظ دوم، مطبوعہ میرٹھ)

(۳) مزامیر کے ساتھ قوالی کے بارے میں لکھتے ہیں:

مزامیر یعنی آلات ولہو ولعب بروجہ لعب بلاشبہ حرام ہیں۔ جن کی حرمت اولیا و علما دونوں فریق مقتدیٰ کے کلمات عالیہ میں مصرح۔ ان کے سننے سنانے کے گناہ ہونے میں شک نہیں کہ بعد اصرار کبیرہ ہے۔ الخ۔ (ص ۵۴، فتاویٰ رضویہ جلد دہم مطبوعہ پیلی بھیت۔ یوپی)

ایسی قوالی حرام ہے۔ حاضرین سب گنہگار ہیں۔ اور ان سب کا گناہ ایسا عرس کرنے والوں پر اور قوالوں پر ہے۔ الخ (ص ۲۲، احکام شریعت حصہ اول۔ مطبوعہ میرٹھ)

(۴) کچھ لوگ کہتے ہیں کہ فلاں درخت فلاں طاق پر شہید مرد ہیں۔ وہاں فاتحہ دلاتے ہیں لوبان سلگاتے ہیں ہار ڈلتے ہیں، اس کے بارے میں آپ لکھتے ہیں۔

یہ سب واہیات وخرافات، جاہلانہ حماقات وبطالات ہیں۔ ان کا اِزالہ لازم۔ الخ (ص ۱۴، احکام شریعت اول۔ مطبوعہ میرٹھ)

(۵) تبرک کے طور پر بزرگوں کی تصاویر رکھنے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

کعبۂ معظّمہ میں حضرت ابراہیم وحضرت اسمٰعیل وحضرت مریم کی تصاویر یہی تھیں کہ یہ متبرک ہیں۔ ناجائز فعل تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ وسلم نے خود دست مبارک سے انہیں دھویا۔ (ص ۸۷، الملفوظ دوم۔ مطبوعہ میرٹھ)

اللہ عز وجل پناہ دے ابلیس کے مکائد سے سخت ترکید (فریب) یہ ہے کہ آدمی سے حسنات کے دھوکہ کے میں سیئات کراتا ہے۔ اور شہد کے بہانے زہر پلاتا ہے۔ والعیاذ باللہ۔ الخ (ص ۳۔ شفاء الوالہ۔ مطبوعہ بریلی)

(۶) فرضی قبروں کے بارے میں لکھتے ہیں:

فرضی مزار بنانا اور اس کے ساتھ اصل کا سا معاملہ کرنا ناجائز و بدعت ہے۔ اور خواب کی بات خلاف شرع امور میں مسموع نہیں ہوسکتی۔ الخ۔ (ص ۱۱۵، فتاویٰ رضویہ چہارم۔ مطبوعہ

مبارک پور ضلع اعظم گڑھ۔ یوپی)

جس قبر کا یہ بھی حال معلوم نہ ہو کہ یہ مسلمان کی ہے یا کافر کی اس کی زیارت کرنی اس پر فاتحہ دینا ہرگز جائز نہیں۔ الخ (ص ۱۴۱، فتاویٰ رضویہ چہارم، مطبوعہ مبارکپور)

(۷) قبر پر یا قبر کی طرف نماز پڑھنے کے بارے میں لکھتے ہیں:

قبر پر نماز پڑھنا حرام، قبر کی طرف نماز پڑھنا حرام، اور مسلمان کی قبر پر قدم رکھنا حرام، قبروں پر مسجد بنانا یا زراعت وغیرہ کرنا حرام۔ الخ (ص ۲، عرفان شریعت دوم۔ مطبوعہ بریلی)

(۸) طواف و بوسۂ قبر کے بارے میں لکھتے ہیں:

بلاشبہ غیر کعبہ کا طواف تعظیمی ناجائز ہے۔ اور غیر خدا کو سجدہ ہماری شریعت میں حرام ہے۔ اور بوسۂ قبر میں علما کو اختلاف ہے اور احوط (زیادہ احتیاط) منع ہے۔ (ص ۷۷، فتاویٰ رضویہ دہم، مطبوعہ پیلی بھیت)

(۹) کسی کے مرنے کے روز سے جمع ہو کر دعوتوں کا جو سلسلہ شروع ہوتا ہے اور اہل میت دعوت دے کر زیر بار ہوتے ہیں اس کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> سبحٰن اللہ! اے مسلمان! یہ پوچھتا ہے کہ جائز ہے یا کیا؟ یوں پوچھ کہ یہ ناپاک رسم کتنے قبیح اور شدید گناہوں، سخت و شنیع خرابیوں پر مشتمل ہے۔ الخ۔ (ص ۱۲۸، فتاویٰ رضویہ چہارم، مطبوعہ مبارک پور)

(۱۰) تعزیہ اور تعزیہ داری کے بارے میں لکھتے ہیں:

ہر جگہ نئی تراش خراش، نئی گڑھت، جسے اس اصل (روضۂ امام حسین) سے نہ کچھ علاقہ نہ کوئی نسبت، پھر کسی میں پریاں، کسی میں براق، کسی میں اور بیہودہ طمطراق، پھر کوچہ بہ کوچہ دشت بہ دشت اشاعتِ غم کے لئے ان کا گشت، اور اس کے گرد سینہ زنی و ماتم داری کی شورافگنی، حرام مرثیوں سے نوحہ کنی، عقل و نقل سے کٹی چھنی، کوئی ان کپچیوں کو جھک جھک کر سلام کر رہا ہے، کوئی مشغول طواف، کوئی سجدہ میں گرا ہے، کوئی اس مایۂ بدعات کو معاذ اللہ جلوہِ گاہ امام عالی مقام سمجھ کر اس ابرک پنی سے مرادیں مانگ رہا ہے۔ منتیں مانتا ہے۔ عرضیاں باندھتا ہے۔ حاجت روا سمجھتا ہے۔ پھر باقی تماشے، باجے، تاشے، مردوں عورتوں کا راتوں کو میل اور طرح طرح کے بیہودہ کھیل اس پر طرہ ہیں۔ تعزیہ داری کہ اس طریقۂ نامرضیہ کا نام ہے۔ قطعاً بدعت و ناجائز و حرام

ہے۔ تعزیہ جس طرح رائج ہے۔ یہ ایک بدعت بلکہ مجمع بدعات ہے۔ الخ (اقتباس، ص ۴۶، بدرالانوار مطبوعہ مبارک پور، ص ۷۱-۴، فتاویٰ رضویہ دہم، مطبوعہ پیلی بھیت)

(۱۱) جاہل واعظین وذاکرین ونعت خواں اور جلسہ میں عورتوں کی شرکت کے بارے میں لکھتے ہیں:

اگر واعظ کہ اکثر واعظانِ زمانہ کی طرح جاہل وناعاقل وبے باک وناقابل ہوتے ہیں۔ مبلغ علم کچھ اشعار خوانی یا بے سروپا کہانی، یا تفسیر مصنوع یا تحدیث موضوع، نہ عقائد کا پاس نہ مسائل کا احتفاظ، نہ خدا سے شرم، نہ رسول کا لحاظ، غایت مقصود پسند عوام اور نہایت مراد جمع حطام، یا ذاکر ایسے ہی ذاکرین، غافلین، مبطلین کہ رسائل پڑھیں تو جہال مغرور کے، اشعار گائیں تو شعراء بے شعور کے، انبیاء کی توہین، خدا پر اتہام، اور نعت ومنقبت کا نام بدنام، جب تو جانا بھی گناہ بھیجنا بھی حرام اور اپنے یہاں انعقاد مجمع آثام۔ آج کل اکثر مواعظ ومجالس کا یہی حال پُر ملال، اسی طرح اگر عادت نساء سے معلوم ومظنون کہ بنام وعظ وذکر اقدس جائیں، اور سنیں نہ سنائیں بلکہ عین وقت ذکر اپنی کچریاں پکائیں۔ جیسا کہ غالب احوال زنان زماں تو بھی ممانعت ہی سبیل ہے۔ کہ یہ جانا اگرچہ بنام خیر ہے مگر بروجہ غیر ہے۔ ذکر وتذکیر کے وقت لغو ولغط شرعاً ممنوع وغلط۔ الخ (ص ۴۲، فتاویٰ رضویہ دہم، مطبوعہ پیلی بھیت)

(۱۲) شادی بیاہ کے رسم ورواج کے بارے میں لکھتے ہیں:

آتش بازی جس طرح شادیوں اور شب برأت میں رائج ہے بے شک حرام اور پورا جرم ہے کہ تضیعِ مال ہے۔ اسی طرح یہ گانے باجے کہ ان بلاد میں معمول ورائج ہیں بلاشبہ ممنوع وناجائز ہیں۔ جس شادی میں یہ حرکتیں ہوں مسلمانوں پر لازم ہے کہ اس میں ہرگز شریک نہ ہوں۔ الخ (ص ۲-۳، ہادی الناس مطبوعہ بریلی)

(۱۳) چھتوں اور کوٹھوں سے شربت کے آبخورے اور روٹیاں لٹانے کے بارے میں لکھتے ہیں:

یہ خیرات نہیں شر وسیئات ہے، نہ ارادۂ وجہ اللہ کی یہ صورت ہے بلکہ ناموری اور دکھاوے کی اور وہ حرام ہے اور رزق کی بے ادبی اور شربت کا ضائع کرنا جداگانہ ہے۔ (ص ۶۶، احکام شریعت اول۔ مطبوعہ میرٹھ)

(۱۴) آیات اور سورتوں کو معکوس کر کے پڑھنے کے بارے میں فرماتے ہیں:

حرام اشد حرام، کبیرہ اور سخت کبیرہ قریب کفر ہے۔ الٰی آخرہ (ص۲۲، الملفوظ، مطبوعہ میرٹھ)

(۱۵) بے علم صوفی کے بارے میں لکھتے ہیں:

صوفی جاہل شیطان کا مسخرہ ہے۔ بے علم مجاہدہ والوں کو شیطان انگلیوں پر نچاتا ہے۔ منہ میں لگام ناک میں نکیل ڈال کر جدھر چاہتا ہے لیے پھرتا ہے۔ الخ (ص۱۶، مقال عرفا، مطبوعہ میرٹھ)

(۱۶) عورتوں کے روزۂ مشکل کشا علی مرتضٰی کے بارے میں لکھتے ہیں:

روزہ خاص اللہ عز وجل کے لئے ہے۔ اگر اللہ کا روزہ رکھیں اور اس کا ثواب علی مرتضٰی کی نذر کریں تو حرج نہیں۔ مگر اس میں یہ کرتی ہیں کہ روزہ آدھی رات کا رکھتی ہیں۔ شام کو افطار نہیں کرتیں۔ آدھی رات کے بعد گھر کے کواڑ کھول کر کچھ دعاء مانگتی ہیں۔ اس وقت روزہ افطار کرتی ہیں۔ یہ شیطانی رسم ہے۔ (۶۶۰، فتاویٰ رضویہ چہارم، مطبوعہ مبارک پور)

(۱۷) آخری بدھ کے غسل صحت کے بارے میں لکھتے ہیں:

یہ محض بے اصل ہے (ص۳۰۷، عرفان شریعت، مطبوعہ بریلی)

(۱۸) غازی میاں کے بیاہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

غازی میاں کا بیاہ کوئی چیز نہیں۔ محض جاہلانہ رسم ہے۔ نہ ان کے نشان کی کوئی اصل (ص۹۸، فتاویٰ رضویہ دہم، مطبوعہ پیلی بھیت)

اعتقادی و عملی بدعات و منکرات اور غیر شرعی رسوم و عادات کے رد و انکار کے ساتھ بے اصل روایات کی بھی امام احمد رضا حنفی قادری بریلوی نے نشان دہی فرمائی ہے۔ ان سے اجتناب و احتراز اور اتباع سنت و شریعت و پیرویٔ اسلاف کرام کی تاکید فرمائی ہے۔ بدعات و منکرات اور واہیات و خرافات کے ازالہ کی ہر ممکن کوشش فرمائی ہے۔ اسی کا نام اصلاح معاشرہ ہے۔ اور اس میدان عمل میں امام احمد رضا کا نام نہایت روشن و تابناک ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ آپ کو اس کا صلہ عطا فرمائے اور اجر آخرت سے نوازے۔ آمین۔ بجاہ حبیبہ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم۔

☆☆☆☆☆

امام احمد رضا پر جدید تحقیق و ریسرچ

امام احمد رضا بریلوی کی شخصیت اب بین الاقوامی سطح پر متعارف ہوچکی ہے۔ علما اور دانشوروں کا ایک بڑا طبقہ آپ کے افکار و نظریات اور ہمہ جہت خدمات سے واقف ہو چکا ہے۔ عالم عرب میں آپ کی کتب و رسائل کا مطالعہ کیا جارہا ہے۔ آپ کی متعدد اردو کتابیں عربی میں منتقل ہوکر شایع ہوچکی ہیں۔ بغداد مقدسہ اور قاھرہ میں خصوصیت کے ساتھ آپ کی گراں قدر دینی و علمی خدمات کو موضوع بحث و تحقیق بنایا جارہا ہے۔ متعدد عرب اساتذہ نے آپ کو منثور و منظوم خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اور لگ بھگ ایک درجن کتابیں رضویات کے موضوع پر بغداد و قاھرہ میں لکھی اور شایع کی جاچکی ہیں۔ یورپ و امریکہ کے بھی کئی فضلا رضویات کے موضوع پر ریسرچ کر چکے ہیں۔

ذیل میں چند اصحاب علم و فضل کے تأثرات اور کچھ حقائق و معلومات ملاحظہ فرمائیں جن سے آپ پر واضح ہوجائے گا کہ امام احمد رضا کی آفاقی شخصیت رفتہ رفتہ عالم اسلام پر اثر انداز ہوتی جارہی ہے اور آپ کی خدمات کے اعتراف و تحسین کا مبارک سلسلہ شرق و غرب میں شروع ہوچکا ہے۔

آفاق میں پھیلے گی کب تک نہ مہک تیری
گھر گھر لیے پھرتی ہے پیغام صبا تیرا

بتاریخ ۲۵ رتا ۲۸ ر شوال ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ نے بڑی دھوم دھام سے اپنا پچاسی ۸۵ سالہ جشن تعلیمی منایا تھا۔ درجنوں کی تعداد میں مختلف بلاد و امصار کے غیر ملکی نمائندے اس جشن میں شریک ہوئے تھے۔ ہندوستان کے بھی سیکڑوں علما و دانشور شریکِ جشن تھے۔ اخبارات و رسائل نے اپنی شاہ سرخیوں کے ذریعہ اس کی خوب تشہیر کی۔

عباسیہ ہال (کتب خانہ ندوہ) کے اندر تعلیمی نمائش کا انتظام تھا۔ بڑے بڑے طغروں میں ہندوستان کی عبقری اور یگانۂ روزگار شخصیتوں کے نام اور ان کی اعلیٰ و ممتاز ترین تصنیفات فن دار مندرج تھیں۔

عقائدوکلام کے نقشے میں "خالص الاعتقاد" اورفقہ کے طغرے میں "النیرۃ الوضیۃ" ازامام احمد رضامحدث بریلوی کے بھی نام تھے۔

امام احمد رضا کا نام پڑھ کر کئی مشاہیر علما چونک اُٹھے جیسے عہدِ ماضی کی کوئی بھولی بسری یاد دفعتہً پردۂ ذہن پراُبھرآئی ہو۔ اندازہ ہے کہ ان کے پیش رَوعلمانے امام احمد رضا کے علم وفضل کا ذکر کرکے ان کے دلوں میں احترام وعقیدت کا بیج بودیا ہو، یا خود ہی کہیں ان کی نگاہ سے آپ کی کوئی تصنیف گذری ہو۔

کئی علمانے "این مجموعۃ فتاواہ" کہہ کرفتاویٰ رضویہ کی مانگ کی لیکن انھیں بہ طریقِ احسن کسی دوسری جانب متوجہ کردیا گیا۔ ساتھ میں ایسا کوئی آدمی نہ ہوتا جوان کی مناسب رہنمائی اورنشان دہی کرسکتا۔

ایک مشہورشامی عالم شیخ عبدالفتاح ابوغدہ پروفیسر کلیّۃ الشرعیہ محمد بن سعود یونیورسٹی (ریاض سعودی عرب) جوعربی زبان کی پچیسیوں کتابوں کے مُصنف اورایک ممتاز ونمایاں دینی وعلمی مقام کے مالک ہیں۔ اس کا اندازہ آپ یوں کرسکتے ہیں کہ جب ان کی تقریر کی باری آئی تو ناظمِ اجلاس (مولانا محمد رابع حسنی ندوی مؤلف منثورات، والادب العربی وغیرہ) کی بجائے مشہور دیوبندی عالم ومناظر مولانا محمد منظور نعمانی سنبھلی نے بڑے زوردار انداز میں حاضرین سے آپ کا تعارف کرایا۔

ان کی نگاہ جب امام احمد رضابریلوی کی کتاب پر پڑی توفوراً بول اٹھے "این مجموعۃ فتاویٰ الشیخ احمدرضا البریلوی" ان کے ساتھ ایک تجربہ کارقسم کے ''مولوی'' تھے۔ موقع نازک سمجھ کرانھوں نے کہہ دیا۔ فتاویٰ رضویہ یہاں موجودنہیں۔ حُسن اتفاق سے ندوہ میں زیرتعلیم ایک سنّی طالب علم بھی ان کے پیچھے تھے۔ انھوں نے موقع غنیمت جان کربتلا ہی دیا کہ "انھا توجد فی ھذہ الدار" فتاویٰ رضویہ یہاں کتب خانہ میں موجود ہے۔ یہ سُن کروہ مولوی صاحب آگ بگولہ ہوگئے اورانھیں ڈانٹ پلاکروہاں سے رخصت کردیا۔

کچھ دیر بعد اسی طالب علم نے مجھے اطلاع دی کیوں کہ میں اس وقت لکھنؤ میں موجود تھا۔ میں نے فوراً تفصیلی ملاقات کی کوشش کی اوران کی قیام گاہ روم نمبر ۱۴۰ کلارک اودھ ہوٹل لکھنؤ میں تقریباً دو بجے دن میں پہونچا۔ میرے ساتھ وہ طالب علم بھی تھے۔ کانفرنس کا آخری دن تھا۔ تین بجے ان تمام نمائندوں کو بذریعہ ہوائی جہاز دہلی پہونچنا تھا جہاں صدر جمہوریۂ ہند جناب فخر الدین علی احمد کے یہاں دعوت کے ایک پروگرام میں انھیں شریک ہونا تھا۔

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کوچ کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ بڑی خندہ پیشانی سے ملے اور ماحضر سے ضیافت کی جو عربوں کی قدیم روایت ہے۔

دورانِ گفتگو میں نے پوچھا کہ سمعت انك تشتاق الیٰ مطالعة مجموعة فتاویٰ الشیخ الامام احمد رضا البریلوی " میں نے سنا ہے کہ آپ فتاوی رضویہ کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں اور اس کے بہت مشتاق ہیں؟ نام سنتے ہی چہرہ دمک اُٹھا اور بڑے مشتاقانہ انداز میں انھوں نے کہا۔ ہاں! کیا آپ کے پاس موجود ہے؟ میں نے کہا اس وقت تو نہیں مل سکے گی مگر ان شاء اللہ بہت جلد بذریعۂ ڈاک ارسال کردوں گا۔

میرا دوسرا سوال تھا "كيف عرفت علمه و فضلهٗ" آپ ان کے علم وفضل سے کیسے مُتعارف ہوئے؟ اس سوال سے ان کے چہرے پر تبسم کی لہر دوڑ گئی۔ فرمایا، عطر بہر حال عطر ہی ہے۔ کتنا بھی اسے بند شیشی میں رکھا جائے اس کی بھینی بھینی خوشبو اہلِ ذوق تک پہونچ ہی جاتی ہے۔

اس کے بعد شیخ نے ہمیں بتایا کہ:

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ پروفیسر کلیۃ الشریعہ محمد بن سعود یونیورسٹی ریاض

(سعودی عرب)

''میرے ایک دوست کہیں سفر پر جارہے تھے۔ ان کے پاس فتاویٰ رضویہ کی ایک جلد موجود تھی۔ میں نے جلدی جلدی میں ایک عربی فتویٰ کا مطالعہ کیا۔ عبارت کی روانی اور کتاب و سنت و اقوال سلف سے دلائل کے انبار دیکھ کر میں حیران و ششدر رہ گیا اور اس ایک ہی فتویٰ کے مطالعہ کے بعد میں نے یہ رائے قائم کرلی کہ یہ شخص کوئی بڑا عالم اور اپنے وقت کا زبردست فقیہ ہے۔''

بہر حال اس وقت میں نے الجامعۃ اشرفیہ مبارک پور۔ اعظم گڑھ (یوپی انڈیا) کا عربی میں تعارفی کتابچہ و حاشیہ المعتقد المنتقد (مطبوعہ استنبول) اور الدولۃ المکیہ (از امام احمد رضا بریلوی) کے ایک ایک نسخے پیش کیے اور اطمینان دلایا کہ بہت جلد فتاویٰ رضویہ آپ تک پہونچ جائے گی۔

الشیخ یوسف السید ھاشم الرفاعی (الکویت)

شیخ احمد رضا نے علوم شرعیہ حاصل کرنے کے بعد تدریس و افتا و تصنیف و ارشاد و اصلاحِ احوالِ امت میں اپنی پوری عمر گذار دی۔ آپ کو سلسلۂ قادریہ کے ساتھ سلسلۂ چشتیہ و نقشبندیہ وسہروردیہ کی بھی اجازت وخلافت حاصل تھی۔

(ص ۱۵۔ من عقائدِ اھلِ السنۃ۔ مطبوعہ لاہور و ممبئی)

الدکتور حسین مجیب المصری (القاھرہ، مصر)

امام احمد رضا ایک راسخ الاعتقاد سنی عالم دین تھے جن کا مذہب حنفی اور مشرب قادری تھا جو ان کی کتب و رسائل سے پورے طور پر نمایاں ہے۔ ان کے معاصر علمائے کرام نے ان کے معتقدات کا مطالعہ اوران کا تحلیل و تجزیہ کر کے یہ لکھا اور ثابت کر دیا ہے کہ وہ پورے طور پر صحیح الفکر والاعتقاد تھے۔ لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ پر ان کا ایمان تھا کہ اللہ ایک ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اس کے سچے رسول ہیں جن پر میرا ایمان ہے۔ میرا دین اسلام ہے۔ اللہ کے سوا سارے معبود باطل ہیں۔ غیر اللہ کی عبادت شرک ہے۔ زندگی دینے والا صرف اللہ ہے اور موت دینے والا بھی اللہ ہی ہے۔ اللہ ایک ہے۔ وہی رزق دینے والا اور وہی بارش برسانے والا ہے۔ اسلام ہی دین حق ہے اور اسلام کے علاوہ سارے ادیان باطل ہیں۔

وہ کامل الایمان مومن تھے۔ قرآن پر ان کا ایمان اور لغتِ قرآن سے انھیں سچی محبت و وابستگی تھی۔ اور صراط مستقیم کے ہادی قرآن پر انھیں فخر تھا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبّ صادق بھی تھے اوران کے وسیلہ کے طالب بھی رہتے تھے۔ اس سے ان کا عقیدہ ان کی عبادت اوران کا تقویٰ سب کچھ ظاہر ہے۔ وہ اہل بیت اطہار وصحابہ کرام و اولیاے عظام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بھی توسل کے قائل و عامل تھے۔

و تلک غایۃ الغایات فی تقوی اللہ و محبۃِ مصطفاہ ﷺ

انھوں نے دین حنیف پر ہونے والے حملوں کا دفاع کیا اور علم سے نابلد مخالفین کے مکر و فریب کا پردہ فاش کیا۔ انھوں نے اس طرح جادۂ مستقیم کو ان کے سامنے واضح کیا اوران کے

فریب کو ان کے سامنے ہی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ ان کا بہت بڑا وصف ہے جس سے وہ متصف ہوئے اور ان کے اس وصف کی شہرت عام بھی ہے۔

(ص ۱۵۔مقدمہ صفوۃ المدیح۔دار الھدایہ، القاہرہ، مصر ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء)

الشیخ مصطفیٰ محمد محمود

(استاذ الحدیث بکلیة اصول الدین، الازهر، القاهرة)

علامه الهند، فرید عصره، و وحید دهره، العالم النحریر، الفقیه الکبیر، صاحب الفضائل الجمّة، و خاتمة علماء الامة مولانا الامام احمدرضا الحنفی کی کتاب "محمد خاتم النبیین" (جزاء الله عدوّه بابائه ختم النبوة) اپنے موضوع پر نہایت جامع و مانع اور مشتاقانِ علم کے لئے نہایت مفید کتاب ہے۔ اس کا مفہوم و معنی سمجھنے میں قاری کو کسی طرح کی دِقت پیش نہیں آتی اور عبارت بھی رواں دواں اور دل نشیں ہے۔ اہل زیغ و ضلال کے شبہات و اعتراضات کا شیخ احمد رضا نے خوب ردو ابطال کیا ہے اور حضرت علی یا حضرت فاطمہ یا حضرت حسن یا حضرت حسین کی نبوت کے قائل روافض کے شکوک و مزعوماتِ باطلہ کے پرخچے اڑا کر حق کو واضح کر دیا ہے۔ آیات کریمہ و احادیث صحیحہ و آثار و اخبار سے اپنے موقف کا اثبات کیا ہے اور سلف صالحین کے مسلک اور ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے امام المرسلین خاتم النبیین علیہ السلام کی عظمتِ مقام و منزلت کو اجاگر کیا ہے۔ اور یہ امام المرسلین و خاتم النبیین علیہ السلام تو وہ ہیں جن کا مرتبہ خود اللہ رب العزت نے اونچا کیا اور سارے عالم میں ان کے ذکر کو رفعت بخشی ہے۔

(ص ۱۹۔۲۰۔محمد خاتم النبیین، طبع ثانی کراچی، ۱۴۲۶ھ/۲۰۰۵ء)

الاستاذ رشید عبد الرحمٰن العبیدی

(مدیر مرکز البحوث و الدراسات الاسلامیه، بغداد، العراق)

متعدد و متنوع علوم و معارف و فنون میں امام احمد رضا بریلوی کی تقریباً ایک ہزار کتب و رسائل کی تعداد سے پتہ چلتا ہے کہ امام بریلوی عالم متبحر تھے اور ان کی ذات ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ علمائے اسلام نے اپنے عہد عروج و تہذیب و تمدن میں جن علوم و فنون میں

درک ومہارت حاصل کی تھی انھیں امام احمد رضا بریلوی نے بھی سیکھا اوران میں درجۂ کمال کو پہنچے۔ان کے اسرار ورموز تک رسائی پائی اوران کے اندرغواصی کی جن کے بے شمار علمی فوائد ایسے ہیں جودوسرے علماسے لوگوں کومشکل ہی سے پاتے ہیں۔

قدیم علمامیں علامہ جلال الدین سیوطی کی چارسو سے زیادہ کتابیں ہیں ادھر امام بریلوی نے اپنی کتابوں کی کثرت تعداد سے یہ ثابت کردیا کہ امت مسلمہ کا فیضان مسلسل جاری ہےاوراسلامی علماومفکرین کے تسلسل میں بھی کوئی فرق نہیں آئے گا۔ وہ ماضی سے وابستہ رہ کرحال کوعلوم و معارف وفنون کا سرمایہ بخشتے رہیں گےاوران کے اندراپنا مستقبل روشن کرنے کی بھی صلاحیت و قدرت ہے۔کیوں کہ وہ اپنے عقیدوں اوراسلامی اصول واقدار کی محبت سے سرشارومالامال ہیں جوانھیں عمل اورعطاءوفیضان کا سبب اورقوی محرک ہے۔

(ص ۱۷؍مقدمۂ قصیدتان رائعتان۔بغداد۔الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱)

الدکتور محمد مجید السعید (استاذ الجامعۃ الاسلامیۃ۔ بغداد، عراق)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے تین سال قبل مجھے ایک عظیم اسلامی شخصیت سے متعارف ہونے کا موقعہ عنایت فرمایا جواعتقادی وفقہی وعلمی وادبی تحقیق ومطالعہ کے باب میں نہایت بلند مقام پرفائز ہے۔ایسی نادرشخصیت کہ جس کے اندربے پناہ اورمتنوع وممتاز علمی استعدادوصلاحیت ولیاقت ہےجس کا ذہن جس کی ذکاوت اورجس کی فکرنہایت صائب وثاقب اوربےنظیر ہے۔

یہ شخصیت ہے شیخ امام محمد احمد رضا بریلوی قندھاری برکاتی ہندی کی۔ جوایسے علامۂ فہامہ ہیں کہ زمانہ کم ہی ایسے لوگوں کے وجود سے سرفراز ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسے جلتے ہوئے چراغ اور ایسی روشنی بکھیرتے ہوئے شعلہ اورشعاعِ پُرنور ہیں جس کا اجالاکم ہونے اورجس کی روشنی بجھنے کا کبھی نام نہیں لیتی۔

شیخ احمد رضا کا تبحرِ علمی،وسعت مطالعہ اورمسلسل وصبرآزمادینی وعلمی کدوکاوش کا نتیجہ ہے کہ پچاس سے زیادہ علوم وفنون میں انھیں کامل مہارت حاصل تھی۔

(۱۰۔مقدمۂ شاعر من الھند۔تالیف الدکتور مجید السعید۔بغداد ۱۴۲۴ھ/۲۰۰۳ء)

الدکتور عماد عبدالسلام رؤف

(بغداد۔ العراق)

شیخ احمد رضا کو بہت سے علوم و معارف بالخصوص علوم شرعیہ میں انھیں اس حد تک مہارت تھی کہ تحقیق و دِقتِ نظر کے اعتبار سے وہ اکثر موضوعات میں مجتہدانہ حیثیت رکھتے تھے اور ان کی تحقیقات و افادات کو ایک مستقل فقہی مکتبۂ فکر کہا جاسکتا ہے۔ جس کی ضرورت ہر مسلمان کو ہے چاہے وہ جس رنگ و نسل کا ہو اور جہاں کہیں جس ماحول و زمانہ سے اس کا تعلق ہو۔ ان کی کاوشوں کو ان کے نام کی طرف نسبت کرتے ہوئے "الدراسات الرضویہ" (مطالعۂ رضویات) بھی کہا جانے لگا ہے اور اس موضوعِ تحقیق و مطالعہ (رضویات) کو "الدراسات الاسلامیہ" کے ضمن میں متعدد عرب جامعات مثلاً جامعہ ازہر مصر وغیرہ میں ایک مقام بھی حاصل ہو گیا ہے۔

شیخ احمد رضا کو عربی زبان پر بھی قدرت تھی۔ نثر و نظم میں ایسی قدرت تھی کہ انھوں نے کافی عربی کتابیں عربی زبان میں تصنیف کیں جو عرب حلقوں میں بھی پھیل چکی ہیں۔

اہل عرب میں سید عالم ﷺ کی تشریف آوری کی وجہ سے شیخ احمد رضا کو عربوں سے بڑی محبت تھی۔ سرزمین عرب سے ہی پرچم اسلام بلند ہوا اور شرق و غرب میں یہ پرچم لہرانے لگا۔ قرآن حکیم کی زبان بھی عربی ہے۔ ان وجوہ و اسباب نے ان کے دل میں عرب اور عربی سب کی محبت ڈال دی۔ ان کے فتاویٰ اور کتب و رسائل سے اہل عرب کے ساتھ وابستگی اور عربیت کا رنگ ہر جگہ نمایاں ہے۔ ان کی تحریروں اور عبارتوں کے مطالعہ سے قاری کو ایسا لگتا ہے کہ وہ خود عربی ہیں جو اپنی قوم سے مخاطب ہیں۔ کوئی ہندوستانی نہیں لگتا جو سمندر پار سے ان سے مخاطب ہے۔

(ص ۲۔۳۔ اللآلی المنتشرۃ۔ الجزء الاول، تالیف عماد عبدالسلام رؤف۔ بغداد ۱۴۲۴ھ/۲۰۰۳ء)

الاستاذ حازم محمد احمد عبدالرحیم المحفوظ

(کلیۃ اللغات و الترجمۃ، جامع ازہر، قاھرہ)

شیخ امام احمد رضا حنفی قادری بریلوی صحیح معنیٰ میں فقیہ امام ہیں۔ اور علم اصول دین و علوم شرعیہ کے عرفان و فیضان سے داعیِ حق و ہدایت ہیں۔ آپ کی ایک ہزار کتابیں ہیں جن میں سے اکثر فقہ و فتاویٰ پر مشتمل ہیں۔ آپ نے مسلمانانِ عالم کو پوری استقامت کے ساتھ صحیح و درست

دینی شاہراہ پر چلانے کا فریضہ انجام دیا۔ صحیح وغلط اور اوامر ونواہی اور محرمات ومکروہات کا فرق و امتیاز اور ان کی اصل حیثیت واضح کی۔

آپ ایسے امام ہیں جنھوں نے ہمیشہ فتاویٰ اور امور شرعیہ کی خدمت انجام دی۔ .... اور دینی و علمی مصلح کی حیثیت سے اپنی یہ ذمہ داری سمجھی کہ امت مسلمہ کی مسلسل رہنمائی کرتے رہیں تاکہ وہ تاریک رات کے مسافر کی طرح کسی گڈھے میں نہ گر سکے۔

(ص ۳۴ ۔ مقدمہ المنظومۃ السلامیۃ تالیف الدکتور حازم محفوظ ۔ الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۲۲ھ/ ۲۰۰۱ء)

....

امام احمد رضا کی زندگی سے آج تک تسلسل وتواتر کے ساتھ علمائے عرب وعجم کا اعترافِ علم و فضل، کمال توجہ وعنایت اور بے پناہ جذبۂ عقیدت واحترام یہ چیزیں ہمیں یقین دلاتی ہیں کہ:

امام احمد رضا حنفی قادری محدث بریلوی قدس سرہٗ (متوفی ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء) اپنے وقت کے جلیل القدر مفسر، عظیم المرتبت محدث، عدیم النظیر عالم، کثیر المطالعہ محقق، بلند پایہ مصنف، ژرف نگاہ مفکر، دیدہ ور رقائد، پُرسوز مصلح، صف شکن مجاہد، قادر الکلام شاعر، شریعت وطریقت کے جامع، علوم کتاب وسنت کے ناشر، تعلیمات وہدایات اسلامی کے داعی، پیغام عشقِ مصطفوی کے مُبلغ، اور تحریکِ تحفظِ ناموسِ رسالت کے علمبردار ہی نہیں بلکہ بادۂ حُب نبوی کے ایسے سرشار ہیں کہ ان کے ہر بنِ مُو سے یہ صدا آتی ہے۔

جان ہے عشقِ مصطفیٰ اور فزوں کرے خدا   جس کو ہو درد کا مزہ نازِ دوا اٹھائے کیوں

اور یہی وہ سرمایۂ عشق رسول اور خاک روبی درِ رسول ہے جس نے اُن کے وجود کے فیضان کو مخزن برکت وسعادت اور ان کے قلب ونظر کی تجلیات کو حریفِ مہر وماہ بنا دیا ہے۔

رشکِ قمر ہوں رنگِ رخِ آفتاب ہوں   ذرّہ جو تیرا اے شہِ گردوں جناب ہوں

دل بستہ، بے قرار، جگر چاک، اشکبار   غنچہ ہوں گل ہوں برق تپاں ہوں سحاب ہوں

قالب تہی کیے ہمہ آغوش ہے ھلال   اے شہسوار طیبہ میں تیری رکاب ہوں

کیا کیا ہیں تجھ سے ناز ترے قصر کو کہ مَیں   کعبہ کی جان عرشِ بریں کا جواب ہوں

حسرت میں خاک بوسیِ طیبہ کی اے رضا
ٹپکا جو چشم مہر سے وہ خونِ ناب ہوں

امام احمد رضا پر مختلف یونیورسٹیوں میں کی جانے والی تحقیقات

نمبر	نام اسکالر	عنوان	نگران	یونیورسٹی	تاریخ منظور
1	ڈاکٹر حسن رضا خاں مظفر پوری	فقیہِ اسلام	ڈاکٹر اطہر شیر	پٹنہ یونیورسٹی، انڈیا	1979ء
2	ڈاکٹر مسز اوشیا سانیال	Devotional Islam and Politics in British India (Ahmad Raza Khan Barelvi and his Movement 1870-1920)		کولمبیا یونیورسٹی، نیو یارک، امریکہ	1990ء
3	ڈاکٹر سید جمیل الدین (جمیل راٹھوی)	اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں اور ان کی نعت گوئی		ڈاکٹر ہری سنگھ کورویشا یونیورسٹی ساگر، ایم۔ پی۔ انڈیا	27-3-1992
4	ڈاکٹر محمد امام الدین (جوہر شفیع آبادی)	حضرت رضا بریلوی بحیثیت شاعرِ نعت	ڈاکٹر فاروق احمد صدیقی	بہار یونیورسٹی، مظفر پور، انڈیا	31.12.1992
5	ڈاکٹر طیب علی رضا انصاری	امام احمد رضا خاں...... حیات و کارنامے	ڈاکٹر قمر جہاں	ہندو یونیورسٹی، بنارس، انڈیا	1993ء
6	پروفیسر ڈاکٹر حافظ عبدالباری صدیقی	کنز الایمان اور دیگر معروف اردو تراجم کا تقابلی جائزہ	پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد	جامعہ کراچی، پاکستان	6.11.1993
7	پروفیسر ڈاکٹر حافظ عبدالباری صدیقی	امام احمد رضا بریلوی کے حالات، افکار اور اصلاحی کارنامے (سندھی)	پروفیسر ڈاکٹر مددعلی قادری	سندھ یونیورسٹی جامشورو، پاکستان	1993ء
8	ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی	اردو نعت گوئی اور فاضل بریلوی	پروفیسر زیڈ۔ ایچ۔ وسیم	روہیل کھنڈ یونیورسٹی، بریلی، انڈیا	1994ء

نمبر	نام اسکالر	عنوان	نگران	یونیورسٹی	تاریخ منظور
9	ڈاکٹر سراج احمد بستوی	مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی نعتیہ شاعری	پروفیسر سید ابوالحسنات حقی	کانپور یونیورسٹی، انڈیا	10.3.1995
10	مولانا ڈاکٹر امجد رضا قادری	امام احمد رضا کی فکری تنقیدیں	پروفیسر ڈاکٹر طلحہ برق رضوی	ویرکنور یونیورسٹی، آرہ، بہار، انڈیا	8.12.1998
11	پروفیسر ڈاکٹر محمد انور خاں	مولانا احمد رضا بریلوی کی فقہی خدمات	پروفیسر ڈاکٹر ایس۔ایم سعید	سندھ یونیورسٹی، جامشورو، پاکستان	1998ء
12	مولانا ڈاکٹر غلام مصطفیٰ نجم القادری	امام احمد رضا کا تصور عشق	ڈاکٹر جہاں آرا بیگم	میسور یونیورسٹی، انڈیا	2002ء
13	ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف سنبھلی	روہیل کھنڈ کے نثری ارتقاء میں مولانا امام احمد رضا خاں کا حصہ	ڈاکٹر محمد سیادت نقوی	روہیل کھنڈ، یونیورسٹی، بریلی، انڈیا	26.8.2003
14	ڈاکٹر غلام غوث قادری	امام احمد رضا کی انشاپردازی	پروفیسر منظر حسین	رانچی یونیورسٹی، بہار، انڈیا	11.3.2003
15	مسز ڈاکٹر تنظیم الفردوس	مولانا احمد رضا خاں کی نعتیہ شاعری کا تاریخی اور ادبی جائزہ	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	جامعہ کراچی، پاکستان	25.4.2004
16	ڈاکٹر سید شاہد علی نورانی	الشیخ احمد رضا شاعراً عربیاً مع تدوین دیوانہ العربی	ڈاکٹر ظہور احمد اظہر	پنجاب یونیورسٹی، لاہور، پاکستان	15.4.2004
17	مولانا ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی	امام احمد رضا اور ان کے مکتوبات	ڈاکٹر فاروق احمد صدیقی	بی۔آر۔امبیڈکر، بہار یونیورسٹی، مظفرپور، انڈیا	20.12.2004

(مجلّہ معارف رضا کراچی ۲۰۰۵ء)

دار القلم دھلی

بفضلہ تعالیٰ دار القلم، ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵ (رجسٹرڈ) کے قیام سے ملک وبیرون ملک کے اکثر علما وطلبہ اور دینی وعلمی مطالعہ کا شوق رکھنے والے سنی خواص وعوام بخوبی واقف ہیں۔ (۱) قادری مسجد (۲) لائبریری (۳) اسلامک ریسرچ اکیڈمی (۴) دار التصنیف والتالیف (۵) دار الترجمہ (۶) ٹریننگ سینٹر (۷) دار الاشاعت (۸) میگزین (۹) سیمینار ہال (۱۰) مطالعۂ مذاہب (۱۱) دعوت واصلاح (۱۲) رابطۂ علمائے ہند (۱۳) عالمی رابطہ (۱۴) مہمان خانہ جیسے اہم شعبوں پر مشتمل دار القلم مستقبل قریب میں اہل سنت کے عظیم تحقیقی وتصنیفی مرکز اور تاریخ ساز ادارہ کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت بھی حاصل کرے گا۔ ان شاء اللہ

مطبوعات دار القلم دہلی

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
(۱) قرآن اور جہاد	20/-	(۲) تعارف اہل سنت	15/-
(۳) تین برگزیدہ شخصیتیں	60/-	(۴) مسائل توسل وزیارت	30/-
(۵) امام احمد رضا ارباب علم ودانش کی نظر میں	60/-	(۶) خصائص رسول	40/-
(۷) پیغام حجاز	15/-	(۸) تین طلاق کا شرعی حکم	20/-
(۹) موئے مبارک	22/-	(۱۰) سواد اعظم	20/-
(۱۱) جشن میلاد النبی	20/-	(۱۲) خاک حجاز	20/-
(۱۳) امام احمد رضا اور جدید افکار وتحریکات	90/-	(۱۴) انگریز نوازی کی حقیقت	60/-
(۱۵) آیات جہاد کا قرآنی مفہوم	15/-	(۱۶) امام احمد رضا اور رد بدعات ومنکرات	135/-
(۱۷) چند علمائے انقلاب (۱۸۵۷ء)	60/-	(۱۸) قائد جنگ آزادی علامہ فضل حق خیر آبادی	60/-
(۱۹) علما وقائدین جنگ آزادی	10/-	(۲۰) ۱۸۵۷ء، پس منظر وپیش منظر	100/-

تاجران کتب خصوصی رعایت کے ساتھ مندرجہ بالا کتب حاصل کریں۔ عام قارئین بذریعہ منی آرڈر مطلوبہ کتب کی پچیس فی صد رقم پیشگی ارسال کر کے وی پی سے کتابیں منگائیں۔ اس طرح آپ کے پاس مطبوعات دار القلم کا ذخیرہ بھی جمع ہوتا جائے گا اور دار القلم کی خدمت بھی ہوتی رہے گی۔

جملہ خط وکتابت وترسیل زر کا پتہ

دار القلم۔ قادری مسجد روڈ، ذاکر نگر، (جوگا بائی ایکسٹینشن)

نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

فون: 011-26986872، فیکس نمبر: 011-26987184

DARUL QALAM

66/92, Qadri Masjid Road, Zakir Nagar, (Joga Bai Ext.)
New Delhi-25 (INDIA)